دھان کٹنے کے بعد

انور عظیم کے منتخب افسانے

دھان کٹنے کے بعد

انور عظیم کے منتخب افسانے

دھان کٹنے کے بعد

انور عظیم کے منتخب افسانے

ترتیب و تہذیب

جابر حسین

اردو مرکز، عظیم آباد
۲۴۷، ایم آئی جی، لوہیا نگر، پٹنہ۔۸۰۰۰۲۰

دھان کٹنے کے بعد

انور عظیم کے منتخب افسانے

ترتیب و تہذیب : جابر حسین

اشاعت : 1999

قیمت : 100 روپے

ناشر : اردو مرکز، عظیم آباد، پٹنہ

طباعت : پاکیزہ آفسیٹ، پٹنہ

دستیاب

• اردو مرکز، عظیم آباد

247، ایم آئی جی، لوہیا نگر، پٹنہ۔ 800020، بہار (انڈیا)
فون اور فیکس : 0612-354077

• مکتبہ جامعہ

جامعہ نگر، نئی دہلی۔ 110025

• بک امپوریم

اردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔ 800004

DHAN KATNE KE BAAD
Anwer Azeem ke Muntakhab Afsane

Editor : Jabir Husain

URDU MARKAZ
247 MIG, Lohia Nagar
Patna - 800020, Bihar (India)

Phone - Fax : 0612 - 354077

Rs. 100/-

سادہ لوح

بہار

کی

فراوانی

اور

محتاجی

کے

نام

خوشے

افسانے

اپنی بات

......دوسری طرف' کھلیان سے آگے' افق پر بادلوں کا شامیانہ
گرگیا تھا اور ایک ہلکی سرخی بھاپ کی طرح آہستہ آہستہ
پھیل رہی تھی......

اور میں اسی افق پر' جہاں برفیلی ہواؤں نے اپنے سیاہ پر پھیلا دئے ہیں' کسی بے نام پہاڑی کی گپھاؤں میں بیٹھا دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری آنکھیں گیلی ہو رہی ہیں اور تمہارے ہونٹوں کی تھرتھراہٹ تھمی جا رہی ہے۔

رات ڈھہ رہی ہے۔ یا شاید ڈھہ چکی ہے۔

سفید پنکھوں والی اس خوبصورت کایا کو دیکھو' غور سے دیکھو اور سو جاؤ' سو جاؤ۔

رات ڈھہ رہی ہے۔ شاید ڈھہ چکی۔

میں افق پر کسی بے نام پہاڑی کی گپھاؤں میں بیٹھا دیکھ رہا ہوں۔ تم

تھکے ہارے قدموں سے پھر اس دنیا میں لوٹ آئے ہو' جسے تم نے کبھی آہٹوں کی دنیا کا نام دیا تھا۔ یہاں آکر تمہاری یادوں کے طوفان یکایک تھم گئے ہیں۔ نیندوں سے پرے' اور خوابوں سے بھی' تم اس دنیا میں لوٹ آئے ہو' جسے تم نے کبھی آہٹوں کی دنیا کہا تھا۔

تمہاری یادوں کے نیم بیدار لمحوں کی آغوش میں بیٹھی سفید پنکھوں والی اس خوبصورت کایا کو غور سے دیکھو' جس نے آنسوؤں کی جھلملاتی برتوں کے پیچھے اپنے غموں کی ایک انمول دنیا بسا رکھی ہے۔ دیکھو' سفید پنکھوں والی اس خوبصورت کایا کو' جس نے اپنے ہونٹوں پر پتھروں سے دبے کسی نازک اور حسین پھول کے پودے کی خوشبو اور اپنی ہتھیلی پر خون کے رنگ والی حنا کا طلسم ڈال رکھا ہے۔ دیکھو' اسے غور سے دیکھو۔

کل جب تمہاری آنکھیں اپنی آخری نیند سوئیں گی اور تمہاری نبضیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سرد پڑ جائیں گی' تب تمہاری آہٹوں کی اس بے چین دنیا میں سفید پنکھوں والی خوبصورت کایا کے سوا کون ہوگا۔ اسی لئے تو میں نے کہا' اسے دیکھو' غور سے دیکھو۔

نہیں' اسے محض ایک پرچھائی مت کہو۔ ایک پرچھائی جو کبھی کبھی تمہاری تنہائی کی سرحدوں میں رینگ آتی ہے' تمہیں چوم جاتی ہے۔ اور جو کبھی کبھی تمہارے بے چین لبوں کے لئے اپنے استنوں کے دوار کھول جاتی ہے۔

سفید پنکھوں والی اس خوبصورت کایا کو محض ایک پرچھائی سمجھنے کی بھول مت کرنا۔

یاد رکھنا' آہٹوں کی اس بے خواب دنیا میں' جہاں تم لوٹ آئے ہو'

تمہارا کوئی مونس و ہمدرد نہیں' اس خوبصورت کایا کے سوا' جسے تم سفید پنکھوں والی کایا کہتے ہو' اور جو رات برات کانٹے دار گلابوں کی پنکھڑی والی خوشبو بن کر تمہارے احساس کو چونکا جاتی ہے۔

تم بھول رہے ہو شاید' وہ بے لوث لمحہ' جب کوئی تمہاری رگوں میں دوڑنے والے لہو کا ساکشی بن گیا تھا اور تم ایک خاموش چیخ کی طرح اس روشن لمحے کی گود میں گر پڑے تھے۔ اور سال در سال' سفید پنکھوں والی یہ خوبصورت کایا اپنی باریک اور نازک انگلیوں اور طلسمی لبوں سے تمہارے بے ترتیب اور مبہم خوابوں کو سجاتی رہی تھی۔

سفید پنکھوں والی اس خوبصورت کایا کو دیکھو' جو اب بھی اپنا ماضی' اپنا حال' اپنا سب کچھ بھول کر تمہارے بے معنی وجود کا اٹوٹ حصہ بننا چاہتی ہے۔ تم آہٹوں کی اس پرفریب دنیا میں بجلی کے زندہ تاروں پر اس خوبصورت کایا کے بغیر کیسے چل پاؤگے۔ سوچو' سفید پنکھوں والی اس خوبصورت کایا کے بنا تم آہٹوں کی اس تاریک دنیا میں کیسے جی پاؤ گے۔ کیسے جھیل پاؤ گے ان خوں ریزیوں کو' جو تمہاری پہچان بنتی جا رہی ہیں۔ سوچو کیسے۔

آخر ہر صبح تمہاری میز پر ڈائری کے پنوں کو اپنی انگلیوں کی ہوا دے کر اس کی تاریخیں کون بدلے گا۔ کون تمہارے احساس کی پرنم لو اور سانسوں کی آنچ بن کر تمہاری سیمابیاں دور کرے گا۔ بولو' سفید پنکھوں والی اس خوبصورت کایا سے جڑی انگنت یادیں تمہارے اتیت میں اب بھی زندہ ہیں نا' بولو ہیں نا۔

دیکھو' تمہاری میز کے ایک سرے پر' وہیں جہاں بیٹھ کر تم نظمیں

لکھتے ہو' کہانیاں لکھتے ہو اور تصویریں بناتے ہو' وہیں' بس وہیں' سفید شنکھ کے بازوؤں سے لگی رنگین پھولوں بھری دو ٹہنیاں آج بھی تمہارے گم نام رشتوں کی گواہی دیتی ہیں۔ دیتی ہیں نا' بولو۔

رات ڈھہ رہی ہے۔ یا شاید ڈھہ چکی۔ بارش تھم رہی ہے۔ یا شاید تھم چکی۔ سفید پنکھوں والی اس خوبصورت کایا نے اپنی ہتھیلیوں سے تمہاری آنکھیں ڈھک لی ہیں۔ میں افق پر' جہاں برفیلی ہواؤں نے اپنے سیاہ پر پھیلا دئے ہیں' کسی بے نام پہاڑی کی گپھاؤں میں بیٹھا دیکھ رہا ہوں۔ تمہاری آنکھیں گیلی ہو رہی ہیں۔اور تمہارے رخساروں پر نمکین پانی کی بوندیں لہو بن کر پھیل رہی ہیں۔

میں دور' افق پر' کسی بے نام پہاڑی کی گپھاؤں میں بیٹھا صاف محسوس کر رہا ہوں کہ تمہاری آنکھیں گیلی ہو رہی ہیں اور تمہارے ہونٹوں کی تھرتھراہٹ تھمتی جا رہی ہے۔

تم میرے ہو' ہمیشہ ہی' صرف میرے رہے ہو۔ اسی لئے کہتا ہوں' سفید پنکھوں والی اس خوبصورت کایا کو دیکھو' غور سے دیکھو' اور سو جاؤ' سو جاؤ۔

رات ڈھہ رہی ہے۔ یا شاید ڈھہ چکی۔

دور' افق پر' بادلوں نے شامیانے گرا دئے ہیں۔

O

انور عظیم کی کہانیوں اور ان کے ناول 'جھلستے جنگل' کے کرداروں نے میرے ذہن کے پردوں پر جو نقوش ابھارے ہیں' انہیں میں کس نام سے پکاروں؟

ان کرداروں کی بے رحمی‘ سفاکی اور سچائی مجھے سماجی تصادم کی نئی جہتوں سے آگاہ کرتی ہے اور حسد‘ عدم اعتماد اور خود غرضیوں سے بھری اس تنگ و تاریک دنیا میں میرے لئے فکروعمل کی بے شمار قندیلیں ایک ساتھ روشن کرتی ہے۔

انور عظیم کی تخلیقی جڑیں بہار کے گاؤں میں ہیں۔ وہ جہاں کہیں بھی رہے ہوں‘ بہار کے سفیر بن کر رہے ہیں۔ بہار کی مٹی نے‘ آب و ہوا نے ان کا تعاقب کیا ہے۔ ان کے سمندر‘ ان کی ندیاں‘ ان کے آبشار‘ ان کے جنگل‘ ان کے کل کارخانے اور ان کے کھیت کھلیان بلند آواز میں کہتے سنائی پڑتے ہیں کہ ان کی moorings بہار میں ہیں‘ کہیں اور نہیں۔

بہار کی فراوانی اور محتاجی کا المیہ انور عظیم کی آنکھوں میں نمی پیدا کرتا ہے۔ میں نے بارہا‘ گفتگو کے دوران‘ ان کی آواز میں یہ نمی محسوس کی ہے۔

لیکن میری آنکھوں کی نمی‘ کس نے محسوس کی ہے یہ نمی؟

۳۰ اگست‘ ۱۹۹۹

جابر حسین

انور عظیم

کالے بگولوں سے گھبرانا نہیں

دیکھو جابر، تم نے میری کہانیوں اور ان کی جڑوں سے متعلق ایک دلچسپ سوال پوچھا ہے۔

اسی طرح، دوسرے لوگ بھی پوچھتے ہیں، ادب میں انسانی رشتوں کی دریافت اور انکشاف کا طریقہ کب ایجاد ہوا؟ میرے پاس نہ اس کا علم ہے نہ کشف، جس سے ترسیل کا کام لوں، اور نچا تلا جواب دے سکوں۔ تو پھر کیسے طے ہو اس فنی تخلیق اور تخلیقی فن کا مرحلہ؟ لو یہ بھی ایک سوال بن گیا۔ ایک سوال یا ہزاروں؟ ایک پورا سلسلہ ہے جسے ہم زندگی کہتے ہیں، اور کہانی کے تانے بانے بنتے چلے آتے ہیں۔ یہ مرحلہ بھی ہے اور ترسیل کی بخیہ گری بھی۔

آؤ، بات یہیں سے شروع کرتے ہیں۔

جس طرح درختوں کی چھال اتارتے ہیں، اسی طرح صدیوں کے تجربوں سے ان کے ماضی کا لباس اتارا جاتا ہے۔ لباس اترتے ہیں اور مستقبل کا سفر شروع کرتے ہیں۔ یہ سفر جسمانی بھی ہے اور روحانی بھی۔ یہ ساری باتیں، درحقیقت تلمیحاتی ہیں، اور میرے اندر چھپے ہوئے احساس کے تاروں کو چھیڑتی اور جگاتی ہیں۔ ماضی کے تجربوں کی ذاتی تلمیح؟ کیا مطلب؟

یہ ایک پوری دنیا ہے، میری روح میں الجھی ہوئی اور سرشار۔ یہ سرشاری غم بھی ہے، اداسی بھی۔ انسان بیک وقت اپنے اندر اور معاشرے میں جیتا ہے۔ یہ ایک لمسیاتی خواب یا "وژن" ہے، جو لاوے کی طرح میرے اندر پک رہا ہے۔ اس کا پہلا انگارا زندگی کے الاؤ میں جلتا، بجھتا رہا ہے۔

میں صبح سویرے جب آنکھ کھولتا ہوں تو کھلی آنکھیں بھی بند رہتی ہیں' اور میں بچی ہوئی آنکھوں سے دھوپ کو دیکھتا ہوں' منڈیر پر پر سکھاتے ہوئے! بند آنکھوں سے میں کوّے کی کائیں کائیں سنتا ہوں' نانی کی سنائی ہوئی سانپ کے اڑنے کی کہانیاں سنتا ہوں' پھر رات مجھے ڈھانپ لیتی ہے' اور پھر صبح ہو جاتی ہے۔ اگتے ہوئے سورج کی دھوپ آہستہ آہستہ شیشم' کروندے اور شریفے کے پیڑوں کو رات کی اوس کے ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ یہ زندگی کی صبح ہے' رات کے انتظار میں!

ذاتی اور اندرونی انکشاف کی طلسم کاری کی کہانیاں شاید اس لئے سنائی جاتی ہیں کہ ہم اپنی انفرادیت کو ثابت کریں۔ لیکن یہ انداز تحریر اتنا عام ہو چکا ہے کہ اس میں نیا پن نہیں ہے۔

شام کی شفق'
صبح دم'
رات کی انگڑائیاں'
سورج کے چڑھنے تک
افق پر روشنی کا بڑھتا ہوا سیلاب
کیا ہے یہ سب؟
کہاں ہے اس میں انوکھا پن؟
کون جانتا ہے یہ'
کون ہے جو کہہ سکتا ہے
وثوق سے؟
لیکن زندگی کا طلسم فشار ہے ایک انتھک

پھر کیوں نہ دریا کے کنارے کاٹتے ہوئے تجل خوابوں کو اپنی کہانی' اور سب کی کہانی کو اپنی کہانی بنا لیا جائے۔ تب یہ دراصل انسانی رشتوں کی کہانی بن جاتی ہے' اور تب یہ اپنی سبک روی اور داخلیت کا مزاج بن جاتی ہے' اس لئے کہ ہم اس طرح اپنے خوابوں اور عزائم کا نخلستان بساتے ہیں۔

میں نے اپنی ۵۶ سال کی تخلیقی زندگی میں نہ جانے کتنے تجربے کئے ہیں۔ یہی تجربے اب ڈھل ڈھلا کر اپنے پاسبان بن گئے ہیں۔ لیکن یہ شاعرانہ نثر ہو یا کھردری پیکر تراشی‘ ہم صرف اپنی تلاش میں ہیں‘ اور تلاش سے جو کچھ ہاتھ آتا ہے وہ تخلیق کا رتبہ حاصل کر لیتا ہے۔ یہی تلاش افسانے کو افسانہ بناتی ہے۔ میرے ساتھ یہی ہوا ہے۔ اسی لئے بڑی بڑی اصطلاحوں سے خجل ہوں۔ بہت کوشش کرنے پر بھی ایک خاص تجربہ پھر ہاتھ نہیں آتا۔ سب کچھ مٹ جاتا ہے‘ گزرے ہوئے لمحوں کے ساتھ۔ البتہ گزرے ہوئے وقت کی آہٹیں ہم سفر بن جاتی ہیں۔ اور جب ہم اس تجربے کا اظہار کرتے ہیں تو وہ تجربہ اپنے اظہار کے پیمانے کی وجہ سے افسانہ بن جاتا ہے۔

اے دل تو کتنا آباد ہے کہ تیرے پاس سب کچھ ہے۔ افسانہ بھی۔ یہ افسانہ‘ یا قصہ یا کہاوت بہار کی مٹی میں پیوست ہے۔

افق تک سرسوں کے کھیت ہیں‘ گنے کے کھیتوں کا سبزہ زار ہے۔ کوے‘ طوطے‘ مرغابیاں‘ سیار‘ جو ابھی رنگے نہیں گئے ہیں۔ دھان کی پنریاں‘ ہم اس کو بول چال کی زبان میں کیا کہتے تھے۔ ہرن‘ بارہ سنگھے‘ شتر مرغ‘ شیر‘ چیتا‘ پرندوں سے ڈھکا ہوا نیلا آسمان‘ ہوائیں جو موسم کے ساتھ بدلتی رہتی ہیں‘ اور خرگوش!

O

انسانی رشتہ زندگی کا نمک ہے‘ جو آہستہ آہستہ خون پسینے کے ساتھ رستا ہے۔ دکھائی نہیں دیتا۔ یہی اشاریت ہے‘ رمزیت ہے۔ جہاں بھی ایک سے زیادہ لوگ یکجا ہوتے ہیں تجربوں کا لین دین شروع ہو جاتا ہے۔

میرے بچپن میں جب کھپریل سے ڈھکے ہوئے سائبان میں مہمانوں اور عزیزوں کی محفل جمتی تھی تو اس کی شکل منڈلی کی ہو جاتی تھی۔ اندر سے شربت کے گلاس آرہے ہیں۔ تب گھڑے کا ٹھنڈا پانی بھی بہت خوشبودار معلوم ہوتا تھا۔ مجھے تو سوندھی مٹی سے لونڈھائی ہوئی ان مشروبات سے عشق تھا۔ کبھی کبھی بزرگوں کی ڈانٹ بھی پڑ جاتی تھی۔

اس علاقے میں وارث علی گنج اور ملکی میں گاڑیاں رکتی تھیں۔ یہاں مسافروں کی بھیڑ بھاڑ میں‘

لوگ ایک دوسرے کے شناسا ہوں یا محض ہم سفر' چوپال سے جم جاتے تھے۔ قصے کہانی کی دنیا آباد ہو جاتی تھی' اور راستے کٹ جاتے تھے۔ زندگی کے راستے آج بھی کٹ رہے ہیں' اسی گرد و غبار اور سرشاری کے ساتھ۔

بہار کے دور دراز گاؤں پوسی کا سب سے زرخیز حصہ وہ ہے جہاں سرسبز و شاداب درختوں کے جھنڈ' ہرے بھرے کھیت' برساتی چین' ان پر پڑی ہوئی پھچیوں کی روک میں پھنسی ہوئی آنکھوں جیسی مچھلیاں۔ ملا وجہی کا زمانہ ہوتا تو وہ کہتے : اچھیں نین اس کیس کالے سے۔

شاعری کی طرح' بلکہ اس کی رمزیت اور اشاریت کی طرح' یہ الفاظ زندگی کی کہانی سناتے ہیں' جن میں خود افسانہ نگار کی زندگی جھلملاتی ہے۔ یہ بھی زندگی کے چوپال کی کہانیاں ہیں' اور یہی جھلملاہٹ ہماری داستان ہے۔ اس لئے اس داستان میں دکنی لوک بھاشا کی رنگا رنگی اور کشش ہے۔

ہماری شکست اور فتح کی کہانی میں' ہمارے انبساط اور نشاط کے افسانے میں ہونٹوں پر جاگتے ہوئے نغمے کی طرح ہمارے دل دھڑکتے ہیں۔ یہ افسانے ہر زمانے کے آہنگ اور ہمارے عہد کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں' اور ہمارے عہد کا symbol بن جاتے ہیں'...... سوزاں اور درخشاں' مدھم اور گریزاں۔ میں آج بھی ان سب مشاہدوں میں موجود ہوں۔

شہروں کا سفر' گیتوں' خوابوں اور آرزوؤں کا سفر' گاؤں سے شہر تک اور شہر شہر اور ملک ملک' کلکتے سے پٹنے اور دہلی تک' دہلی سے لینن گراد اور ماسکو اور لندن' پیرس تک' میرے تجربوں کے موڑ ہیں۔ افسانہ نگار جانتا ہے' اپنی زندگی سے کہیں زیادہ اہم' افسانہ ساز' اور تخلیقیت سے پر شہر اور گاؤں کی زندگی اور ان کی تہہ در تہہ رشتوں کی کونپلیں اپنے موسموں میں پھوٹتی رہیں گی۔

زمین پر بسنے والوں میں' جنہوں نے مجھے پال پوس کر بڑا کیا' انہوں نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ اور وہ آج بھی میری زندگی کی شرط ہے۔

علی گڑھ' دہلی' بمبئی اور دنیا کے دسیوں شہر' افراد اور واقعات میری زندگی کے کینوس پر بکھرے ہوئے ہیں۔ دلداریوں اور وفاشعاریوں کے دل آویز خطوط آج بھی دھنک کی طرح

ابھرے ہوئے ہیں۔ یہاں مجھے زندگی کا وہ ساتھی ملا جو آج بھی انسانی ہمدردی کا سرچشمہ بنا ہوا ہے۔ لمس آرزو سے لے کر فکر تخلیق تک جس نے مجھے ڈھانپ لیا ہے۔ لمس جاں' لمس بہ لب۔

غیر ملکوں میں جا کر رہا تو بہت سے ملکوں کے کوچوں اور شاہراہوں سے گزرتے ہوئے میں نے ان کی زندگی کو چھو کر دیکھا...... شاں زے لیزے اور گیٹ آف لبرٹی' لور اور ٹرائف آف سماترا...... قہوہ خانوں کی دھوپ سے زندگی کو چھنتے ہوئے دیکھا گیا' اور اس کی افسانویت کے جادو میں کھو گیا۔

دو سو سے زیادہ افسانے میرے قلم سے نکلے۔ وہ انسان سے انسان کے رشتوں کو متعین کرتے ہیں۔ اگر افسانہ افسانویت کے آوے میں تپا نہیں ہے تو کچا تجربہ ہے تخلیق کاری کا۔ افسانہ زندگی کے گریز اور آویزش سے نہیں پھوٹا ہے تو کچا کام ہے اور تشنۂ تخلیقیت اور محروم استناد ہے!

O

لیونارڈو دیونچی' مائیکل انجلو' پکاسو' گوداں اور دوسرے بڑے فنکاروں نے اپنی تخلیقی فکر کا اظہار کیا' جمالیاتی پیمانوں میں...... 'اور وہ پیمانے آج بھی تزکیہ نفس کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ کبھی ریزہ ریزہ' کبھی آسمان کی طرح افق تا افق...... صلیبوں کے شہر واشنگٹن' عیسیٰ اور موسیٰ' ابراہیم' نوح اور محمد کے تصورات نچوڑے اور ان کو اپنے وجود کا حصہ بنا لیا۔ میں ان میں سے ہر تخلیق میں شامل ہوں۔ اسی وصف نے مجھے ہر زندہ رہنے والے قلم کا تخلیق کار بنایا ہے۔ میرا سوچنا بھی تخلیقیت کا عمل ہے...... تجلی پاس اور رنگا رنگ۔

لیکن کیا میں کہاروں' دھان روپنے والے بہار کے کھیتوں اور جل تھل جنگلوں کی فصل کاری کو بھول سکتا ہوں!! مسہروں کے جشن کے لمحے' جب سور زندہ جلائے جاتے ہیں' کیا میں ان کے تاثر کو اپنے وجود کے احساس سے باہر نکال سکتا ہوں!! کہتے ہیں کہ میرے آزاد ہو گئے ہیں' لیکن اب بھی جہالت' مفلسی اور محرومی کا بوجھ اور غربت کا اندھیرا بہت گہرا ہے۔

O

اب آخری بات: ایک افسانہ نگار اور قصہ گو کی نظر سے جب اپنی دنیا کو دیکھتا ہوں تو کچھ کچھ سمجھ میں آتا ہے۔

میرے خیال میں سب سے بڑا افسانہ نگار وہ ہے جس نے خلد بریں کی تشکیل کی۔ یہ خلد بریں جو تخلیقیت کا سب سے بڑا ideal تھا' آج بھی جاگ رہا ہے۔ جس نے گندم کی بالیں اور سیب کے پودے اگائے اور کائنات کی تسخیر کا جذبہ پیدا کیا۔ اسی آغاز سے مظاہر کائنات کا شعور جاگا اور وہ اس طرح کہ عالم موجودات سے ماضی اور مستقبل کے تصورات میں تعمیر وتخریب کی ارتقائی اور فلسفیانہ بصیرت کی داغ بیل پڑی۔ یہ پہلا زینہ تھا انسانی رشتوں کی زمیں بوسی کا۔ اس کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور یہ تمام مظاہر کی خلاقی کا جذبہ ہے۔ بہت کچھ ہے جو آشکار ہے' بہت کچھ ہے جس کو آشکار کرنا ہے۔ بہت کچھ ہے جو شعلہ فشاں ہے' بہت کچھ ہے جس کو اپنی پہچان کا انتظار ہے۔ زندگی اپنے ڈھنگ سے چل رہی ہے۔ اس ڈھنگ میں افسانہ نگار وسیلہ ہے ایک سماجی بے خودی کے اظہار کا۔

اس قصے میں برادرکشی کا جذبہ بھی شامل ہے۔ ابلیس اور خباثت کا اپنا رول ہے۔ لیکن انسان آخر میں خیر وشر کی اس جنگ میں فتحیاب ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ خود اپنی زندگی کے ارتقا کے افسانے لکھ رہا ہے۔

انسان نے سائنس اور علم کی مدد سے اندھے جنگل میں راستہ نکالنے کی کوشش کی ہے۔ اسے کچھ لوگ جسارت کہیں گے' لیکن یہ انسانی رشتوں کا تعمیری پہلو ہے۔ ارتقا کی اس تخلیقیت کے دور میں سماجی رشتوں کا بڑا ہاتھ ہے۔ اور یہ یقین کامل کہ شر اپنی نیوکلیائی خودکشی کے تمام حیلوں اور وسائل کے باوجود آخر میں ناکام ہوگا' اور انسان کی نیکی فتحیاب!

میرا افسانوی شعور مجھ سے کہتا ہے: کالے بگولوں سے مت گھبراؤ' اپنے فن میں زندگی کو جگہ دو' اور خدا کو' جو وقت کی طرح اتھاہ ہے' اپنا ناخدا بناؤ۔ وقت کا ساحل ایک واہمہ ہے اور زندگی تضادات سے پُر۔ ایک تخلیق کار کا راستہ انہیں تضادات کے بیچ سے گزرتا ہے......

میں زندہ ہوں

میں مر چکا ہوں۔۔۔۔

کون کہتا ہے' میں مر گیا ہوں۔ میں زندہ ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ میرے جسم سے گولیاں گزری ہیں۔۔۔۔ یہ ٹھیک ہے کہ دشمنوں کی نظر میں مر چکا ہوں۔ یہ ٹھیک ہے کہ پوسٹ مارٹم کے بعد میرا جسم ہگلی کے حوالہ کر دیا گیا ہے۔ پھر بھی میں زندہ ہوں' مجھے کون مار سکتا ہے۔۔۔ میں ماضی کا ورثہ ہوں۔ میں مستقبل کی روشنی ہوں۔ میں فضا میں بلند ہوں۔ وکٹوریہ میموریل کے گنبدوں سے بلند' ناریل اور جامن کے درختوں سے بلند'۔۔۔۔ میں یہاں سے دور تک دیکھ سکتا ہوں' قطب اور تاج کو دیکھ سکتا ہوں۔۔۔۔ گنگا اور جمنا کا سنگم کتنا خوبصورت معلوم ہوتا ہے'۔۔۔۔ ہیر رانجھا کی محبت تجلی پہنے گنگا اور جمنا میں چاندی کے تار کی طرح چمک رہی ہے۔۔۔۔ یہ چمک پنجاب سے ابھری ہے اور ساری فضا میں پھیل گئی ہے' ساری زندگی میں گھل گئی ہے۔۔۔۔ میرے تجربات کا خزانہ کتنا بھاری ہے۔ میں اس خزانہ کو لٹانا چاہتا ہوں۔ میں حاتم طائی ہوں۔۔۔۔ میں اسے لٹانا چاہتا ہوں۔ ان فنی تجربات کو جو ایک کبھی نہ مرنے والے آبشار کی طرح موج زن ہیں۔۔۔۔ میں دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔ صاف دیکھ رہا ہوں۔

میرا پتلا دبلا جسم۔۔۔۔ زرد' پتلا دبلا' پیارا پیارا بدن' پانی کی موجوں میں پیچ و تاب کھاتا ہوا اپنے سفر کے اس دہانے پر پہنچ گیا ہے' جہاں سے خلیج بنگال کا چوڑا چکلا سینہ اژدہا کی طرح دکھائی دے رہا ہے۔۔۔۔ میں اس جسم کو پہچانتا ہوں۔۔۔۔ کس تیزی سے یہ جسم سمندر کی طرح بہتا جا رہا ہے اور نتھنے پھلا کر لپکنے والا نیلا سمندر کتنا مطمئن دکھائی دیتا ہے۔ جیسے اس کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ ہو۔

میں اس جسم کو پہچانتا ہوں۔ کیوں۔۔۔۔ میں نہ پہچانوں تو اور کون پہچانے گا۔ میں اسی جسم میں اٹھارہ سال تک سانس لیتا رہا ہوں۔۔۔۔ دھان کی طرح زرد اور گیہوں کی بالیوں کی طرح خوبصورت جسم سنہرے دیس میں پلتا رہا۔۔۔۔ اور اب یہ اپنا سفر طے کر کے خلیج بنگال کی طرف تیزی سے دوڑا جا رہا ہے۔ میں اسے کیسے بھولوں گا۔ یہ جسم تیزی سے اپنے نقوش کھوتا جا رہا ہے۔ یہ بدن بدلتا جا رہا ہے۔ خود مجھے پہچاننے میں دقت ہو رہی ہے۔ خوبصورت زرد گال پانی میں بہتے بہتے سڑنے لگے ہیں' آم کے گودے کی طرح۔ آنکھوں کی قبر میں پانی چھوٹی چھوٹی چاندی کی مچھلیوں کی طرح جھلملا اٹھتا ہے۔ اور اب بھی مچھلیاں تلووں کا گوشت چاٹ رہی ہیں۔ مچھلیوں کے ننھے منے منہ سے چھوٹے ہوئے گوشت کے ریزے موتیوں کی طرح چمکتے ہوئے موجوں کے جھاگ میں کھو جاتے ہیں۔ سینے پر بال چپکے ہوئے ہیں۔ گردن کی ہڈی کے اور سینے کے درمیان دو گولیوں نے اپنے خونخوار سفر کا نشان چھوڑ دیا ہے۔ کتنا جنون تھا ان گولیوں کی جھپٹ میں اس کا اندازہ ان کالے نشانوں سے ملتا ہے جو ان زخموں کے اردگرد ہالے کی طرح گھیرا ڈالے ہوئے ہیں۔ گولیاں اپنا سفر طے کر چکی ہیں اور یہ نشان گرد کارواں کی طرح پیچھے رہ گیا ہے۔۔۔۔ میں اس جسم سے کتنی محبت کرتا ہوں' بہت پہلے۔۔۔۔ میرے گاؤں میں۔۔۔۔ میرے مکان کے پاس ایک مہوے کا درخت تھا۔ اس پر چڑیوں نے گھونسلہ بنایا تھا۔ ایک روز مجھے شرارت سوجھی۔ میں نے اس میں آگ لگا دی۔ اور پھر میں نے دیکھا۔ چڑیوں کے معصوم اور مظلوم جوڑے نے وہ چاؤں چاؤں مچائی تھی کہ ہر طرف ایک گونج سی دوڑ گئی۔ اس وقت جب میں اس جسم سے باہر نکل آیا ہوں۔۔۔۔ تو میری آنکھیں ڈبڈبا آئی ہیں'۔۔۔۔ لیکن اس وقت تو چڑیوں کی مصیبت دیکھ کر میں خوشی میں جھوم اٹھا تھا۔۔۔۔ میں نے اچھل اچھل کر ہنسنا شروع کر دیا تھا۔۔۔۔ ہنسی کے مارے میری آنکھیں موند گئی تھیں۔ ۔۔۔ ورنہ میں نے چڑیوں کی ان ننھی سرخ آنکھوں میں آنسوؤں کی وہ اذیت ناک چمک دیکھی ہوتی کہ آج میں اپنی تکلیف کو ماند محسوس کرتا۔

میں اس مٹتے ہوئے' مرتے ہوئے' مچھلیوں کا شکار بنتے ہوئے' خلیج بنگال میں گرتے ہوئے' گولیاں کھا کر داغ لئے پھرنے والے جسم کی کہانی جانتا ہوں۔

مہندر بہار کے ایک گاؤں میں پیدا ہوا تھا۔۔۔۔ یہ اس جسم کا نام تھا جو کلکتہ کی سڑک پر گولیاں

کھا کر شہید ہوا۔ اور اب جو خلیج بنگال کی ہانپتی ہوئی' سانس روکتی ہوئی موجوں میں کھو رہا ہے' ان ہی وحشی' تیز اور گنگناتی ہوئی اور جھاگ تھوکتی ہوئی موجوں میں' جن میں ٹیگور کے گیتوں کا' ان کے مدھم سروں کا خواب ناک ابھار بھی سوگیا ہے۔۔۔۔ لیکن اس جسم کے اندر ایک اور مہندر تھا' جو شہر مہندر کے جسم سے زندہ نکل گیا ہے۔۔۔۔ وہ ہر انسان میں مشترک ہے'۔۔۔۔ اور وہ ہر انسان کے جسم سے زندہ نکل جاتا ہے۔ موت اسے چھو نہیں سکتی۔۔۔۔ مجھے موت چھو نہیں سکی۔ مہندر کی کہانی گویا میری اپنی کہانی ہے۔

ہاں تو وہ ایک کھاتے پیتے گھرانے میں پیدا ہوا تھا۔۔۔۔ وہ بہت شریر تھا۔ ذہین اور شریر۔۔۔۔ جب وہ چھوٹا سا تھا اس کے باپ نے ایک روز پاس بلا کر خوب چمکارا۔۔۔۔ صبح کا وقت تھا۔ ٹھنڈی ہوا کاٹ رہی تھی۔ اس کے مکان کے سامنے کھلیان لگا ہوا تھا۔ دھان کی دماہی ہو رہی تھی۔ اور اس کا باپ سامنے بنگلے میں بیٹھا جماہی پر جماہی لے رہا تھا۔ اس کی مونچھیں پھڑک رہی تھیں۔ چلم سے چنگاریاں اڑاڑ کر اس کے چندلے ماتھے کی طرف جا رہی تھیں۔ اس کا چندلا ماتھا سوکھے ہوئے کدو کی طرح چمک رہا تھا جس پر تیل کی مالش کر دی گئی ہو۔ چلم سے دھوئیں کا ایک تار آہستہ آہستہ اوپر کی طرف اٹھ رہا تھا۔ جو اوپر جا کر پھیل جاتا اور پھر کہرے کے ایک پگھلتے ہوئے دھبے میں تبدیل ہو جاتا۔ مہندر اپنے باپ کی چمکار سے بے پروا دھوئیں کے اس تار کو پکڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا باپ ہنس رہا تھا۔ اس کا باپ کھینچ کر اسے سینے سے لگانا چاہتا تھا۔ اور وہ ہمک کر دھوئیں کے تار کی طرف چاؤ سے لپک رہا تھا۔ اس کھینچ تان میں مہندر کا ہاتھ چھوٹ گیا اور چلم سے ٹکرا کر وہ زمین پر گر گیا۔ اس کا گال جھلس گیا۔ اور سامنے کھڑے ہوئے کمیا نے اسے اٹھانے میں ذرا دیر کی تو اس کے باپ نے اپنے جوتے کی ساری گرد اس کے ننگے جسم پر جھاڑ دی۔۔۔۔ اس کی سونے کی انگوٹھی سے اس کمیا کا ماتھا چھل گیا اور خون کی ایک گرم لکیر پھوٹ کر ناک کے کنارے بہہ کر نیچے اتر آئی۔

وہ اپنے باپ کی مونچھوں کا دشمن تھا۔ جب اس کی مونچھیں پھڑکتیں اور اپنے آسامیوں اور کمیوں پر خفا ہوتا رہتا اور اس کی سفید دانتوں سے ایک وحشی چمک نکلتی ہوتی تو وہ اچھل کر اس کی مونچھوں کو نوچنے لگتا۔۔۔۔ اس کا باپ اسے گود میں اٹھا کر سینے سے چمٹا لیتا اور کمیوں کی جان بچ جاتی اور وہ سو سو دعائیں دیتے سرکار کی برق باریوں سے دور ہو جاتے۔

پاٹھ شالہ اور مڈل اسکول کی پڑھائی ختم کر کے وہ شہر چلا گیا۔ شہر میں اس نے خوب خوب شرارتیں کیں۔ وہ اپنے ساتھیوں میں کبھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ کسی نے ذرا تاؤ دکھایا اور اسے آگیا تاؤ۔ پھر مہندر کی کے بازیاں تو دسویں جماعت تک پہنچنے سے پہلے ایک خاص وقار اور دھونس قائم کر چکی تھیں۔۔۔۔

اسکول میں ایک دن ایسا حادثہ ہوا' جس نے اس کے دماغ کو ایک نئے سانچے میں ڈھالنا شروع کر دیا۔ ایک ماسٹر نے آوارگی کی انتہا کر دی تھی۔ وہ ہاسٹل کا انچارج بھی تھا۔ رات کو وہ کسی نہ کسی عورت کو لے آتا اور صبح کے جھٹ پٹے میں اسے رخصت کر دیتا۔ مہندر کو اس کی کارگزاریاں معلوم تھیں۔ جب اس کے پاس کوئی نہ ہوتا تو وہ اس کے بارے میں سوچا کرتا۔ اور اپنے اندر والے مہندر' یعنی مجھ سے اس مسئلے پر۔۔۔۔ باتیں کیا کرتا۔

"اس سالے ماسٹر کو ضرور ٹھیک کرنا چاہئے۔ کلاس میں تو وہ ودوان پنڈت کی طرح چنگھاڑے گا۔ ہندومت کی برائیاں کرے گا۔ مسلمانوں کو اورنگ زیب کی اولاد کہے گا۔۔۔۔ لیکن برہمن کی اولاد۔۔۔۔ مہترانیاں کہاں کی دیوداسیاں ہیں۔ دھت۔۔۔۔"

اور تب میں اسے بہت پیار سے دیکھا کرتا تھا۔ کتنا پیار آتا تھا مجھے اس کے بھولے چہرے پر۔ پھٹی پھٹی آنکھیں جن میں شبنمی نرمی ہر وقت کانپتی رہتی تھی۔ ہونٹوں کا بھنچا ہوا غم اس کی اداس مسکراہٹوں کو اور بھی غم انگیز بنا دیتا تھا۔ پیشانی پر ایک بڑا سا تل پسینے میں بھیگا رہتا اور اس کی مسیں کتنی بھلی لگتی تھیں۔ اس کے کان جل اٹھتے۔۔۔۔ اور ماسٹر کو ٹھیک کرنے کے منصوبے باندھتا رہتا' جیسے ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ اس کے سامنے آگیا ہو۔

آخر ایک روز ماسٹر کی شامت آ ہی گئی۔ ہاسٹل کے لڑکوں نے مہندر کی رہنمائی میں مہترانی کے ساتھ ودوان ماسٹر کو پکڑ لیا' خوب پیٹا ماسٹر صاحب کو۔ جلوس نکال دیا' ہاسٹل میں۔ بارہ بجے رات کو اچھا خاصا چکلس ہو گیا اور ماسٹر صاحب گوتم بدھ کی مورت کی طرح چپ۔ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ لیکن یہ معاملہ ہیڈ ماسٹر نے دبا دیا۔ وہ اس کا رشتہ دار تھا۔ پتنگ لڑی مگر کٹی نہیں۔

ایک روز اسی ماسٹر نے شیواجی اور اورنگ زیب کی لڑائی کا ذکر کرتے ہوئے ہندو مسلم سیاست کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

"ماسٹر صاحب۔۔۔۔ شیواجی اور اورنگ زیب کی لڑائی مذہب کی لڑائی نہیں تھی بلکہ گدی کی لڑائی تھی۔" بس بھونچال آ گیا۔ ماسٹر صاحب ایک دم آگ بگولا ہو گئے۔ ان کی آنکھیں الو کی آنکھوں کی طرح ناچنے لگیں۔ جیسے آتش بازیوں کی دکان پر دیا سلائی جلا کر پھینک دی گئی ہو۔ ہیڈ ماسٹر نے اس ہتھیلی پر بید سے سانپ کا سیاہ نشان بنا دیا۔ اور وہ نشان جلتے ہوئے تیر کی طرح اس کی ہتھیلی میں گزر رہا تھا۔ میں اس روز اندر ہی اندر بہت بپھرا تھا اور اس روز سے میں نے مہندر کو بغاوت کا راستہ دکھانا شروع کر دیا۔۔۔ میں اس پر اثر انداز ہونے لگا'۔۔۔ چھانے لگا۔

پھر رفیق سے اس کی دوستی بڑھنے لگی۔ رفیق اس کا ہم جماعت تھا۔ وہ ایک پتلا دبلا لڑکا تھا۔ اس کے بال گھونگھریالے تھے۔ اس کا رنگ سانولا تھا۔ اس کا چہرہ کافی لانبا تھا۔ ناک نکلی ہوئی اور پیشانی دھنسی ہوئی۔ وہ ہمیشہ مسکراتا رہتا تھا۔ یا کم از کم مسکراتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس کی آنکھوں کے اندر ٹارچ کے بلب کی طرح کوئی چیز جلتی ہوتی۔ دور ہوتی ہوئی اور قریب آتی ہوئی روشنی سی۔ مار کھانے کے دوسرے دن رفیق اپنی آنکھوں کے بلب کو چمکاتا ہوا اس کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا۔

"تمہیں ہیڈ ماسٹر کے سامنے جھکنا نہیں چاہئے تھا۔ تم نے ہاتھ کیوں بڑھایا۔ تمہارا قصور کیا تھا۔ تم آدمی ہو یا بیل؟"

اور میں نے دیکھا تھا رفیق کی آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ مہندر اس کی آنکھوں کو گھورتا رہا۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ اس کے کانوں میں صرف ایک بھاری فیصلہ کن آواز گونج رہی تھی۔ آدمی ہو یا بیل۔ ٹھیک ہے۔۔۔۔ یہ فیصلہ کرنا ہوگا میں آدمی بن کر رہوں گا یا بیل بن کر۔۔۔۔ ایک طرف رفیق اپنی آنکھوں کی چمک کے ساتھ کھڑا مسکرا رہا تھا۔ دوسری طرف اس کا باپ تھا۔ بنگلہ تھا۔ سامنے کھلیان تھا۔ کانپتے منھ بسورتے' ہنسی سے بے نیاز کئے تھے۔۔۔۔ اور بیل جن کے منھ سے جھاگ نکل رہا تھا اور جو دہائی کر رہے تھے۔۔۔۔

دونوں کی دوستی بڑھنے لگی۔ (یہ سب میں اس لئے کہہ رہا ہوں تاکہ مہندر کی کہانی سب لوگوں کو معلوم ہو جائے' پھر کوئی اس کی کہانی سنانے نہیں آئے گا) انٹرنس کا امتحان دینے تک مہندر سنجیدہ قسم کا سوچنے والا ایک نوجوان بن گیا تھا۔ وہ اپنے نچلے لب کے ایک کونے کو دانتوں سے

نوچتا رہتا۔ کبھی کبھی خون کا ایک قطرہ نکل کر چمکنے لگتا۔ لیکن وہ ہونٹ چبانا نہ چھوڑتا۔۔۔۔

شام کے وقت رفیق مہندر کے کمرے میں پہنچا۔ اسے ہاسٹل سے نکال دیا گیا تھا۔ اور وہ بھارت ٹاکیز کے پاس ایک کمرہ لے کر رہنے لگا تھا۔ مہندر امتحان دے کر اب گاؤں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ بھارت ٹاکیز سے فلمی گانوں کی آوازیں آ رہی تھیں' عشقیہ گانے۔ مہندر ان گانوں سے بہت چڑتا تھا۔ اس نے اپنے سیاہ جیکٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر سنیما کی طرف دیکھا۔

"کیا مہندر آج ہی چلے جاؤ گے۔۔۔۔؟"

"نہیں یار'۔۔۔۔ صبح چلا جاؤں گا۔ سب پیسے کتابوں پر ختم ہو گئے۔"

"کون سی کتابیں۔۔۔۔"

"وہی۔۔۔۔"

رفیق مسکرایا اور مہندر کو دیکھنے لگا۔ جیسے وہ اس کی روح میں اترنا چاہتا ہو۔

"چلو۔۔۔۔ آج چھ سات آنے پیسے مل گئے ہیں۔۔۔۔ چائے پئیں گے۔"

باسدیو کی دکان سے چائے کی سوندھی سوندھی خوشبو جال سی بنتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔۔۔۔ دماغ اس جال میں پہنچ کر ایک کیف سا محسوس کرنے لگتا تھا۔ باسدیو کے یہاں دودھ میں خاص بات ہوتی تھی۔ محض چائے کی وجہ سے ہزاروں روپیوں کا مالک ہو گیا تھا۔ وہ بالکل جاہل تھا مگر اس کے پاس کار تھی' اس کے پاس سونے کی زنجیر تھی' اس کے پاس چہرے کی سیاہی تھی اس میں مکھن کی چمک تھی۔ اس کے گلے میں سونے کی زنجیر بھینس کے گلے میں پیلے ریشم کے دھاگے کی طرح چمکتی رہتی تھی۔ اس کی توند اس کی رانوں پر رکھی رہتی اور وہ اسے اپنے ہاتھوں سے سہلاتا رہتا۔ جیسے روٹھے ہوئے بچے کو مٹھائی کے وعدے پر منا رہا ہو۔

"مان جاؤ بھئی مان جاؤ۔ لیمن چوس دوں گا۔۔۔۔"

"تو تم کالج میں ضرور نام لکھاؤ گے۔۔۔۔"

"ہاں۔۔۔۔" مہندر نے آنکھیں اوپر نہیں اٹھائیں۔

رفیق مسکرانے لگا۔

اور تم۔۔۔۔ مہندر نے پوچھا۔

"میں ۔۔۔۔" چائے کے گھونٹ کو شراب کی طرح حلق کے پار اتارتے ہوئے وہ مسکرانے لگا۔ "میں اب نہیں پڑھوں گا"۔۔۔۔ مجھے اس سے بھی ضروری کام کرنا ہے۔ میرے ابا کے پاس اتنا پیسہ نہیں ہے۔ کلرک سے امید ہی کیا رکھتے ہو۔ رشوت سے کتنا کام چلے۔ پھر بہن کی شادی۔" وہ یکایک سنجیدہ ہوگیا۔ "میں دوسرا کام کروں گا"۔۔۔۔

وہ مسکرانے لگا۔ مہندر کے ہونٹ بھی پھیل گئے' آنکھوں کا پھیلاؤ چمک اٹھا اور گالوں پر بھنور سا بن گیا۔

رفیق نے ایک اور گھونٹ حلق کے پار کیا۔ اور دھیمی آواز میں کہنے لگا۔ "آج میں تم سے بہت ہی ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔۔۔۔ میں تو اب اپنی پارٹی کو پورا وقت دوں گا۔ یہی میری زندگی ہے۔۔۔ سمجھے۔" وہ کھڑا ہوگیا۔ ایک آدمی اس کی گفتگو کو بہت غور سے سن رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں سیاہی تھی اور اس میں ایک ہولناک چھچھورا پن تھا۔ دونوں ساتھ ساتھ چلتے رہے۔ چپ۔ دونوں کا دل بھرا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ رفیق کو کچھ کہنا تھا۔ مہندر کو کچھ سننا تھا۔ دونوں ندی کے کنارے جاکر بیٹھ گئے۔ پل پر سے بگھیاں' رکشے' بیل گاڑیاں' ٹرکس اور ٹیکسی گاڑیاں گزر رہی تھیں۔

ندی کا پانی آہستہ آہستہ رینگ رہا تھا۔ پانی کے نیچے بالو چمکتا ہوا نظر آرہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے پتھر خاموش پڑے ہوئے تھے اور بہتے ہوئے پانی کی سطح پر بلوریں رگوں کی طرح صاف شفاف نشانات ابھر رہے تھے۔ سورج درختوں کے جھنڈ کے پار سرخ کرنوں کے جال کو تھکے ہوئے مچھیرے کی طرح سمیٹ رہا تھا۔

رفیق نے اپنا گلا صاف کیا' جیسے کچھ گائے گا۔ اور اس کی آواز ندی کے نرم رو بہاؤ میں ڈوب گئی۔ اور پھر وہ بولنے لگا "تم کافی ترقی کر گئے ہو مہندر۔ تمہیں اس کام کو جاری رکھنا ہے۔۔۔۔ کتے اور بکری کی زندگی کا کوئی مطلب نہیں ہوتا۔"

وہ رکا۔۔۔۔ دونوں کی آنکھیں کاٹن مل کی چمنی سے اٹھتے ہوئے دھوئیں پر جم گئیں۔ پل پر سے بگھیاں' رکشے' بیل گاڑیاں اسی طرح گزر رہی تھیں۔ دھندلکے میں وہ سب ایک سایہ کی طرح معلوم ہو رہے تھے'۔۔۔۔ "تمہیں اپنی زندگی کو اس گندگی سے نکلنا ہے بلکہ۔۔۔۔"

"میں سمجھتا ہوں' ۔۔۔۔ میں سمجھتا ہوں' ۔۔۔۔ اور اس کی آنکھوں میں اس کے باپ کی مونچھیں ابھر آئیں۔ کانپتے ہوئے لرزتے ہوئے کمہار گئے۔۔۔ کالے کالے اجسام۔ خاموش آنکھیں' روشنی سے بے نیاز اور ہونٹ جو مسکراہٹ کی ایک ادھ کرن سے فاضل کچھ نہ حاصل کرپاتے۔" میں سمجھتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں۔" وہ چپ ہوگیا۔

رفیق ڈوبتے ہوئے سورج سے پھوٹتی ہوئی سرخ شعاعوں کو دیکھتا رہا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ دو تین دھوبی اور دھوبنیں گدھوں پر کپڑوں کا موٹے لاد کر چلی جا رہی تھیں۔ سر پر بڑی بڑی گانٹھیں رکھے۔ بڑھتے ہوئے اندھیرے میں معلوم ہوتا تھا کہ دھوبیوں اور دھوبنوں کا سر ہوا سے پھول گیا ہے۔ اس نے بچپنے میں سوچا تھا بڑے بڑے لوگوں کا سر بہت بڑا ہوتا ہوگا۔ بالکل اسی طرح۔۔۔۔

رفیق اور مہندر کھڑے ہوگئے۔ مہندر نے رات کا کھانا رفیق کے ساتھ کھایا۔ اسے بار بار اپنی حالت کا خیال آتا رہا اور وہ خود بخود مسکرا پڑا۔ دونوں ساتھ ہی سینما گئے۔ سیکنڈ شو کے بعد رات بہت گہری ہوگئی تھی۔ دونوں آخری موڑ پر باسدیو کی دکان کے پاس اپنے اپنے کمرے اور گھر کی طرف مڑ گئے۔ دونوں خاموش تھے اور دونوں کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

جب وہ امتحان پاس کر گیا تو اس کے باپ نے گلے سے لگا کر کہا۔ "اب تمہیں میں کلکتہ بھیج دوں گا۔ سائنس پڑھ کر انجینئر بن جائے گا میرا بیٹا۔۔۔۔" اس کا باپ مونچھ سمیت اپنے قہقہے کو چبانے لگا۔ مہندر کو اس کا باپ عجیب معلوم ہوا۔ اس نے پوری چھٹی کتابوں کے پڑھنے میں بتا دی تھی۔ ان میں سے کچھ کتابیں اسے رفیق سے ملی تھیں۔۔۔۔ اور کچھ اس نے خود پیپلز بک شاپ سے خریدی تھیں۔

ایک روز وہ پھلواری میں بیر اور شریفہ کے درخت کے نیچے بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ اس کا باپ آکر اس کے کندھوں پر جھک گیا۔ وہ دیر تک کتاب پر جھکا رہا۔ اس کی مونچھیں مہندر کے کان میں گدگدی پیدا کر رہی تھیں۔ اس نے اس کے ہاتھ سے کتاب لے لی اور واپس کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "کیا لکھا ہے اس کتاب میں۔ اس میں وہی نشان ہے جسے لے کر سالے کسانوں نے پاگلوں کی طرح چیخنا شروع کر دیا ہے۔" اس کے گلے میں بلغم اٹکتا ہوا معلوم ہوا۔ مہندر مسکرایا

اور وہ بلغم تھوکتا ہوا چلا گیا۔

باپ کے ساتھ مہندر کھانے پر بیٹھا ہوا تھا۔

"اب تو آزادی مل ہی گئی۔ ۱۵ اگست کو کتنے دن رہ گئے ہیں۔ گاندھی جی اور نہرو جی نے کمال کر دیا۔۔۔"

"ہاں ہندوستان کو آزادی مل گئی۔ لیکن یہ لوگ بٹوارے پر کیسے راضی ہو گئے بابو جی۔"
"انگریزوں نے یہی بھلا سمجھا تو ٹھیک ہے۔ پھر یہ مسلمان۔" اس کی آنکھوں میں نفرت کا شعلہ چمک اٹھا۔ "جائیں سالے سب اب پاکستان۔"

"دیش کا بٹوارہ بھائی بھائی کو لڑائے گا۔۔۔' اس کی آنکھوں میں رفیق کا سانولا مسکراتا ہوا چہرہ کھل اٹھا۔ وہ ہاتھ دھو کر اٹھ گیا۔ اس کا باپ حیرت سے منہ کھولے اسے کمرے سے باہر جاتا ہوا دیکھتا رہا جیسے اس نے کسی کنواری لڑکی کو کسی غیر مرد کی آغوش میں دیکھ لیا ہو۔۔۔

گرمی کی تعطیل کے بعد مہندر کے کلکتہ جانے کا دن آ گیا۔ رات کا وقت تھا۔ پیٹرومیکس کی تیز روشنی سنہرے تھان کی طرح دور تک کھلتی چلی گئی تھی۔ صبح ہی اس کی روانگی تھی۔ غریبوں کو کھانا کھلایا جا رہا تھا۔ کہار' مہتر' کوئری۔۔۔ سب گدھوں کی طرح بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسری طرف بیل بندھے ہوئے تھے۔ اور مچھروں کا گیت ان کے کانوں پر چھاپہ مار رہا تھا۔ عورتیں تھیں' بچے تھے' مرد تھے' سہمے سہمے مرد' ننگے ننگے بچے اور ایک دوسرے میں دھنستی ہوئی عورتیں۔ آنچل سے آدھا منہ چھپائے' اور مرد جن کے دانت نکلے ہوئے تھے' ان کی پیشانیاں سکڑی ہوئی تھیں۔۔۔ وہ سب کے سب نیم برہنہ تھے۔

"سرکار میرے لکھنوا کو اب کے بیاہ رہے ہیں؟" ایک بوڑھے کہار نے کہا۔ مہندر وہیں پر سے گزر رہا تھا۔

"لکھنا ہی پر کیا ہے' میرا سکرا بھی تو سرکار ہی کا کیا ہو گا۔ بیاہ کا روپیہ مل چکا ہے۔"

"ہوں۔۔۔" گدھوں نے سر ہلایا جیسے نئی لاش پر جشن ہو رہا ہے۔

"ہوں۔۔۔۔"

مہندر کو معلوم ہوا کہ روشنیاں گھٹاٹوپ اندھیرے میں کود پڑی ہیں۔ اور وہ سوچنے لگا۔ ان لوگوں کی زندگی بھی کیا زندگی ہے۔ بارہ سال تیرہ سال کا لڑکا' چالیس پچاس روپے کے خرچ پر بیاہ دیا جاتا ہے اور پھر جنم جنم کے لئے وہ کمیا ہو جاتا ہے۔ زندگی بھر کا غلام۔۔۔ گالیاں' تھپڑ' تھوک۔۔۔۔ لرزش' بھوک اور بیماری' جنم جنم کے لئے؟۔۔۔۔

اس کا جی چاہا کہ ابھی صبح ہو جائے اور وہ گاؤں چھوڑ دے۔ اس کا باپ کسانوں کے خون پر جی رہا تھا۔ مہندر کو محسوس ہوا کہ اس کی رگوں میں وہی خون دوڑ رہا تھا۔۔۔۔ ایک بار رفیق نے اس سے کہا تھا۔ "تمہارے بزرگ لوگ ہمیشہ انقلاب دشمنی کا کام کرتے ہیں۔" اور اس کا اعتماد خود اپنی ذات پر سے اٹھنے لگا۔

صبح ہو رہی تھی۔ اس کی ماں رو رہی تھی۔ اس کا باپ مسکرا رہا تھا۔ اس کے دانت جھلک رہے تھے۔ اور مونچھیں ڈوبتے ہوئے دل کی طرح پھڑک رہی تھیں۔ جب اس نے موٹر سے جھانک کر دیکھا تو اس کا گاؤں گرد و غبار میں چھپ گیا تھا۔ اس کا دل ہلکا ہونے لگا۔ بھاگتے ہوئے درخت' گھومتے ہوئے دھان کے کھیت' کھجور' تاڑ' بڑ...... سب ناچتے ہوئے معلوم ہوئے۔ ماضی کی طرف الٹے پاؤں لوٹتے ہوئے' اندھا دھند' الٹے پاؤں' افتاں و خیزاں۔ اور ایک بے ارادہ مسکراہٹ اس کے لبوں کے نیچے گدگدی کرنے لگی اور اس کی آنکھوں کا حلقہ ٹھنڈی سانس لیتا ہوا معلوم ہونے لگا۔

چرواہے مویشیوں کو ہانکتے ہوئے تالاب کی طرف جا رہے تھے اور اس کی لاری اسٹیشن کی طرف بھاگ رہی تھی' اپنے پیچھے درختوں' مویشیوں' کسانوں اور دیہاتی گیتوں کا دھواں چھوڑتی ہوئی۔۔۔ گرد و غبار کا ایک خیمہ سا اٹھاتی ہوئی۔

کلکتہ کتنا وسیع تھا۔ کتنا گہرا' ناچتا ہوا' دوڑتا ہوا کلکتہ۔ اس میں چیخوں کا ہجوم تھا۔ خاموشیوں کا ذخیرہ تھا۔ اس میں بے باکی بھی تھی اور گھٹن بھی۔ عجیب شہر تھا۔ اجنبیت کا سلسلہ صرف ایک ہفتہ تک رہا۔ کلکتہ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اجنبیوں سے بہت جلد گھل مل جاتا ہے۔ ہر نیا آدمی ایک ہیجانی اجنبیت ضرور محسوس کرتا ہے' لیکن بہت جلد اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ

ایک عظیم اور وسیع شہر کا جگر گوشہ ہے۔ نئے لوگ اسے جانے پہچانے معلوم ہونے لگے۔ نئی باتیں اسے اچھی معلوم ہونے لگیں۔ ٹرام' بسیں' ہری ہری' گھن گرج' مخملیں کاریں' اور ان کی دوڑ بھاگ۔۔۔۔ اور تب اسے اپنی زندگی میں تحریک کا احساس ہوا۔ ہر طرف عمل' سرگرمی' بے چینی' تلاش' کچھ پانے' کچھ جیتنے' کچھ جھپٹنے کا سماں دکھائی دیتا۔ اس کا کمرہ ایک گلی میں تھا۔ اسی کمرے میں بیٹھ کر اس نے ایک خط لکھا۔ رفیق کو زندگی میں پہلی بار خط لکھنے میں اسے بہت مزہ آیا۔ اس نے بہت سی باتیں لکھیں۔ اپنے داخلہ کی باتیں' رفیق کی دی ہوئی کتابوں کی باتیں جن پر ہنسیا اور ہتوڑے کا نشان بنا ہوا تھا' اور جسے دیکھ کر اس کے باپ نے کسانوں کی خدمت میں ایک عدد گالی پیش کی تھی۔ اس نے کلکتہ میں ایک ایسی میٹنگ بھی دیکھی تھی جس میں رفیق کے رفیقوں کو دیکھ کر اس کا دل خود بخود جذبات سے بھر گیا تھا۔ منومنٹ کا میدان۔۔۔ سر جوڑے ہوئے' نعرہ زن' تالیاں پیٹتے ہوئے مزدور۔ اس کے گاؤں کے کسانوں میں یہ بات کہاں تھی۔ اس نے آخر میں لکھا تھا۔

"تم نے مجھے اپنے بزرگ کی غداریوں سے ایسا چوکنا کر دیا ہے کہ میں اپنے آپ سے جدوجہد کرتا رہتا ہوں۔ میرے دماغ میں جو الجھنیں ہیں ان کی وجہ یہی ہے۔ میری گردن میں ایک روایتی زنجیر ہے جس کا ایک سرا میرے پتا کے ہاتھ میں ہے۔"

رفیق نے اسے تسکین دیتے ہوئے لکھا تھا۔۔۔۔ "ٹھیک کہتے ہو۔ تم اپنی زنجیر توڑ دو۔ اپنے شعور کا سہارا لو۔ تمہارے پتا کی گردن میں جو زنجیر ہے' وہ اس سماج کے ساتھ ہی ختم ہو گی۔ لیکن تم اپنی جاگرتی سے زندگی کو سمجھ کر اس زنجیر کو توڑ سکتے ہو' تم کلکتہ میں ہو۔ تم چاہو تو بہت کچھ سیکھ سکتے ہو کلکتہ سے۔"

زنجیر ٹوٹ سکتی ہے یا نہیں۔ وہ اس وقت فیصلہ نہ کر سکا۔ البتہ گردن کو سہلانے میں اسے ایک خاص سکون ملا۔ جیسے زنجیر اس کی گردن سے اتر گئی ہو۔ پھر اس کے بعد رفیق کا کوئی خط نہیں آیا۔ مہندر بھی کلکتہ میں کھو گیا۔ ہندو مسلم فساد پھر شدت اختیار کر گیا تھا۔ روز کچھ نہ کچھ واقعات ہو جاتے تھے۔ خود اس کی گلی کے پاس گڑگڑانے' چھرا بھونکنے' قہقہہ لگانے اور خون کی پھلجھڑی چھوڑنے کا ڈرامہ کھیلا گیا تھا۔ اس کا دم بعض وقت گھٹنے لگتا تھا۔

شام کا وقت تھا۔ وہ چائے میں پاؤ روٹی کا ٹکڑا بھگو کر کھا رہا تھا۔ ایک چیخ اس کے کانوں میں

گونجی، اتنی ہولناک چیخ اس نے کبھی نہیں سنی تھی۔ اس کے ہاتھ سے پاؤروٹی کا ٹکڑا گر گیا۔ اور وہ جھپٹ کر باہر نکلا۔ گلی کے اختتام پر لوگوں نے ایک لاش اچھال دی اور وہ لاش خون میں لتھڑی اوپر نیچے ہوئی اور نالے میں غرق ہوگئی۔ ایک بھیانک قہقہہ چمگادڑ کی طرح پھنکارتا ہوا اڑا اور دھندلائی ہوئی فضا میں تیر گیا۔ تیزاب کی پھواریں برساتا ہوا۔

وہ اس روز رات بھر رفیق کے بارے میں سوچتا رہا۔ رفیق بہار میں تھا۔ جہاں خود اس کے باپ جیسے لوگ فرقہ پرستی پھیلا رہے تھے۔ وہ جانتا تھا وہ بھی اس خون آشام سازش میں کسانوں کی تحریک کو ڈبو دینا چاہتے تھے۔ اور اس کا دل کبھی کبھی دھک سے ہو جاتا۔ کہیں رفیق۔۔۔؟ اور اسے معلوم ہوا کہ ایک اور لاش فضا میں بلند ہوئی اور نالے میں چھلانگ گئی۔ اور ایک چمگادڑ اڑا اور اس کے کانوں کو چاٹتا ہوا نکل گیا اور اس کے باپ کی مونچھیں، چمکتے ہوئے دانت گہری اور گہری ہوتی ہوئی آنکھیں اس کی آنکھوں میں ناچ گئیں۔ ناچتے ناچتے ٹھہر گئیں۔۔۔ برف کے ٹکڑوں کی طرح۔۔۔ ٹھنڈی اور نرم۔

گلی کے اختتام پر ایک درزی کی دکان تھی۔ دو تین چائے کی دکانیں تھیں۔ مٹھائی کی، پھلوں کی، صابن کی اور پاؤروٹی والی دکان تو اس کے کمرے کے سامنے ہی تھی اور وہیں پر ایک نئی چائے کی دکان تھی جس میں ایک ادھیڑ عمر کی عورت بیٹھا کرتی تھی۔ اس کی چائے وہیں سے آیا کرتی۔

کلکتہ میں چائے زندگی کا جزو بن جاتی ہے۔ مہندر بھی چائے کا بری طرح عادی ہو گیا تھا۔ دن بھر میں کئی کئی پیالیاں چائے پیتا اور پھر بھی اس کی تسکین نہ ہوتی۔ کالج جاتا تو بہت بچ کر جاتا۔ اس لئے کہ تیزاب، بم اور چھرے کا خطرہ تو ہر وقت سایہ بنا رہتا تھا۔

جس مکان کے ایک کمرے میں وہ رہتا تھا، اسی میں بہت سے کمرے کرائے پر لگے ہوئے تھے۔ ایک اندر کا اندھیرا سا حصہ تھا جس میں ایک کرانی بابو رہتے تھے، ان کا ایک جوان بھائی تھا۔ اس کا نام سنیل تھا۔ وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ پتلا۔ حد درجہ گھلا ہوا انسان۔ اس کی مونچھ پنسل کی لکیر معلوم ہوتی تھی اور اس کا سانولا رنگ زرد ہوتا ہوا دکھائی دیتا تھا۔

باہر کے کمرے والے جتنے کرایہ دار تھے، ان کے لئے مکان کے پچھواڑے میں ایک پانی کا نل تھا۔ وہیں پر ایک پاخانہ تھا جہاں صبح کے وقت راشن کی دکان کا منظر نظر آتا تھا۔ لوگ اپنا برتن،

چائے کی کیتلی، لنگی، دھوتی، جنگھی وغیرہ بھی وہیں دھوتے تھے اور ایک بڑے نالے میں سڑا ہوا گدلا پانی بہتا رہتا اور اس میں پتے، پیاز، آم، نارنگی اور دوسرے پھلوں کے چھلکے ٹرام کی طرح رینگتے رہتے۔ اور بہتا ہوا صابن کا پھین ان رکاوٹوں میں پھنس کر پہاڑ کی طرح آہستہ آہستہ اٹھنے لگتا۔۔۔۔ جیسے دودھ کی دیگچی میں ابال آ گیا ہو۔

مہندر وہاں پر نہانے میں بڑی شرم اور جھجک محسوس کرتا تھا۔ اس لئے کہ پس چلمن بہت سی آنکھیں انگاروں کی طرح چمکتی نظر آتی تھیں۔ اور جو کبھی کبھی ایک قہقہے میں ابل کر اسے چکرا دیتی تھیں۔ اس کے ہاتھ سے صابن کی ٹکیہ پھسل جاتی اور دہرا قہقہہ اسے چاروں طرف سے گھیر لیتا۔

ایک روز جب وہ نہانے کے لئے گیا تو اس نے اسی سرمئی رنگ کے سنیل کو دیکھا جو اسی مکان میں رہتا تھا۔ وہ ایک تولیہ لپیٹے نہا رہا تھا۔ پس چلمن چند انگارے سلگ رہے تھے۔

"آپ کس کالج میں پڑھتے ہیں۔۔۔۔" نہاتے ہوئے اس نے بات شروع کی۔ اور پھر دونوں ایک دوسرے کے دوست بن گئے۔ اس کی پسلیاں بھاگتے ہوئے پانی میں کانپ رہی تھیں، پتنگ کے کانپ کی طرح۔

چھٹی کے وقت دونوں ایک دوسرے سے باتیں کیا کرتے۔ وہ مہندر کے کمرے میں چلا آتا۔ سامنے والی دکان سے چائے آتی۔ سنیل کے گالوں کی ہڈیاں نکلی پڑتی تھیں اور ایسا معلوم ہوتا کہ وہ کچھ نہ کچھ چبا ضرور رہا ہے۔

وہ چائے میں لیموں ڈال کر پیتا تھا۔ جب مہندر کو زکام ہوا تو اس نے یہی علاج اسے بھی بتایا۔

"اس سے سردی بھاگ جاتی ہے۔۔۔۔ دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے۔۔۔۔"

"اچھا۔۔۔" اور اس نے اپنے زکام کو دو سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھگانا شروع کر دیا۔ دونوں میں بات چیت کے دوران میں شاعری آتی، ادب آتا، ہندو مسلم فساد اور آخر میں تو زیادہ تر ماؤنٹ بیٹن پر بحث ہونے لگی، انگریزوں کی سازش پر، قومی رہبروں کی غداری پر۔۔۔۔ اور مہندر سنیل میں انتہائی دلچسپی لینے لگا۔ اسے معلوم ہوتا کہ سنیل رفیق کا دوسرا ایڈیشن ہے۔۔۔۔

سنیل ٹھہر ٹھہر کر اپنی رائے دیا کرتا۔ مہندر کو محسوس ہوتا کہ کوئی بہت ہی وزنی انسان اس کے سامنے بات چیت کر رہا ہے۔ کبھی کبھی وہ بات چیت کے دوران میں بالکل رازدارانہ لہجہ اختیار

کر لیتا۔ کالج اور اسکول کے لڑکوں نے فیصلہ کیا تھا کہ کلکتہ میں امن کو واپس لائیں گے۔ ان کا جلوس بھی نکلنے لگا تھا۔ مہندر ان جلوسوں میں نہیں جاتا تھا' لیکن سنیل ان جلوسوں میں ضرور جاتا اور ان کے کامیاب اثر کا قصہ روز آ کر سناتا۔ لیکن جب گلی کے اختتام پر کوئی چیخ سنائی دیتی تو معلوم ہوتا کہ سنیل نے جو کچھ کہا تھا محض جھوٹ تھا۔

پھر آزادی آئی۔۔۔۔ کلکتہ سج کر دولھا بن گیا۔۔۔۔ اور اتحاد کا وہ نظارہ سامنے آیا کہ مہندر کا انگ انگ ناچ اٹھا۔ کالج اور اسکول کے لڑکوں کی قربانیاں اور محنت ٹھکانے لگی۔

کئی بار مہندر گھر گیا۔ اور واپس آیا۔ آزادی کے بعد گاندھی جی کے قتل نے ایک تڑپ پیدا کر دی تھی۔ سنیل کہتا "یہ نفرت' یہ بے ایمانی اسی وقت ختم ہو گی جب یہاں لٹیروں کا راج ختم ہو۔۔۔ دو چور آپس میں مال تقسیم کریں اور اسے آزادی کا نام دے دو۔۔۔ یہ بھی خوب رہا۔۔۔" اس کی آنکھیں جل اٹھتیں۔

"لٹیروں کا راج۔۔۔" مہندر دانتوں میں پنسل دباتے ہوئے پوچھتا۔
"ہاں۔۔۔" وہ یقین کے ساتھ فیصلہ کن انداز میں کہتا۔
"لیکن یہ راج کیسے ختم ہو گا۔۔۔؟"
"ہو جائے گا۔۔۔ جنتا کی بھوک اپنا راستہ جانتی ہے۔" سنیل کی آنکھیں سلگ اٹھتیں اور اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آتیں۔ جب کلکتہ میں کالا قانون لاگو ہوا تو مہندر نے سنیل سے پوچھا "ایسا کیوں ہوا۔۔۔ کانگریسی سرکار جنتا کے اندولن سے ڈرتی کیوں ہے؟۔۔۔" اسے رفیق کا خیال آ گیا جو خود اس کے گاؤں میں اس کے باپ کے خلاف کسانوں میں کام کرتے ہوئے گرفتار ہو کر جیل میں سڑ رہا تھا۔
"مان لو تم چور ہو' اندھیری رات ہے' اور تم ایک مکان میں چوری کے لئے گھس گئے ہو۔۔۔ کیا تم چاہو گے کہ مکان والے جاگ اٹھیں۔۔۔ اور اگر وہ جاگ جائیں تو کیا تم اپنے چھرے سے۔۔۔ ان کو۔۔۔" وہ اتنا کہہ کر مسکرایا اور چپ ہو گیا۔

مہندر اس کا منھ تکتا رہا۔ پھر اس نے چائے منگوائی۔ اس میں لیموں کا عرق نچوڑا اور پینے لگا۔ اس کے بعد کلکتہ میں مہندر کا ایسا جی لگا' ایسا جی لگا کہ پھر اپنے گاؤں واپس نہ گیا۔ اپنے باپ

سے بہانہ کرتا رہا اور چھٹیاں گزرتی رہیں۔ اور اس کے باپ کی ساری چیخ پکار مفت میں ضائع ہوتی رہی۔ کسی رشتہ دار نے کلکتہ سے واپس جاکر شکایت کر دی تھی کہ مہندر غنڈوں اور لوفروں کی صحبت میں رہتا ہے۔۔۔۔

گرمی کی شام تھی۔۔۔۔

کالج سے آکر اس نے فوراً دم لیا تھا۔ سامنے والے چھجے پر ایک نازک جوان لڑکی اپنے سیاہ پھیلے ہوئے بال سکھا رہی تھی۔ سفید ساڑی اور پیازی بلاؤز میں اس کا بدن ایک ترشے ہوئے مرمریں مجسمے کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ مہندر اسے غور سے دیکھ رہا تھا۔ بنگالیوں کے بال کس قدر سیاہ اور گھنے ہوتے ہیں۔ وہ اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ سنیل اس کے کمرے میں داخل ہوا۔

"مہندر کہیں باہر نہیں چلو گے۔۔۔۔"

مہندر تیار ہو گیا۔ دونوں ٹرام میں بیٹھ کر چورنگی پہنچے۔ چورنگی میں بھیڑ تھی۔ دھرم تلہ سے میٹرو کی طرف جانے والا موڑ تو اور بھی کھچا کھچ تھا۔ میوہ کی دکانیں جھنجھنا رہی تھیں' پینٹ پہنے' دھوتی پہنے' پاجامہ پہنے۔ لوگ پان چباتے' رنگ تھوکتے' سگریٹ پھونکتے' سگار چوستے ہوئے لوگ ریل پیل ہو رہے تھے۔ ٹرام کی پٹریاں چمک رہی تھیں' اور سورج کی روشنی آہستہ آہستہ زرد ہوتی جا رہی تھی۔

اس بھیڑ میں نرم و نازک' پگھلتی ہوئی' ابھرتی ہوئی' گنگناتی ہوئی' شرماتی ہوئی' دعوتیں دیتی ہوئی عورتیں۔ ہر طرح کی عورتیں موجود تھیں۔۔۔۔ اور جب وہ چورنگی کی بھیڑ میں داخل ہوتی تھیں تو ان کا جسم بہت سے انجانے لوگوں کو چھوتا ہوا' ان میں آگ کی لہر دوڑاتا ہوا' ان کی سہمی ہوئی محرومیوں پر پھبتی کستا ہوا آگے بڑھ جاتا تھا۔ اور بہت سی ہیجانی آنکھیں مسکرانے کے باوجود اپنے اندر لپکتی ہوئی ناآسودگی کی لو چھپانے میں ناکام معلوم ہوتی تھیں۔

شام ہو گئی۔ میدان کی طرف سے فٹ بال کے کھلاڑی رنگ برنگی جرسیوں میں' چیونگ گم چوستے' قہقہہ لگاتے اور اپنے بالوں کو جھٹکتے پسینہ میں نہائے چلے آرہے تھے۔

روشنیاں جگمگا اٹھیں۔ سڑکیں اندھیرے میں ڈوب گئیں' لیکن ان پر مرکری سے نکلتی ہوئی چاندنی ایک خوابناک حسن کا عکس بننے لگی تھی۔ ہزاروں بلب اپنی سنہری آنکھیں لئے چھپے دبکے نظر آتے' سنیل نے مہندر کو فریسکو میں بٹھایا۔ چائے پی اور پھر میدان کی طرف نکل

آیا۔ وہ لکڑی کی فنیسنگ پر بیٹھ گیا۔ موٹروں کا تار ٹوٹتا ہی نہ تھا۔ اندھیرے میں بھک بھک جلتی ہوئی موٹروں کی آنکھیں جگنوؤں کی طرح ایک بہاؤ میں بندھی چلی جارہی تھیں۔ قریب آتی ہوئی' دور جاتی ہوئی۔ کافی دیر تک بیٹھنے کے بعد وہ دونوں وہاں سے اٹھے۔ دونوں چپ تھے۔ جدھر سنیل جارہا تھا مہندرا اسی طرف چل رہا تھا۔

چینی پاڑا میں ایک گلی سے ہوتا ہوا سنیل مہندر کے ساتھ ایک بہت ہی ذلیل ہوٹل میں تیزی سے داخل ہوا۔ چائے منگائی اور دونوں پینے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک چھوکرا کونے سے اٹھا۔ اس کے ہاتھ میں پیاز اور چھری تھی۔ وہ اب تک ایک بوڑھے مزدور سے بات چیت کر رہا تھا۔ اور پیاز تراش رہا تھا۔

وہ سنیل کے پاس آیا۔ اس نے چھوٹا سا کاغذ کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں دے دیا۔۔۔ اور خود سیٹی بجاتا ہوا' کنکھی مارتا ہوا اپنی جگہ پر جاکر بیٹھ گیا۔

"کیوں بے تیری ماں مر ہی گئی آخر۔۔۔۔؟"

"مرنہیں جاتی تو کیا کرتی۔۔۔۔ دوا ملی نہیں' دوا تو دوا' کھانا بھی نہیں ملا۔۔۔۔" دوسرے جوان سے میلے کچیلے مزدور نے کہا۔۔۔۔ "اور کھانا کہاں سے ملتا مجھے کام دیتا ہی نہیں کوئی۔ مرگئی ٹھیک ہی ہوا۔۔۔"

رات گئے سنیل اور مہندرا اپنے کمرے میں پہنچے۔ تھوڑی دیر کے بعد سنیل اپنے بغل میں کاغذ کا پلندہ دبائے مہندر کے کمرے میں داخل ہوا۔ کاغذ کے ایک پڑے میں آٹا تھا۔

"اسٹو جلاؤ۔۔۔۔" سنیل نے کہا۔

"کتنی چائے پیوگے آج۔۔۔۔؟"

"چائے'۔۔۔۔ میں تمھیں پی جاؤں گا۔۔۔۔ سمجھے' چلو جلدی کرو۔۔۔۔"

اسٹو جل گیا۔ سرخ' زرد' سفید آگ کی زبانیں پھول کی پنکھڑیوں کی طرح تڑپنے لگیں۔ سنیل نے چھوٹے سے پیالے میں آٹا ڈالا' اسے پانی میں گھولا اور اسٹو پر رکھ دیا۔

"دیکھا میں کتنی شاندار چائے تیار کررہا ہوں۔"

مہندر چپ چاپ اسے گھورتا رہا۔ اسٹو گنگنا رہا تھا۔ اور سامنے والے اونچے مکان میں روشنی

جل رہی تھی۔ دریچے کا ریشمی پردہ آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ اور جب پردہ اڑتا تو اس کے پیچھے ایک خوبصورت سامرمریں مجسمہ کالی سی میز پر کتاب کے سامنے ساکت دکھائی پڑتا۔

لئی بن کر تیار ہو گئی۔ اس میں سے بلبلا اٹھ رہا تھا۔ بھاپ سے بلبلا ٹوٹ جاتا۔۔۔!

سنیل سگریٹ کا آخری کش لے کر اٹھا۔ کاغذ کا پلندہ اٹھایا۔ لئی کا پیالہ کاغذ میں لپیٹ کر مہندر سے پکڑوایا اور اسے لے کر باہر نکل گیا۔ سب سے پہلے گلی کے اختتام پر پان کی دکان کے پاس رکا' اپنی جانگھ پر رکھ کر اس نے جلدی جلدی کاغذ پر لئی لگائی۔ اور پھر اسے دیوار پر چسپاں کر دیا۔ مہندر سانس روکے چپ چاپ دیکھتا رہا۔

اسی طرح گھوم گھوم کر ایک گھنٹے تک اس نے کئی جگہ کاغذ دیواروں پر چسپاں کیا اور پھر کمرے کی طرف لوٹ آیا۔

مہندر کے لئے یہ بالکل نیا تجربہ تھا۔ اسے ایک نامعلوم خطرے کا احساس ضرور ہو رہا تھا۔ اس کی رگیں سن سن کر رہی تھیں۔ لیکن سنیل اسے بہت قریب معلوم ہو رہا تھا۔ سنیل نے اس پر کتنا بھروسہ کیا تھا۔ اسے ایک قوت کا احساس ہونے لگا۔

سنیل واپس لوٹا۔ مہندر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سنیل پھر اس کے کمرے میں واپس آیا۔ وہ ایک چھوٹے سے کاغذ پر مہین مہین کچھ لکھتا رہا اور مہندر سویا بنا رہا۔ جب وہ آنکھیں کھولتا اور باہر کی طرف دیکھتا تو سامنے والے مکان میں وہی دریچہ ایک زرنگار سنہرے پردے کی طرح اس کی آنکھوں میں چمک جاتا۔ جس کے پیچھے ایک خوابناک حسن ہر وقت نیند میں نہایا ہوا نظر آتا۔ خود اس کے کمرے میں سنیل کسی گہرے خیال میں کھویا ہوا قلم چلا رہا تھا' جیسے زردوزی کا کام کر رہا ہو۔ اس کی بھوئیں سکڑ گئی تھیں۔ ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ اور کنپٹیوں کی ہڈیاں ابھر گئی تھیں۔ اور وہ ہمیشہ کی طرح منھ میں کچھ چباتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

صبح ہونے سے دو گھنٹہ قبل سنیل کرسی پر ہی سو گیا۔ اس کا سر ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ مہندر کو رات بھر نیند نہ آئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ دیوار پر چپکے ہوئے کاغذ اس کا نام لے کر پکار رہے تھے اور وہ پکار اس کی آنکھوں' اس کے حلق' اس کے پھیپھڑوں میں گھسی جا رہی تھی۔

صبح ہوتے ہی وہ اٹھا۔ سنیل اسی طرح سویا ہوا تھا۔ وہ باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ سامنے چائے کی دکان میں موٹے موٹے گوشت والی ادھیڑ عمر عورت آپ ہی آپ کچھ بول رہی تھی۔ چولھے سے دھواں اٹھ رہا تھا اور اس کے پیچھے دیوار پر ایک بوڑھے کی رنگین تصویر دھندلی نظر آ رہی تھی۔۔۔۔ ''چائے پیو' بہت دن جیو۔۔۔۔''

سامنے مکان کے چھجے میں دھوپ بھیگے ہوئے پیٹی کوٹ' سیاہ بلاؤز' نیلی اور انگوری ساڑیوں سے کھیل رہی تھی۔ اس کا سر بھاری بھاری لگ رہا تھا۔ وہ سڑک پر نکل گیا۔ پاؤ روٹی کی دکان پر اس نے روٹی خریدی' مکھن خریدا۔ پیسہ دینے میں اس نے جان بوجھ کر دیر کی۔

کاغذ دیوار سے چمٹا ہوا تھا جیسے ماں کی چھاتی سے دودھ پیتا بچہ۔

''بھوک لگی ہے۔۔۔۔ روٹی دو۔۔۔۔''
جیل میں بند کر دو۔
''گرانی ہے۔۔۔۔ مہنگائی بھتہ دو۔۔۔۔''
گولی مار دو۔
''ننگے ہیں۔۔۔۔ کپڑا دو۔۔۔۔''
لاٹھی چارج۔۔۔۔
''جنتا کی سرکار۔۔۔۔ زندہ باد''۔
چلو مزے اڑاؤ۔

راہ گیر رکتے' پوسٹر کو پڑھتے اور آگے بڑھ جاتے' ان میں سے کچھ ہنستے' کچھ خاموش سر ہلاتے ہوئے آگے بڑھ جاتے' کچھ زور سے قہقہہ لگاتے اور دہراتے۔۔۔۔ ''اونہہ۔ جنتا سرکار۔۔۔۔ زندہ باد۔ ہاہاہا۔۔۔۔ مزا اڑاؤ بھئی مزا اڑاؤ۔۔۔۔''
''یہ سرکار۔۔۔۔ گولی مارو۔۔۔۔'' دوسرا کہتا اور اس کی آنکھیں غصہ سے لال ہو جاتیں۔
مہندر کا سر جل اٹھا۔ نیند کا سارا اثر دور ہو گیا۔
''جنتا کی سرکار۔۔۔۔ میرا بیٹا جیل میں سڑ رہا ہے۔۔۔۔''
''قصور۔۔۔۔ اپرادھ۔۔۔۔؟''

"ہڑتال کی تھی۔۔۔۔۔پیٹ نہیں بھرتا تھا۔۔۔۔اور کیا۔۔۔۔"

"میں نوکری سے نکال دیا گیا۔۔۔۔کیوں پوچھو۔۔۔۔پوچھو۔۔۔۔"

"میں نہیں پوچھوں گا۔۔۔۔" اس کے ساتھی نے کہا۔

"ریلوے میں مجور زیادہ ہوگئے ہیں۔۔۔۔میں فالتو تھا' نکال دیا گیا اور کیا۔۔۔۔" اور وہ اپنی داڑھی کو نوچنے لگا جیسے وہ فالتو باتوں کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔

اس کی مونچھیں اس کے باپ سے ملتی جلتی تھیں۔ لیکن اس کی آنکھوں میں وہ چمک نہیں تھی اور بدن پر برف پوش سفید کھدر کا کرتا نہیں تھا۔ البتہ مسکراہٹ زیادہ شدید اور معنی خیز تھی' جھپٹتی ہوئی عقاب نما۔

اور اس کے سر کا درد ختم ہوگیا۔ آنکھوں کی جلن غائب ہوگئی اور وہ اپنے کمرے میں چلا آیا۔ سنیل کو اس نے جگایا' اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور اس کے ماتھے پر پنسل کے دباؤ سے نشان پڑ گیا تھا۔

دونوں نے ساتھ ہی ناشتہ کیا۔ سنیل نے مہندر سے ایسی بہت سی باتیں کہیں جن کی وجہ سے رفیق کی یاد اس کے دماغ میں تازہ ہوگئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پیار سے دیکھا۔۔۔۔!

جاڑا ہلکا ہلکا پڑ رہا تھا۔ اور مہندر روز رات کو کاغذ اور لئی لے کر اکیلا ہی پوسٹر بنایا کرتا تھا۔ پان والے' کھچڑی فروش' سوڈا واٹر والے' دہی بڑے اور کابلی چنے والے' بگھی اور رکشے والے' سب سے اس کی جان پہچان ہوگئی تھی' بعض مرتبہ تو ان میں سے بعض اس کی مدد بھی کرتے اور وہ اپنی مسکراہٹ سے ان کا شکریہ ادا کرتا۔

جب دن کے وقت وہ باہر نکلتا اور لوگوں کو' مزدوروں کو' ٹرام میں کام کرنے والے' بجلی کے کارخانے میں کام کرنے والے مزدوروں کو شہد کی مکھیوں کی طرح اپنے سامنے لگے ہوئے پوسٹروں کو پڑھتا ہوا دیکھتا تو اس کا سینہ اچھلنے لگتا' حلق میں گرمی سی محسوس ہوتی اور آنکھیں جھلملا جاتیں۔

مہندر کے بال اکثر الجھے ہی رہنے لگے۔ وہ ہر وقت کچھ سوچتا رہتا' لکھتا رہتا' بحث کرتا رہتا'

اسے کلکتہ میں ایک نئی زندگی کی آہٹ مل رہی تھی۔ اس کا اعتماد بہت بڑھ گیا تھا۔ اس کی باتوں' اس کی مسکراہٹوں' اس کی آنکھوں کی تابانی' ہر چیز سے ایک خود اعتمادی جھلکتی تھی۔

وہ کام کرتے کرتے تھک جاتا۔ کالے قانون کا بھوت اس کو منہ چڑاتا۔ لیکن وہ اپنا کام کرتا جاتا۔ اسے بہت سے ساتھیوں سے ملنا پڑتا۔ پوسٹر لگانا پڑتا۔ اخبار پر پابندیاں لگتیں۔ اور وہ سب چیزیں پوسٹر میں لکھ کر دیواروں پر چپکا دیتا۔ وہ اکیلا نہیں تھا۔ اس کے سیکڑوں ساتھی اسی طرح کام کر رہے تھے۔

اس کے پیچھے پولس والوں کے بوٹ کی آہٹ ہوتی' رابڑی والے' سگریٹ و پان والے' ٹرام والے۔ سب اس کے ارد گرد ایک گھیرا سا ڈال لیتے۔ کالج کے لڑکے اس کے کان میں کچھ کہتے اور وہ مسکرا پڑتا۔ اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے ہنس پڑتے۔

اس کے باپ نے روپیہ بھیجنا بند کر دیا۔ اس نے ٹیوشن کر لیا اور اپنا کام کرتا رہا۔ اب اسے کوئی طاقت پکڑ نہیں سکتی تھی۔ مزدوروں پر شہر میں لاٹھی برسی تھی۔ پولس والوں کا چہرہ اس کی آنکھوں میں ناچ رہا تھا۔ اسے ہلکا ہلکا بخار تھا۔ اس کا چہرہ بالکل زرد پڑ گیا تھا۔ بادامی! اس کی آنکھوں کا پھیلاؤ کم ہوتا جا رہا تھا۔ اس نے کمرہ کھولا۔ اس میں اسے رفیق کا خط ملا۔ وہ مظفر پور جیل میں تھا۔ کارڈ پر لکھا ہوا تھا۔ "پاسڈ۔۔۔۔۔ جیل سپرنٹنڈنٹ۔" رفیق کے اس خط نے اس میں ایک نئی روح پھونک دی۔ وہ ناچ اٹھا۔ اس کے جسم میں گرم گرم خون کا دوران بہت تیز ہو گیا تھا۔

میں نے آہستہ سے اس کے کان میں کہا۔ "آج تمہیں بہت سا کام کرنا ہے۔ کل انڈونیشیا ڈے ہے۔ ہمیں پوسٹر لکھنا ہے۔ سرکار حملہ کرے گی' کون ٹھکانہ تم مارے جاؤ۔ تمہیں اپنا کام ختم کر لینا ہے۔" اس نے چائے منگائی۔ سنیل ٹرام والوں کی ہڑتال کے سلسلے میں گرفتار ہو چکا تھا۔ رفیق اور سنیل ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑے اس کی زندگی میں نشان راہ کی طرح چمک رہے تھے۔

اس کے کمرے کا بلب فیوز ہو گیا تھا۔ اس لئے اس نے سامنے کی دکان سے ایک موم بتی لی اور کام کرنے لگا۔ پوسٹر لکھنے کی خاص مہارت اسے ہو گئی تھی۔ سامنے والی اونچی عمارت میں دریچہ ایک سنہرے ورق کی طرح جگمگا رہا تھا۔ ریشمیں پردہ ایک طرف سرک گیا تھا اور اس کے

پیچھے ایک مرمریں مجسمہ اونگھ رہا تھا۔

رات کے سناٹے میں اس نے پوسٹر لکھنا شروع کیا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا اور وہ اس کپکپاہٹ پر فتح پانے کے لئے دانت چبا رہا تھا۔ جب اس نے 'سمیٹری' کے گیٹ پر پوسٹر چپکایا تو دربان نے پوچھا۔ "کون ہے۔۔۔۔؟" مہندر نے کھانس کر اسے خاموش کر دیا۔

جب سب پوسٹر لگ گئے تو اس نے اطمینان کی سانس لی۔ اس کے پیر ٹوٹ کر گرتے ہوئے محسوس ہوئے۔ وہ آہستہ آہستہ اپنے راستہ پر چلا جا رہا تھا۔ ٹرام کی پٹریاں دور چمک رہی تھیں۔ کبھی کبھی ایک کار گزر جاتی۔

اس کے پیچھے بوٹ کی آواز سنائی دی۔ اس کا دل دھک سے ہو گیا۔ اس کے قدم تیز ہونے لگے۔ وہ ایک گلی میں مڑ گیا۔ اور اسے محسوس ہوا کہ بوٹ کی چاپ اس سے قریب ہوتی جا رہی ہے۔ وہ سکتے کے عالم میں کھڑا ہو گیا۔ بوٹ کی آواز کہیں سنائی نہ دی۔ وہ اپنے کمرے میں آکر درخت سے ٹوٹے ہوئے آم کی طرح گر گیا۔ اور دیر تک چمکتی ہوئی زریں۔۔۔ شعلہ فشاں کھڑکی کو گھورتا رہا جس کے پیچھے ایک لچکیلا مرمریں مجسمہ اونگھ رہا تھا۔

تھوڑی دیر کے بعد اسے نیند آگئی۔ کب صبح ہوئی اسے پتہ بھی نہ چلا۔ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ آنکھیں بوجھل ہو گئی تھیں۔ ماتھے پر نیلی رگیں چمک رہی تھیں' کان کی لویں سلگ رہی تھیں۔۔۔۔ تکیہ اس کے سینے پر رکھا ہوا تھا اور سرخ روشنائی دوات سی باہر آکر خون کی طرح زمین پر پھیل گئی تھی۔

بارہ بجے اس کی نیند ٹوٹی۔ اسے معلوم ہوا کہ کوئی پہلوان اس پر سوار ہے۔ دھوپ چمک رہی تھی اور سامنے مکان پر وہی حسین لڑکی آرام کرسی پر لیٹی بال میں تیل سکھا رہی تھی۔ اس کی گود میں اخبار پڑا ہوا تھا اور اس کے پاس ایک کالا سا بنگالی لڑکا نیکر پہنے ہاتھ میں ایک گلاس پانی لئے کھڑا تھا۔ سامنے میز پر آئینہ رکھا ہوا تھا جو اپنا عکس پھول کے گملے کی طرف پھینک رہا تھا۔

اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

رات کی لکھے ہوئے پوسٹر اس کی آنکھوں میں چبھنے لگے۔

"انڈونیشیا زندہ باد۔۔۔۔ انقلاب زندہ باد۔۔۔۔ ۱۴۴ اٹھاؤ۔ کالا قانون مردہ باد۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا' اس کے سوکھے ہوئے ہونٹ تھرتھرا رہے تھے۔ اس نے منھ ہاتھ دھویا۔ دو پیالی چائے پی۔ جیکٹ پہنے' وہ اپنی منزل کی طرف چلا جارہا تھا۔

دور ہی سے اس کو جلوس نظر آیا۔ اس کے پیر کانپ رہے تھے اور گردن کے پاس گرم تیل دوڑتا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔۔۔۔ خوفناک طور پر سرخ' جیسے شرابی کی آنکھیں جو کسی کا خون کر کے آرہا ہو۔

اس کے کانوں میں صرف زندہ باد کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ اس کا دل اچھلنے لگا۔ ہر چیز اسے زندہ باد پکارتی ہوئی معلوم ہوئی۔

جلوس میں کھڑے نوجوان غصے میں تھے۔ ان کی آنکھوں میں ایک آہنی عزم تھا۔ وہ آگے چلا گیا۔ گورکھوں کی رائفلیں چھاتی سے لگی انسانوں کے اس سمندر کی طرف گھور رہی تھیں جو ایک دھماکے کے ساتھ ساری دھرتی پر پھیل جانے کا عزم رکھتا تھا۔ سنگینیں خوف زدہ معلوم ہوتی تھیں۔ گورکھے موت کی بارش کرنے والی مشین کی طرح بے جان کھڑے تھے۔ نعروں کی آواز فضا میں گونج رہی تھی۔

مہندر کے پیروں کی کپکپی اور دماغ کی سنسناہٹ دور ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے ہونٹ دانتوں کے نیچے دب گئے تھے۔ آنکھیں پھیل گئی تھیں جن کی گہرائی سے سرخ لو جھانک رہی تھی۔ تمام چھجوں سے عورتیں' بچے اور مرد جھانک رہے تھے۔ کچھ کالے مزدور بھی جلوس میں سمٹ آئے تھے۔ مہندر کا سر فضا میں اوپر اٹھتا ہوا معلوم ہوا' اور اسے محسوس ہوا کہ ایک سمندر اس کی روح میں جھاگ پھینک رہا ہے۔۔۔۔"

ڈنگ ڈانگ۔۔۔۔ تڑاخ' تڑاخ۔۔۔۔ گرد' دھواں' تڑاخ۔ کچھ لوگ کنارے ہو گئے' کوٹھوں سے چیخیں نکل پڑیں' بچے رونے لگے۔ برقی چوٹ سی لگی' اور پھر جلوس سمٹ گیا' آگے بڑھنے لگا۔ مہندر نے ایک گرتے ہوئے ساتھی کا جھنڈا پکڑ لیا۔

ڈنگ ڈانگ۔۔۔۔ تڑاخ' تڑاخ۔۔۔۔

ان لوگوں کو کچل دو۔۔۔۔ یہ غنڈے ہیں' دیش دروہی ہیں۔ دیش بھگتو! انہیں کچل دو' روند ڈالو۔ ستیہ اور اہنسا کی گولیوں سے انہیں مار ڈالو۔ چیخیں' آوازیں' آنسو۔۔۔۔ دوڑو۔۔۔۔ بھاگو بھاگو۔۔۔۔ انسان مر رہے ہیں' لڑکے مر رہے ہیں۔۔۔۔ جوان مر رہے ہیں' پھول مر رہے ہیں' کلیاں مر رہی ہیں۔۔۔۔ دوڑو' بھاگو' دوڑو۔۔۔۔ گولیاں چھوٹ رہی ہیں' گوشت ہے اور چیل ہے' گدھ' کتے۔۔۔۔ ہڈیاں ہیں۔۔۔۔

ڈنگ ڈانگ۔۔۔۔ تڑاخ' تڑاخ۔۔۔۔

طوفان بھپر رہا ہے۔

''زندہ باد۔۔۔۔''

یہ کیسا طوفان ہے۔ گورکھے آنکھیں بند کئے ہوئے ہیں' ان کی رائفلیں بھونک رہی ہیں۔۔۔۔ بھاگو' بھاگو۔۔۔۔ دوڑو' دوڑو' سنگینیں چھین لو' بندوقیں چھین لو۔۔۔۔ یہ غدار ہیں۔۔۔۔ انہیں ستیہ اور اہنسا کی گولیوں سے چھلنی کر دو۔۔۔۔ انسانوں کے اس طوفان کو دبا دو۔۔۔۔ یہ آزاد دیش ہے'۔۔۔۔ مرنے والے مکار ہیں' چور ہیں۔۔۔۔ کون کہتا ہے وہ انسان کے بیٹے ہیں'۔۔۔۔ کون کہتا ہے وہ پھول ہیں۔۔۔۔ ان کو گرد و غبار اور خون میں پڑا رہنے دو۔۔۔۔

تڑاخ' تڑاخ۔۔۔۔ ڈنگ ڈانگ۔۔۔۔!

ہم ایک طوفان ہیں' ہم انسان کی عظمت اور آزادی کے بیٹے ہیں' ہم مزدور' کسان اور کلرک کے بیٹے ہیں' یہ طوفان نہیں رکے گا۔۔۔۔ یہ طوفان بڑھے گا۔ ان بے جان دیواروں کو توڑتا ہوا طوفان آگے چلا جائے گا۔

اور میں اب بھی دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔ سنگینوں اور گولیوں سے چھدی ہوئی لاشوں کو۔۔۔۔ میرے کانوں میں اب بھی چیخیں اور کراہیں جھپٹ رہی ہیں۔

یہ لاش' وہ لاش۔۔۔۔ اور وہ لاش جس میں اٹھارہ سال تک پناہ گزیں رہا۔ لیکن اگر اور کوئی نہیں تو کم از کم میں جانتا ہوں' مہندر مرا نہیں ہے۔۔۔۔ میں جو زندہ ہوں۔ گولیاں جسم کو

چھید سکتی ہیں۔۔۔۔ مجھے نہیں مار سکتیں۔

میں نہیں مر سکتا۔۔۔۔ میں ان کی تاریخ ہوں۔ میں ایک قندیل ہوں۔ میں ان کی روح ہوں۔ میں ایک قوت ہوں' قوت جو زمانہ اور وقت کی تاریخ بدلتی ہوئی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ میں صدیوں کی دیواریں پھاند گیا ہوں۔ میں ہزاروں بار موت اور خون کے دریاؤں سے زندہ نکل آیا ہوں۔ میں مہندر سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے ہر زمانہ میں مہندر سے محبت کی ہے اور میری محبت کبھی نہیں مر سکتی۔۔۔۔ یہ مستقبل کے سینہ میں بھی فروزاں رہے گی۔ یہ پوسٹروں' گولیوں کی گونج' جلوسوں کے طوفان میں بھی زندہ رہے گی۔۔۔۔

زمین پر امڈتے ہوئے طوفانو! میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ اس لئے کہ میں نے ہر زمانہ میں تم سے محبت کی ہے۔۔۔۔ لو یہ گولیاں مہندر کا سینہ توڑ کر بھاگ جانا چاہتی تھیں۔۔۔۔ میں نے انہیں پکڑ لیا ہے۔ یہ مہندر کے لہو میں نہا کر پھر جل اٹھی ہیں اور یہ شہید مہندر کی امانت ہیں ۔۔۔۔ لو تم ان گولیوں کو اس وقت تک اپنی مٹھی میں بند رکھو' جب تک تم پر حملہ کرنے والے دشمنوں اور تمہارا یہ راستہ روک کر کھڑی ہونے والی خاکی دیواروں کے سینہ میں گولیاں دوبارہ نہ ٹھنڈی ہو جائیں۔۔۔۔ ہاں اس وقت تک تم ان گولیوں کو اپنی مٹھی میں بند رکھو! میں مطمئن ہوں' میں انسان کی تاریخ ہوں' میں امر جیوتی ہوں اور میں دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔ شہید مہندر کی لاش اپنی منزل کی طرف دوڑ رہی ہے اور میں دیکھ رہا ہوں۔۔۔۔ شہید مہندر کے خون میں نہائی ہوئی گولیاں اپنے شکار کی طرف جھپٹ رہی ہیں۔۔۔۔

○

گورستان سے پرے

ابھی قبر کا منہ کھلا ہوا تھا۔

مٹی کے ساتھ شام کا سرمئی رنگ بھی قبر کے کھلے منہ میں اتر رہا تھا۔

سرد ہوا سرسرا رہی تھی اور بھیگی مٹی بھی۔

جھکے ہوئے لوگوں کے ہاتھ 'دیو قیامت سیاہ کیکڑوں کے پیروں کی طرح' مٹی کو قبر میں دھکیل رہے تھے۔ تھوڑی دیر میں مٹی کوہان کی طرح اوپر اٹھنے لگی۔ گورکنوں نے کدالیں پھینک دیں اور پانی کا چھڑکاؤ کیا۔ مٹی کی خوشبو ہوا میں بکھر گئی۔ ہزار پایہ سائے پیچھے ہٹنے لگے۔ درختوں کے جھنڈوں میں نارنجی روشنی کے جال لرز کر بجھ گئے اور گورستان کی فصیل کے باہر قدموں کی آہٹ ہوا کو شہر کی طرف لے چلی۔ ہوا کے ساتھ کافور' لوبان اور اگربتی کی خوشبو بھی سفر کر رہی تھی اور کفن کی سفیدی بھی۔

شہر کی روشنیاں جھلملانے لگیں۔

ہوا دور تھی۔

روشنیاں دور تھیں۔

آہٹیں دور تھیں۔

اب سب کچھ دور تھا۔

وہ فصیل کے پاس بڑے سے کائی زدہ پتھر پر بیٹھ گیا۔ اس نے جوتے ہوا میں اچھال دیے۔ اس کی کالی جرسی' کالی کھانسی کی طرح' بدن سے چپکی ہوئی تھی۔ جیکٹ وہ پہلے ہی کہیں اتار کر

پھینک چکا تھا۔ اس نے جیب سے سگریٹ نکالی جو ماں کے پرس سے چرائی گئی تھی۔ پہلے کش کے بعد وہ رکا ہی نہیں۔ دھواں پیتا چلا گیا۔ جب جلد ہی، سگریٹ جل گئی اور اس کی انگلیوں میں ایک چھوٹی سی چنگاری دم توڑنے لگی تو اس نے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبا کر سگریٹ کی چنگاری کو بھی ہوا میں اچھال دیا۔ شیشے کی طرح شفاف سیاہی کی وسعتوں میں چنگاری تیرتی چلی گئی۔

تاریکی کا پگھلا پگھلا شیشہ ہوا کے ساتھ بہہ رہا تھا۔

ہوا کے سیاہ ہاتھ اس کے چہرے کو چھو رہے تھے۔

اسے ابکائی آ رہی تھی۔

اس کا سر جھک گیا۔

جھکا رہا۔

وہ صدیوں بعد، آہستہ آہستہ اٹھا اور پتھر پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے مڑ کر فصیل کے اس پار دیکھا۔ قبریں ابھر ابھر کر درخت بن گئی تھیں جن میں ہوا پھڑ پھڑا رہی تھی۔ سیاہ درخت آسمان کی طرف اڑ رہے تھے۔ اور ان کے پتوں اور شاخوں کے اس پار ستارے جھلملا رہے تھے۔

سب کچھ دور تھا۔

آدھا چاند بھی تارے بھی۔

صرف قدموں کے نشان چمک رہے تھے۔ یہ جنازہ لانے والوں کے قدموں کے نشان تھے۔ جب وہ آئے تھے تو ان کے کندھوں پر بوجھ تھا اور جب واپس گئے تو ان کے ہاتھ خالی تھے۔ کندھوں پر ہوا کے سوا اور کسی چیز کا بوجھ نہیں تھا۔

دھوپ تیز ہو گئی تو موسم ہی بدل گیا۔

اس کے قدم تیز ہو گئے۔

شہر اب بھی دور تھا۔

البتہ گھر نظر آ رہا تھا۔

بڑا سا پھاٹک کھلا ہوا تھا اور سوگ منانے والے، جو دوسرے شہروں اور قصبوں سے آئے تھے،

رخصت ہو رہے تھے۔ وہ ان کے پاس سے گزر گیا۔ اس نے کسی کو نہیں پہچانا۔ کسی نے اس کو دیکھا بھی نہیں۔

خدا حافظ!

خدا حافظ!

صدائیں کہیں کھو گئیں۔

وہ باہر والے برآمدے میں کھڑا تھا۔ وہ جلتی آنکھوں سے ڈرائنگ روم کے آدھے کھلے ہوئے دروازے کے اندر دھوپ' چھاؤں میں لحافوں کی دھند کو پھیلتے اور ہٹتے دیکھ رہا تھا۔

یکا یک دروازہ پورا کھل گیا۔ دروازے میں ماں کھڑی تھی۔ اس کے خضاب سے رنگے ہوئے سیاہ چمکتے بال سڈول شانوں پر جھول رہے تھے۔ وہ مسکرائی اور اس کی آنکھوں سے روشنی چھلک پڑی۔

"اچھا تو تم جاگ گئے! اتنا سویرے؟"

ماں کتنی خوبصورت ہے!

اس کی آنکھوں میں چنگاریاں تڑپیں۔ ہونٹ آہستہ آہستہ پھیلے۔ پپڑیاں پھٹ گئیں اور زبان پر نمک کا مزا مری ہوئی چیونٹیوں کی طرح چپک کر رہ گیا۔

کسی ماتم گسار نے پاس سے گزرتے ہوئے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کچھ پھنکارنے کے انداز میں کہا "باپ مر جاتا ہے۔ بیٹا زندہ رہتا ہے۔ یہی ہوتا آیا ہے۔"

ماں نے جانے والے کو بڑی شکر گزار نظر سے دیکھا اور مسکرائی۔ اس کی آنکھیں اب بھی روشن تھیں۔ "کبھی کبھی لگتا ہے کہ زندگی یہاں ختم ہو گئی۔ لیکن زندگی جہاں ختم ہوتی ہے وہاں ختم نہیں ہوتی۔ اس سے آگے جاتی ہے۔"

ماں نے اس کے گال پر ہاتھ پھیرا اور کہا "اوپر جاؤ۔۔۔۔ جا کر شیو کر لو۔"

وہ اوپر گیا اور اپنے باپ کے سیفٹی ریزر سے' جو ہفتوں سے استعمال نہیں ہوا تھا' اور جس پر پرانا بلیڈ چڑھا ہوا تھا' ہفتوں کی داڑھی کو کھرچنا شروع کر دیا۔

"میرا باپ خدا کا بیٹا تھا۔ میں خدا کا پوتا ہوں۔"

اس کے ہونٹ پھیل گئے۔ پپڑیوں سے رستا ہوا خون شیونگ کریم کے خوشبودار جھاگ میں گھلنے لگا۔

O

ماں نہا کر باتھ روم سے نکلی تو نیلا ٹرکش باتھ اس کے بھیگے ہوئے جسم سے چپکا ہوا تھا۔ وہ پنجوں کے بل چلتی ہوئی کمرے کے دروازے تک گئی۔ دروازہ بند کرنے سے پہلے چند لمحے کو رکی۔ دور کے کمرے سے گٹار کی گونج اور پھنسا پھنسا مدہوش لحن سنائی دے رہا تھا۔ اس نے ہونٹ بھینچ لئے اور دروازہ بند کر دیا۔ سنگار میز کے سامنے تولیہ اس کے شانوں سے سرک گیا۔ وہ تھوڑی دیر آئینے کے سامنے ششدر کھڑی رہی۔ وہ بار بار نظر کو چہرے پر جمانا چاہتی اور بار بار اس کی نظر پھسل کر اپنی ناف کے نیچے جھریوں سے منڈھے ہوئے ڈھیلے ابھار پر جم جاتی ہے۔ کبھی یہ لڑکا اس چھوٹے سے جال میں بند تھا، مگر اب دیکھو۔ اس نے جھک کر ولایتی برش اٹھایا اور بھیگے ہوئے لمبے بالوں کو سر کیا۔ ولایتی خوشبو کے چھڑکاؤ سے جسم کے نازک گوشوں کو مہکایا۔ جب اس نے کپڑے پہنے تو گدے دار نکیلے بریسیرز کا گہرا گلابی رنگ ہلکے گلابی بلاؤز سے چھن رہا تھا۔ چہرے پر ولایتی پاؤڈر کی تہیں جب گہری ہو گئیں تو آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے بھی غائب ہو گئے اور بے نیند آنکھوں کی تھکن بھی۔ ہونٹوں پر سرخی پھیر کر اس نے کئی بار ہونٹ چپکائے اور کھولے اور ایڑیوں سے ساڑی کے کنارے کو دبا کر کئی بار آئینے میں دیکھا۔ مسکرائی۔ چہرہ دمک اٹھا۔ نچلا ہونٹ دانتوں میں دباتے ہی اس کی عمر کوئی پندرہ سال کم ہو گئی۔ اور وہ یہ جانتی تھی۔ جلدی جلدی عینک اٹھائی، دو تین کاپیاں سمیٹیں اور زینے سے ہوا کی طرح اتری۔ کار میں بیٹھتے ہوئے اس نے ایک بار دور کے کمرے کی طرف دیکھا، جہاں سے گٹار کی دھن سنائی دے رہی تھی۔

"جانے یہ بدکا ہوا گھوڑا کب قابو میں آئے گا!"

کار کی دور جاتی ہوئی غراہٹ کے ساتھ ساتھ ٹیپو کی نسوں کا تناؤ کم ہونے لگا۔ اس نے اپنے آپ سے کہا "چلو چھٹی!" اور گٹار ایک طرف رکھ دیا۔ اس کے ننگے جسم پر پسینا چیونٹیوں کی طرح دوڑ رہا تھا۔ میلے لمبے ناخنوں سے اس نے میلی ناک کو کریدا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ لمبے لمبے

قدم سے کھڑکی کے پاس پہنچا' آہستہ سے کھڑکی کا پٹ کھولا۔ نیم وا آنکھوں کو چھوتی ہوئی دھوئیں کی لہر کھڑکی سے باہر چھننے لگی۔ دھندلکے میں دیوار پر اس کے ہاتھ کے ابھارے ہوئے نقوش کچھ گڈمڈ سے ہونے لگے۔ اس کے جسم کا پسینا فرش پر اس کے قدموں کے نشان چھوڑتا ہوا پھیل رہا تھا۔

دیواریں طرح طرح کے نقوش اور خاکوں سے چنی ہوئی تھیں۔ جیسے جیسے کمرے میں دن کی روشنی رسنے لگی' ویسے ویسے ان میں جان پڑنے لگی۔

رینگو۔۔۔۔ تم بھی رینگو۔۔۔۔ دھوپ بھی رینگتی ہے۔۔۔۔ بو بھی۔

مونالیزا کی بچی!

وہ آہستہ آہستہ انگلیوں کو مسلتا ہے۔ رانوں کو سہلاتا ہے اور ناچتا ہے۔ جیسے اس کے پاؤں زمین پر نہ ہوں۔ خود اس کے ہاتھوں کے کھینچے ہوئے نقوش بھی ناچتے ہیں۔ چہرے' ٹانگیں پھیلی ہوئی' گتھی ہوئی' اکڑی ہوئی' مڑی ہوئی۔۔۔۔ چہرے جن پر کیکٹس کے کانٹے اگے ہوئے ہیں۔ پھیلی ہوئی ٹانگوں کے درمیان ایٹم بم طلوع ہو رہا ہے۔ پستانوں پر تیل چٹے پتنگوں کی طرح اڑ رہے ہیں۔ کتا ایک ٹانگ اٹھائے ہوئے ہے اور زمین پر کیڑوں کے چاٹے ہوئے پھول جھڑ رہے ہیں۔

مونالیزا کی بچی!

اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ وہ رانوں کو سہلاتا ہے اور آہستہ آہستہ جھکتا ہے۔ جھکتا ہے۔ بھیگے ہوئے درخت کی شاخ کی طرح' ہتھیلیوں پر تھوکتا ہے اور ناف کے نیچے گدگداتا ہے۔ اس کا جسم جلنے لگتا ہے۔ وہ ماں کے چھوٹے سے گیجٹ میں ایک کیسٹ ڈالتا ہے اور بٹن دباتا ہے۔ ٹھنڈی سانسوں کے آہنگ میں پاگل بنا دینے والا اضطراب ہے۔ وہ ناچ رہا ہے اور اس کی باہنوں میں کوئی لچک رہا ہے۔

آ

جا

لے

وے

لے

ہائے

بس

بس

بس

وہ افریقہ کی جنگلی دھن پر ناچ رہا ہے۔ اس کا تپتا چہرہ مسخ ہو رہا ہے۔ اس کے جسم میں بے رحم جارحیت پیدا ہو رہی ہے۔ تناؤ۔۔۔۔ لعاب سے بھیگی ہوئی مٹھی اسی دھن پر گدگدی کا میٹھا زہر نچوڑ رہی ہے ایک ایک روش سے۔ آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں۔ جسم کی حرکتوں کا آہنگ سورج کی طرح اڑ رہا ہے۔ اپنے جلتے پروں سے۔ اور سورج مٹھی میں بند ہے۔ وجود کی ساری آگ اگلنے کو بے قرار۔ کوئی اس کے جسم سے چپک رہا ہے۔ اس کا دوسرا ہاتھ ہونٹ کھولتا ہے اور آگ کے پیکر کو چومتا ہے۔ یہاں' یہاں' یہاں۔ مونالیزا کی بچی! وہ آگ کی لپٹوں کو بانہوں میں سمیٹتے ہوئے فرش پر گر جاتا ہے۔ نڈھال۔۔۔۔ خاموش۔ وہ اب بھی ایک جسم کو سہلا رہا ہے جو فرش کی طرح ٹھنڈا ہے۔ اس کی ہتھیلیاں بھی ٹھنڈی ہیں جو ایک ٹھنڈی کمر کو سہلا رہی ہیں۔ بازو بھی ٹھنڈے ہیں جو ٹھنڈی ہڈیوں کو توڑ رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ ہر چیز ٹھنڈک میں لپٹ کر سو جاتی ہے۔

جانے کب سے میں اسی طرح سو رہا ہوں۔ آنکھیں کھلی ہوئی ہیں اور میں سو رہا ہوں۔ دیواریں مجھ پر اتنا ٹھنڈا دباؤ ڈال رہی ہیں۔ دیواریں اور دیواروں پر میرے ہاتھوں کے ابھارے ہوئے پیکر۔ سب مجھے کاٹ رہے ہیں۔ ٹھنڈے ٹھنڈے ڈنک' ٹھنڈی ٹھنڈی سرسراہٹ' ٹھنڈی ٹھنڈی رگیں' ٹھنڈی ٹھنڈی خاموشی' ٹھنڈی ٹھنڈی روشنی' ٹھنڈے ٹھنڈے سائے' ٹھنڈی کاٹ' ٹھنڈی ٹیس سب کچھ ٹھنڈا' سب کچھ مرا ہوا ہے۔ میں یہ سب محسوس کر سکتا ہوں اور وہ؟ جس کی ٹھنڈک نے مجھے جینے پر مجبور کیا۔ وہ ہزاروں من مٹی کے نیچے کیا کر رہا ہے؟ دقت کے کیڑوں نے کچھ چھوڑا ہے۔ بے ہنگم کھیم شحیم ہڈیوں کے سوا؟ لو یہ ہڈیاں ہیں۔ ٹیڑھی میڑھی' میلی' مٹی کھائی ہوئی۔ ٹوٹی پھوٹی۔ چاہو تو تم ان ہڈیوں کو اپنے سوٹ کیس میں رکھ کر دنیا کے

سفر پر نکل سکتے ہو۔ میرے باپ نے یہ سوٹ کیس اپنی ہڈیوں کے لئے نہیں دیا تھا۔ جانتا ہوں۔ میں تو ایک بات کہہ رہا ہوں۔ سوٹ کیس خالی ہے۔ میں بھی اور سوٹ کیس کو یا اپنے آپ کو ہڈیوں سے بھرنے سے فائدہ؟ اٹھنا چاہیے۔ دیکھنا چاہیے۔۔۔۔ کیا سب کچھ ویسا ہی ہے جیسا تھا یا کچھ بدلا بھی ہے۔ کتنی عجیب بات ہے 'سب کچھ میں' میں بھی شامل ہوں۔ جیسے میں کوئی کمبل ہوں' کوئی جوتا' کوئی ٹوتھ پیسٹ' کوئی درخت' کوئی ہوا کا جھونکا یا کوئی تھوکا ہوا بلغم۔ او گاڈ! اٹھنا ہے۔ کھڑا ہونا ہے۔ باہر نکلنا ہے۔

اس نے پھر شیو نہیں کیا۔ وہ پھر نہیں نہایا۔ نیکر پہنا اور کندھے پر تولیہ رکھا' لیکن اس سے آگے جانے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ماں کے کمرے کے باہر مستطیل برآمدے میں' جس کا رخ کھلی ہوئی چھت کی طرف تھا' چھوٹی سی میز پر اس کا ناشتہ روز کی طرح رکھا ہوا تھا۔ دودھ کے ٹھنڈے گلاس کے کنارے پر مکھیاں ٹوٹ رہی تھیں۔ توس پر مکھن پھیل کر گھی کی طرح چکنا ہو گیا تھا۔ ایسی ہی چکناہٹ اسے اپنی ماں کے میک اپ کئے ہوئے چہرے پر نظر آتی تھی۔ توس اور ماں کا چہرہ! وہ دبے پاؤں فریج کے پاس گیا۔ ادھر ادھر دیکھا۔ کوئی اور نہیں تھا گھر میں۔۔۔۔ دور سے جھاڑو کی آواز یوں سنائی دے رہی تھی جیسے کوئی سسکیاں بھر رہا ہو۔ اس نے فریج سے پانی کی ٹھنڈی بوتل نکالی اور کھڑا کھڑا پی گیا۔ جیسے جیسے اس کی پیاس بجھ رہی تھی اس کی گردن کی رگیں پھولتی جارہی تھیں۔ وہ میز کے پاس کرسی پر بیٹھ گیا۔ ٹانگیں اٹھا کر اس نے میز پر رکھ لیں۔ اس کے کالے میلے ناخنوں کی قربت سے مکھیاں اڑ گئیں۔ اس کا لمبا ہاتھ اور لمبا ہو گیا اور وہ بغیر منہ دھوئے دودھ پینے لگا۔ توس کو اس نے چھوا بھی نہیں۔ اسے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ وہ بہت دیر سے توسوں پر مکھیوں کو اترتے اور پھر لمبے ناخنوں کی جنبش سے اڑتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں جل رہی تھیں اور گلا خشک ہوا جارہا تھا۔ دور' بڑے بڑے درختوں کو ہوا جھنجھوڑ رہی تھی۔ جھاڑو کی آواز دوپہر کے سناٹے میں کھو چکی تھی۔

کب تک میں پیچھے کے زینے سے آتا جاتا رہوں گا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

"ٹیپو! آؤ میرے پاس آؤ' مجھے دیکھو۔ میں کہیں نہیں گیا۔ میں یہیں ہوں۔"

بھاری آواز سے دوپہر کا گھر بھر گیا۔ اسے لگا کہ اس کے سینے میں کوئی بڑی سی چٹان چیخ گئی۔ وہ کھڑا ہوا کانپ رہا تھا۔ گلاس لڑھکتا ہوا گلدان سے ٹکرایا۔ مکھیاں بے خبر رہیں۔ اس کا پورا جسم

کانپ رہا تھا۔

نہیں یہ سب ۔۔۔۔ نہیں میں اس آواز کو پہچانتا ہوں۔

اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔

بھری دوپہر کو اس کا گھر رات کے اندھیرے میں ڈوب گیا۔ سائے سایوں میں ڈوب رہے تھے۔ ہوا اتنی تیز تھی کہ دیواریں دیواروں سے ٹکرا رہی تھیں۔

وہ کھڑا ہو گیا اور راستہ ڈھونڈنے لگا۔

کدھر جاؤں' کہاں جاؤں؟

سایوں میں ایک سیاہ ہیولا ذرا خم کھائے ہوئے زینے کے نیچے کھڑا تھا اور اس کو اشارے سے بلا رہا تھا۔

ڈراکولا!

ماں نے کہا تھا ڈراکولا اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ بھاگتی ہے اور یہ سیاہ ہیولا ہاتھ بڑھا کر اسے دبوچ لیتا ہے' اور اپنے دانت اس کی گردن میں پیوست کر دیتا ہے۔ ماں اس کے دانت کہاں ہیں؟ یہی تو بات ہے اس کے دانت دکھائی نہیں دیتے۔ لیکن میں جانتی ہوں یہ دانت کتنے لمبے اور کتنے تیز ہیں اور جتنی بار یہ دانت میری گردن میں ڈوبتے ہیں' کھولتے ہوئے زہر کی زبانیں خون میں لپکتی ہیں۔ یہ ڈراکولا مجھے کھا گیا۔ ماں ۔۔۔۔ موم' مجھے یاد ہے جب میں بہت چھوٹا تھا تو میں نے اس کیم شیم ڈراکولا کو تمہارے بستر میں دیکھا تھا۔ وہ سو رہا تھا۔ چھت پر دھوپ چمک رہی تھی اور تم اسے چاٹ رہی تھیں۔ اور وہ سو رہا تھا۔ ننگا ۔۔۔۔ اور تمہارے دو دانت اس کی گردن میں چبھے ہوئے تھے۔ تم ہنس رہی تھیں اور وہ مزے میں سو رہا تھا۔ میں بھاگ کھڑا ہوا۔

آواز بہت قریب آ گئی تھی۔ وہ تھرتھراتی ہوئی ٹانگوں سے اترا۔ وہ اتر رہا تھا اور زینہ بڑھتا جا رہا تھا اور جہاں زینہ ختم ہوتا تھا وہیں وہ کھڑا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ زینے کی ریلنگ پر تھا اور دوسرا عینک کی کمانی پر۔

آؤ ۔۔۔۔ آؤ ۔۔۔۔ بیٹے آؤ ۔۔۔۔ مجھے پہچانو۔

میں تیزی سے اترنے لگتا ہوں۔ میں زینے کا فاصلہ کم کرنا چاہتا ہوں۔ مہینوں بعد اس زینے سے اتر رہا ہوں جو گھر کے اندر اترتا ہے' اس کمرے کے پاس جو موت کا کمرہ ہے۔ جب بھی

کوئی مرنے لگتا ہے اسی کمرے میں ڈال دیا جاتا ہے۔ ڈراکولا کو بھی اسی کمرے میں ڈال دیا گیا تھا۔ لیکن اب مجھے کچھ یاد نہیں۔ دوپہر کا سناٹا رینگ رہا ہے' سرسرا رہا ہے اور اب میں نیچے آگیا ہوں۔ میرا مہینوں کا پالا ہوا خوف میرے سینے میں کتے کی طرح بھونک رہا ہے۔ یکایک ریلنگ پر سے ہاتھ ہٹا' عینک ناک پر سے پھسلی اور ہیولا' سیدھا' پشت کی طرف الٹا مڑا اور ہوا میں تیرتا ہوا موت کے کمرے میں غائب ہو گیا۔ میں کمرے کے اندر دیکھ رہا ہوں۔ قبر کا منہ کھلا ہوا ہے اور وہ چت لیٹا ہوا ہے۔ کمرے میں روشنی بھی ہے اور اندھیرا بھی۔ دونوں ایک دوسرے کو چاٹ رہے ہیں۔ روزن بند ہے۔ ہوا بند ہے۔ اس کا گنجا سر چمک رہا ہے۔ جس پر پسینے کی بوندیں تیر رہی ہیں۔ اس کا پورا جسم بے حرکت ہے' لیکن خون اس کے منہ سے ابلتا ہے اور اس کی گردن پر پڑی ہوئی چادر کو بھگو دیتا ہے۔ وہ آنکھ کھولے بنا مجھے دیکھتا ہے۔ ہونٹ جمے ہوئے خون سے چپک گئے ہیں۔ مگر وہ ہونٹوں کو کھولے بنا مسکراتا ہے۔ ماں ڈرائنگ روم میں بیئر پی رہی ہے اور کہہ رہی ہے میں ایک ایسے آدمی پر سب کچھ لٹا دوں جو مر رہا ہے؟ اسے تو مرنا ہے۔ ان کا کیا ہوگا جو زندہ ہیں اور زندہ رہیں گے۔ !I am not a sentimental fool اور ہیولا' جواب ہڈیوں پر لپٹی ہوئی بے رنگ کھال کے سوا کچھ نہیں' آنکھیں کھول دیتا ہے۔ وہ مجھے دیکھتا ہے۔ اس کے دیدے کن گہرائیوں میں غرق ہیں۔ ان میں چنگاریاں جھلملاتی ہیں۔ پھر منہ خون سے بھر جاتا ہے اور تھکے ہوئے پپوٹے چنگاریوں کو بجھا دیتے ہیں۔ گھر میں اطمینان کی لہر سی دوڑ جاتی ہے۔ عذاب کٹا۔

ٹیپو۔۔۔۔۔ تم کہاں ہو؟ ماں پکار رہی ہے۔ بہت دور سے آواز دے رہی ہے۔ شاید کسی جنگل میں کھو گئی ہے اور اب ڈر رہی ہے۔ اسے راستہ نہیں مل رہا ہے۔ بڑی موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ درخت پانی کے بوجھ سے زمین پر گر پڑے ہیں۔

ٹیپو۔۔۔۔۔ تم کہاں ہو؟

میں کہیں نہیں ہوں۔ میں بھاگتا ہوں۔ اور گھر کے سارے دروازے بند کر دیتا ہوں اور بھاگ کر زینے کے پاس لوٹ آتا ہوں اور موت کے کمرے کی طرف دیکھتا ہوں۔ ڈرائنگ روم سے شراب کی بو قہقہوں کی گونج کے ساتھ آ رہی ہے۔ زندگی کب کسی کا غم کھاتی ہے۔ کوئی خون تھوکتا ہے' کوئی وسکی پیتا ہے۔

ہیولا وہیں کھڑا ہے۔ عینک کی کمانی کہاں غائب ہوگئی ہے۔

اس کی گردن موٹی ہی نہیں ربڑ کی بنی ہوئی ہے' بہت سارے ربڑ کی اور وہ اس پر ٹائی باندھتا ہے۔

ڈراکولا کا منہ کھلتا ہے مگر دانت دکھائی نہیں دیتے۔ وہ آہستہ آہستہ کالر کو سہلاتا ہے اور ٹائی کی موٹی گرہ کو ٹٹولتا ہے۔

"میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔"

میں سہم جاتا ہوں۔

میں مردہ بادشاہ کا بھوت نہیں ہوں۔ اور تم ہیملٹ نہیں ہو۔ پھر بھی مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔ میرا گلا خشک ہو جاتا ہے اور میں چیختا ہوں۔ بچاؤ! بچاؤ! اس کا ہاتھ بڑھتا ہے اور میرے پاؤں زمین میں گڑ جاتے ہیں۔

یہ کس قسم کا ڈراکولا ہے۔ بھاری بھر کم ہیولا' نرم ہاتھ' بے مزا مسکراہٹ' بڑا سا چہرہ' بڑا سا سر ..... میں جارہا ہوں۔ میرا کچھ نہیں ہے۔ نہ وہ عورت' نہ یہ گھر' نہ وہ کار' نہ وہ باغ' جہاں کیاریوں کے پاس جھومتی ہوئی شاخوں پر چڑیاں چہچہا رہی ہیں۔ نہ وہ گملے' میں جن میں پانی ڈالتا رہا ہوں' نہ یہ چقیں جن کو میں گرمیوں میں گرا دیتا تھا اور جاڑوں میں اٹھا لیتا تھا' نہ یہ ڈرائنگ روم' جہاں تمہاری ماں کے دوست وسکی پی رہے ہیں اور اپنے اپنے کیریر کو نکھارنے کے لئے اپنے حریفوں کے خلاف زہر اگل رہے ہیں' مجھ پر جملے چست کر رہے ہیں اور تمہاری ماں کی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھ رہے ہیں! بڑے اچھے لوگ ہیں' جو یہاں سے نکلتے ہی اپنی یا کسی اور کی بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈالیں گے اور رکشا میں چپک کر بیٹھیں گے اور کہیں گے "کیا مرد مار عورت ہے ..... مجھے تو اس آدمی پر بڑا ترس آتا ہے' جس میں اتنی سی خودداری نہیں' میں ہوتا اس کی جگہ ...... "یہی تو بات ہے کہ تم سب کمبخت اس کی جگہ ہونا چاہتے ہو حالانکہ وہ کم بخت خود اپنی جگہ پر نہیں ہے۔ وہ سالی عورت ہی کچھ ایسی ہے۔ چھلکتی ہوئی۔ چھوٹے سے گلاس میں شراب بہت زیادہ انڈیل دی گئی ہے۔ نہ وہ طوطے جو کب کا پنجرہ کھول کر کھلی ہوئی ہواؤں میں اڑ گئے' نہ وہ بلیاں جو ہر وقت جمائیاں لیتی رہتی ہیں' اور نہ وہ کتے جو میری طرح مر رہے ہیں۔ ان کے کیڑے بھی دکھائی دیتے ہیں اور زخم بھی۔ میرے نہیں

دکھائی دیتے۔ یہی تو فرق ہے۔ ویسے یہ کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ چائے کی وہ ٹرے بھی نہیں جو میں ہر صبح نماز کے بعد اوپر لے جاتا ہوں' جہاں وہ عورت اپنی لسبین دوست کی آغوش میں دبی دبائی پڑی رہتی ہے' ریشمی نائٹی میں' نہ وہ میٹھی تھکن جو میں اس کی کچھ سوتی کچھ جاگتی آنکھوں میں دیکھتا ہوں نہ وہ سڑک جس کے آخر میں ایک پھاٹک ہے اور جسے میں روز صبح کھولتا ہوں اور رات کو بند کر دیتا ہوں تاکہ صبح کو اس عورت کی کار گرد اڑاتی ہوئی نکل جائے' اور رات کو کوئی چور نہ آنے پائے۔ حالانکہ کار پھاٹک سے نکلنے سے پہلے پھر بھی غراتی ہے اور چور پھر بھی آتے ہیں۔ یہ کتے مجھے کچھ عجیب نظر سے دیکھ رہے ہیں' جیسے انہیں معلوم ہو گیا ہو کہ میں اب کے جاؤں گا تو لوٹ کر نہیں آؤں گا۔ ان کے سوا کسی کو بھی میرے سفر کا احساس نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میرا سفر اتنا آسان ہو گیا ہے۔ رات بھیانک ہے اور کتے رو رہے ہیں۔ وفاداری کتوں کو رلاتی ہے۔ مجھے غم اس کا ہے کہ تم سب مجھے قبر میں ڈالتے ہی بھول جاؤ گے۔ لیکن یہ کتے مجھے یاد کریں گے اور رو رو کر مر جائیں گے۔ They are such sentimental fools! تمہاری آنکھیں پھیل رہی ہیں۔ تم پہلی بار مجھے پہچان رہے ہو۔ میں سو نہیں رہا ہوں اور تم چرس کے نشے میں نہیں ہو۔ اس کو موت کے کمرے میں پڑے پڑے بہت دیر ہو چکی ہے۔ اس کی لاش سر سے پاؤں تک سفید چادر سے ڈھکی ہوئی ہے۔ آنگن میں میت کو نہلانے کا انتظام ہو رہا ہے۔ خدا ترس لوگ بہت مصروف ہیں۔ اتنے سارے لوگ کہاں سے آگئے ہیں۔ پورا لان بھر گیا ہے۔ وہ تو بڑا گمنام سا شخص تھا۔ لوگ تو اس کو محض اس عورت کے دم چھلے یا غلام کی حیثیت سے جانتے تھے۔ پھر بھی کچھ لوگ رو رہے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے۔ خود عورت کتنی حیرت زدہ ہے۔ سب ایک دوسرے کے کان میں منھ ڈال کر کچھ کہہ رہے ہیں۔ مردہ یہ سب کچھ دیکھ اور سن رہا ہے اور لہولہان' خشک' ٹھنڈے ہونٹوں سے مسکرا رہا ہے۔ اب اس کی مسکراہٹ پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ہے۔ مردہ اٹھتا ہے اور سب کی نظر بچا کر پورے گھر کے چکر لگاتا ہے۔ ویسے جب وہ زندہ تھا تب بھی سب کی نظر بچا کر ہی جیتا تھا۔ مگر وہ اب ان سب کمروں میں جا رہا تھا جہاں وہ برسوں سے نہیں گیا تھا۔ اوپر سنگار میز پر کنگھے میں الجھے ہوئے بالوں کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ آئینے میں اس نے اپنا عکس دیکھنا چاہا۔ لیکن اس کا کوئی عکس نہیں تھا۔ پہلی بار اسے اس تبدیلی کا احساس ہوا۔ اس کا وجود اب زندگی

کے ہر آئینے سے اپنا عکس چھوڑے بنا چھن رہا تھا۔ ساری کتابیں بجی ہوئی تھیں۔ بہت سی ان میں ایسی تھیں جو کبھی کھلی ہی نہیں تھیں۔ مگر تھیں۔ اسکاچ کی ایک خالی بوتل سنگار میز کے پاس کونے میں رکھی تھی۔ وہ دیر تک اس بوتل کو دیکھتا رہا' جیسے اپنے آپ کو دیکھ رہا ہو۔ ماضی سے ایک قہقہہ اڑتا ہوا آیا اور اس پر پھٹ پڑا۔ یہ ماں کا قہقہہ تھا۔ ڈرائنگ روم سے اڑ کر آیا تھا۔ جب اسکاچ سامنے ہو تو ٹھرا کون پیئے۔ اس نے سرخ ڈوروں بھری سوجی ہوئی آنکھوں سے ڈراکولا کی طرف دیکھا تھا۔ اس شخص میں اتنا سا 'سینس آف ہیومر' نہیں ہے۔ بے عرق' نچڑا ہوا نیبو۔ جب دیکھو جب وہی کمزور مثانے کی بات' جب دیکھو جب وہی چھوٹی حکایتوں کا قصہ جو اس نے بچوں کی ہدایت کے لئے کبھی لکھا تھا۔ یا یہ ذکر کہ خان صاحب کے بیٹے کی شادی میں قورمہ مغلئی شان کا تھا اور زردے میں خوشبو واجد علی شاہی شان کی تھی۔ آم تو اصلی رام پور میں ہوتے ہیں۔ گٹھلیاں برائے نام اور مزہ ثمر بہشت کا۔ جب دیکھو جب دوسروں کے یہاں عقیقہ یا ختنہ کا انتظام کیا جا رہا ہے۔ یہ جوش اپنی شادی میں نظر نہیں آیا۔ ساری سرگرمی خلوت میں۔ سارا خون پسینہ بستر پر۔ باہر وہی جانماز' وہی تسبیح' وہی وظیفہ خوانی۔ آدمی ہے یا گھن چکر۔ اور میں زندگی سے ایک ایک بوند نچوڑ لینا چاہتی ہوں۔ میں تمام روایتوں کو توڑ کر زندہ رہنا چاہتی ہوں اور یہ شخص ایک بھاری چٹان کی طرح میری گردن میں بندھا ہوا ہے۔ اگر میں چٹان ہوں تو مجھے پھینک دو اپنے وجود کی حدوں سے باہر۔ حرامزادے پھینک تو دوں اپنی پرانی سینڈل کی طرح' مگر میرے کیریر کا کیا ہوگا۔ بدنام ہو جاؤں گی۔ چلو تمہاری یہ بزدلی تمہیں سوٹ کرتی ہے۔ اس چٹان کو گردن سے لٹکنے دو۔ میں تیل چٹے کی طرح رات کے اندھیرے میں تمہارے وجود کے اردگرد رینگتا رہوں گا۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔ اور تم یوں بوکھلائے کیوں کھڑے ہو بیٹے۔ تم جانتے ہو۔ یا شاید نہیں جانتے۔ میں جانتا ہوں۔ اکیلے تم ہو جس کو چھوڑنے کا مجھے غم ہے۔ تم میں کوئی ایسی بات ہے جو مجھے جینے پر مجبور کرتی ہے۔ تمہاری نرمی اور سفاکی۔ کیا تم نے اس وقت بھی چرس چڑھا رکھی ہے۔ تمہاری آنکھیں میرے چہرے پر کچھ عجیب طرح سے گڑی ہوئی ہیں۔ تمہارے الجھے ہوئے بال مجھے بہت اچھے لگ رہے ہیں۔ میں گنجا ہوں' اس لئے گھنے بال میری کمزوری ہیں۔ کبھی میرے بال بھی بڑے گھنے تھے مگر زندگی نے چپت مار مار کر صفایا کر دیا۔ تم اتنے لمبے ہو' میری طرح۔ اور

چھریرے بدن کے جیسا میں کبھی نہیں تھا۔ میری سیاہی اور تمہاری ماں کی دمک نے مل کر تمہارا رنگ کتنا نکھار دیا ہے۔ اور میں حیران ہوں کہ اگر زندگی میں پہلی اور آخری بار میں نے تمہاری ماں سے بغاوت نہ کی ہوتی تو تم کہاں ہوتے۔ میں مر تا تو یہ جانے بنا مرتا کہ کوئی مجھ سے محبت کرتا ہے۔ میں نے زندگی میں ایک ہی سازش کی ہے۔ تب تم خون کی جیلی بن چکے تھے۔ اور تمہیں آپریشن ٹیبل پر قتل کرنے کا بندوبست ہو چکا تھا اور تب میں نے ڈاکٹر کو رشوت دی تھی اور تمہاری ماں کو شکست۔ خون کی جیلی کو جاگنا تھا۔ باہر آنا تھا' دھوپ میں۔ اب میں اس دھوپ کو چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ تم' میں جانتا ہوں تم کیوں چرس کے کش اڑاتے ہو۔ تمہیں یہ سب اچھا نہیں لگتا۔ یہ سب بھول جاؤ۔ میں چلا جاؤں گا۔ پھر نہیں آؤں گا۔ پر جاتے جاتے ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ تم ان سب باتوں سے بھاگتے بھاگتے اب اپنے آپ سے بھاگ رہے ہو۔ کوئی اپنے آپ بھاگ کر کہاں جا سکتا ہے۔ بہت عمدہ کاک ٹیل۔ بائی گاڈ۔ آہستہ آہستہ پیو۔ گھونٹ گھونٹ۔ اس کو لیکچر دینے میں مزہ آتا ہے۔ اسی لیکچر میں وہ اپنا سارا فرسٹریشن نچوڑ دیتا ہے۔ ٹھس کہیں کا۔ آپ کس سے ویلیوز کی بات کر رہے ہیں جناب؟ آپ کا چہرہ ڈوبتے چاند کی طرح سفید ہو گیا ہے۔ سفید یا سرخ؟ چڑھ رہی ہے۔ چڑھنے دو۔ تھوڑی اور۔ بس ذرا سی۔ دیکھئے آپ چوٹ کر رہے ہیں۔ میں روایتی ویلیوز کو گرد سمجھتی ہوں۔ میری ویلیوز ہیں وہ لمحے جو میں جیتی ہوں۔ جن کا میں تجربہ کرتی ہوں۔ جو میرے وجود میں ڈھل جاتے ہیں۔ اس شراب کی طرح؟ جی ہاں! بڑے اسمارٹ ہیں آپ۔ آپ کو پائریا تو نہیں۔ وہاٹ اے بور! ڈیم اٹ! پھر وہی ویلیوز کا قصہ۔ مادام! آپ تو ذرا سی بات پر بپھر جاتی ہیں۔ دیکھئے ناچنے کے بعد inhibitions ختم ہو جاتی ہیں۔ اور دفن سوال' مردوں کی طرح' قبر سے نکل پڑتے ہیں۔ ہاہاہا! قیامت کے دن یہی ہو گا۔ قیامت کا کوئی دن مقرر نہیں ہے۔ ویسے یہ قیامت اصل میں آپ کا ضمیر ہے۔ اتر آئے نا کلیشے پر! اس کی آنکھیں چڑھ رہی ہیں۔ ہونٹ بھیگے بھیگے' سوجے سوجے دکھائی دے رہے ہیں۔ میں تو صرف یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ ـــــ باقی سارے کام تو آپ اسی طرح کرتی ہیں جس طرح دوسرے لوگ کرتے ہیں' مگر جیتی ہیں آپ بالکل دوسری طرح ـــــ کیریر' عشق' جائداد' جھوٹ کیا یہ سب بھی وہی' لمحہ لمحہ' میرا مطلب ہے۔ چڑھ گئی۔ تم گھر جاؤ۔ اس کے ہونٹ چپک گئے ہیں۔ بلاؤز کے

گول گریبان میں سنہرا تلاطم پیدا ہو گیا ہے۔ سب خوش ہیں۔ لطیفوں پر ہاتھ ملا رہے ہیں۔ صرف وہ اکیلا کھڑا ہے۔ سہما ہوا۔ خوف زدہ۔ اتنا گیم شحیم جسم اور موجودگی اتنی منحنی! ڈرا کولا کونے میں ہے اور اس کا منھ دیوار کی طرف۔

دور سے کار کی غراہٹ سنائی دیتی ہے۔ ڈرا کولا ہوا میں پگھل جاتا ہے۔ میں موت کے کمرے میں جھانک کر دیکھتا ہوں۔ وہاں نہ وہ پلنگ ہے' نہ خون سے بھری ہوئی سلفچی' نہ دوائیں نہ اکتائی ہوئی آنکھیں' نہ موت کا خاموش انتظار' وہاں کچھ نہیں۔ کم از کم مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔ باہر کے برآمدے میں اونچی ایڑیوں کی کھٹ کھٹ ابھرتی ہے اور میں زینے پر اوپر بھاگتا ہوں۔ یکا یک میں کتنے خطرے میں گھر گیا ہوں۔ اب ہر طرف سے دھوپ حملہ کر رہی ہے۔ دروازے میں کنجی گھومتی ہے اور دروازہ چرچراتا ہے۔ مجھ پر لرزہ طاری ہوتا ہے۔ اور میں لرزے کو دبانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں اپنے کمرے میں بند ہو جاتا ہوں۔ کمرے میں بند ہوتے ہی میں ہر خطرے سے محفوظ ہو جاتا ہوں۔ یہاں بہت مانوس سی بو بسی ہوئی ہے۔ دیواروں پر میرے بنائے ہوئے ڈرائنگ اپنی تمام خباثتوں اور بھیانک پن کے ساتھ اینٹھتے' چکراتے ہیں اور مجھے گلے لگاتے ہیں۔ I am at home وہ سب منڈلا رہے ہیں۔ اور ہنس رہے ہیں۔ وہ بکھر رہے ہیں اور چیخ رہے ہیں۔ آنکھیں' جو نیزوں اور سانپوں سے بھرے ہوئے پاتال کی طرح ہیں' ہوا میں اپنے سیاہ پروں سے اڑ رہی ہیں۔ کٹے ہوئے بازو' کٹے ہوئے سر' بہتی ہوئی ناکیں' اندام نہانی میں ڈنک مارتے ہوئے بچھو۔ سب ہوا میں اڑ رہے ہیں' ایک دوسرے سے ٹکرا رہے ہیں اور ہنس رہے ہیں۔ میں گٹار اٹھا لیتا ہوں۔ میری انگلیاں جلنے لگتی ہیں۔ میری انگلیوں سے آگ ٹپکتی ہے۔ بوند بوند! اور گٹار کے جاگے ہوئے تاروں پر دوڑتی ہے۔ بوند بوند!

اونچی ایڑیاں بہت قریب آگئی ہیں۔ یہ کھٹ کھٹ مجھے ڈراتی ہے اور میں گٹار کے تاروں کی گونج کو بڑھا دیتا ہوں۔ اونچی ایڑیاں اپنے کمرے میں جاتی ہیں۔ پھر باتھ روم۔ پھر دروازے میں۔ پھر میرے کمرے پر۔ دستک۔۔۔ دستک۔۔۔ اور دستک۔ میں دروازہ نہیں کھولوں گا۔

نیپو۔۔۔ جانتے ہو تم کتنے دنوں سے کمرے سے نہیں نکلے ہو؟

میں اپنی انگلیوں کو اور تیز کر دیتا ہوں۔ لیکن اب اور زیادہ تیز گونج ممکن نہیں۔ میں گٹار پر

جھک جاتا ہوں۔۔۔۔اور کمرے میں اڑتے ہوئے ڈرائنگ بھی اپنی اپنی جگہ دیواروں پر چپک جاتے ہیں۔

ٹیپو۔۔۔۔دروازہ کھول دو۔

ٹیپو اٹھتا ہے۔۔۔۔ہانپتا ہوا اس کا رنگ زرد ہے۔ وہ دروازہ کھول دیتا ہے۔ دیکھتے ہو تمہارا کیا حال ہو گیا ہے۔ کیا اسی لئے میں اتنا دکھ جھیلتی ہوں۔ کتنا دکھ ماں! کیا دکھ کو کبھی ناپا اور تولا جا سکتا ہے؟ تم پوچھتے ہو کتنا دکھ۔۔۔۔ نو مہینے جب خون کی جیلی انسان کا دل بن کر دھڑکتی ہے' تو جانتے ہو ماں پر کیا بیتتی ہے۔ ماں مجھے ڈراکولا نے بایولوجی پڑھائی ہے۔۔۔۔ کون ڈراکولا ۔۔۔۔ کیا بتایا ہے اس نے؟ ماں کی آنکھیں کاجل سے بھر گئی ہیں۔ اور اب پتلیوں میں کسی چیز کا عکس نہیں ہے۔ ٹیپو چیونگ گم چبا رہا ہے۔ اس کا منھ ٹیڑھا ہو گیا ہے۔ اس کی کمر میں خم پیدا ہو گیا ہے۔ ٹانگوں اور سینے پر گھنے بال پسینے میں شرابور ہیں۔ وہ چٹخارے کے انداز میں ہنس رہا ہے۔ تم ہنستے ہو۔ تم کتنا گر گئے ہو۔ کچھ اندازہ ہے تمہیں۔ سب کچھ بکھر کر رہ گیا ہے۔۔۔۔ سب کچھ کس نے بکھیر دیا ہے ماں! وہ کاجل بھری آنکھوں سے' جس میں کسی چیز کا عکس نہیں ہے' ٹیپو کو گھورتی ہے۔ اس کے جبڑے تھکے ہوئے مینڈک کی طرح جلدی جلدی سانس لے رہے ہیں۔ وہ چبائے ہوئے چیونگ گم کو اپنی ہتھیلی پر تھوکتا ہے۔ آہستہ آہستہ تھرکتا ہے۔ پھر گلا پھاڑ پھاڑ کر گانے لگتا ہے۔۔۔۔ فریڈم! فریڈم! چیونگ گم کی گولی بناتا ہے اور پھر منھ میں رکھ لیتا ہے۔ گھن آتی ہے ٹیپو! تمہارے دل میں کوئی گرہ پڑ گئی ہے۔ میں اسے کھولنا چاہتی ہوں۔ تم جانتے ہو' سب مجھے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ میں اکیلی ہوں۔ اور جب تک گرہ نہ کھل جائے تم نہیں کھل سکتے۔ ٹیپو دیوانوں کی طرح قہقہے لگاتا ہے۔ اور دیواروں سے ٹکراتا ہے۔ وہ ایک بڑی سی پنسل اٹھاتا ہے۔ اس کی لکڑی کو دانت سے نوچتا ہے' سیاہ نوک پر تھوکتا ہے اور سامنے کی دیوار پر تیزی سے ایک لمبی ناک بناتا ہے۔ میلوں لمبی ناک۔ بار بار خطوط پر پنسل دوڑاتا ہے۔ ناک الجھتی جاتی ہے اور الجھتی ہوئی لکیروں سے ایک خوف زدہ شکل ابھرتی ہے۔ جس طرح منھ کھلا ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے چیخ کانٹے دار گیند کی طرح گلے میں پھنس گئی ہے۔ پن کشن ایک بار گلے میں پھنس جائے تو نہ اگلا جائے نہ نگلا جائے۔ لیکن پن

کشن گلے میں پھنسے کیوں۔ وہ صبح سے شام تک لکیریں کھینچتا رہتا ہے اور لکیروں پر لکیریں ڈالتا رہتا ہے اور وقت ان لکیروں کے جال میں نہیں آتا۔ ماں دروازے میں کھڑی انتظار کرتی رہتی ہے۔ اس کے انڈرویر سے کیسی بدبو اٹھ رہی ہے۔ مگر وہ انتظار کرتی رہتی ہے۔ وہ جائے گا اور نہائے گا۔ وارڈروب سے صاف چمکتی ہوئی لندن والی قمیض نکالے گا۔ نیا انڈرویر پہنے گا اور اس پر نیلی پتلون کا زپ زن سے کھینچے گا۔ گھنگریالے بالوں کو چوڑے کنگھے سے گردن تک سجائے گا۔ قیمتی سگریٹ کو ہونٹوں میں دبائے گا۔ صبح کو کالج جائے گا اور شام کو بیڈمنٹن کھیلے گا۔ ماں کے ساتھ کافی پیئے گا اور جب اس خوبصورت ادھیڑ عورت کے دوست ڈرائنگ روم میں اسے بھی وہسکی آفر کریں گے تو وہ ایڑیوں پر گھومے گا اور بڑی فراخ دلی سے انکار کر دے گا۔ نہیں میں تو کوک پیوں گا۔ اور پڑوس کے گھر میں جا کر امیر خاندان کی بددماغ لڑکی کو شیشے میں اتارے گا۔ رات کو سونے سے پہلے ماں کو غیر ملکی رسالوں میں پڑھے ہوئے جوک سنائے گا۔ دونوں ہنسیں گے۔ پھر ماں کو جماہیاں آئیں گی۔۔۔۔ ٹیپو اشارے کو سمجھ جائے گا اور بیڈلیمپ کا بٹن دبا کر اپنے کمرے میں چلا جائے گا اور رات گئے تک کورس کی کتابیں پڑھے گا اور خوبصورت ادھیڑ عورت دوبارہ بیڈلیمپ روشن کرے گی اور اپنے عاشق کے تازہ خطوط پڑھے گی اور سر دھنے گی۔ تھک رہا ہے خبیث تھک رہا ہے۔ لیکن بے چارہ کیا کرے۔ مجبور ہے۔ اس کی بھی اجنبی وابستگیاں ہیں۔ ہم دونوں انوکھی ہستیاں ہیں۔ لیکن زمانہ ہر انوکھی ہستی کو کسی نہ کسی ڈراکولا کے حوالے کر دیتا ہے۔ مگر اب کیا ہو سکتا ہے۔ جھک مارو۔ دو چار ہم آغوشیاں' دو چار بغل گیریاں' دو چار ہوٹل بازیاں' جھیل میں دو چار کشتی رانیاں' جھولوں میں دو چار پینگیں' دو چار بوتلیں شراب کی' پھر تھکن' پھر فرار۔۔۔۔ یہ سارا تجربہ کیا ہے۔ لگتا ہے عاشق کے مصنوعی دانتوں کے سٹ کو گلاس میں ڈوبا ہوا دیکھ رہی ہوں اور کیا۔۔۔ اور کیا۔۔۔ قصہ ختم۔ بیڈلیمپ جلتا رہتا ہے' آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ نیند آتی ہے تو گہری نیند آتی ہے اور سوتے میں زندگی کا لمبا سفر طے ہو جاتا ہے۔

جانتا ہوں' ماں' کس بات کا انتظار ہے تمہیں۔ ہوا یہ ہے کہ ڈراکولا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے اور میں صاف دیکھ سکتا ہوں۔ سفید آپریشن ٹیبل پر تم پڑی ہو۔ یہ سفیدی مجھے اپنے باپ کے کفن کی یاد دلاتی ہے۔ ایک خوبصورت عورت آپریشن ٹیبل پر پڑی ہے' اس کی ٹانگیں پھیلی

ہوئی ہیں اور سرخ سرخ جیلی بہہ رہی ہے۔ میں بہہ رہا ہوں۔ یکایک جیلی کی آنکھ کھل جاتی ہے اور ڈراکولا ڈاکٹر کے کان میں کچھ کہتا نظر آتا ہے۔ ڈراکولا اپنی لکیر دار پیشانی سے پسینا پونچھ رہا ہے۔ اس کے ہونٹ سوکھے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر اپنے دستانے اتار دیتا ہے اور سرخ جیلی واپس ناف کے جال میں چلی جاتی ہے اور صدیوں بعد میں روشنی میں تیرتا ہوں تو روتا ہوں اور ہنستا ہوں اور روتا ہوں۔

"So you know Mom?"

میں کیوں روتا ہوں' میں کیوں ہنستا ہوں۔ تم انتظار کر رہی ہو۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تم تھک رہی ہو۔ پہلے کبھی تم نے کسی کا کسی چیز کا انتظار نہیں کیا۔ تمہیں فرصت ہی کہاں تھی۔

گھر پر رات کا سناٹا چھا گیا ہے۔ بلیاں بوڑھی ہوگئی ہیں۔ کتے اپنی کھال نوچ نوچ کر مر چکے ہیں۔ خوبصورت ادھیڑ عورت' لیمپ کی جھریوں بھری روشنی میں لیٹی ہوئی سگریٹ پی رہی ہے اور پلان بنا رہی ہے۔۔۔۔ اگر میں پلان نہ بناتی تو یہ سب کچھ نہ ہوتا۔ میں نے وقت کے دریا کو اپنی پلاننگ سے نہ پاٹا ہوتا تو مجھے اس طرح سگریٹ کے مرغولے بنانے کی' ٹھنڈی آہیں بھرنے کی' فرصت ہی کہاں ملتی۔ اب چین ہی چین ہے' جو کچھ زندگی نے مجھے دینے سے انکار کیا میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کے ہاتھ سے چھین لیا' میں نے پلاننگ کی اور ڈراکولا کے دانت توڑے۔ کسی ڈینٹسٹ کے یہاں جانے کی ضرورت بھی نہیں پڑی' میں نے پلاننگ کی اور عشق کیا' میں نے پلاننگ کی اور سب کو اپنے اپنے راستے پر ڈالا۔ سب اپنے اپنے راستے پر چل پڑے اور اب میں یہاں چپ چاپ' تمباکو کی خوشبو بھرے سناٹے میں اپنی فتوحات کے بارے میں سوچ سوچ کر جگالی کر رہی ہوں۔ سارے بے وقوف مجھ سے جل رہے ہیں۔ ایک تم ہو جو مجھ پر ترس کھا رہے ہو۔

کچھ ہو رہا ہے۔ رات ہے۔ سناٹا ہے۔ جیسا ہر رات ہوتا ہے۔ پھر بھی کچھ ایسا لگتا ہے کہ آج کی رات باقی تمام راتوں سے الگ ہے۔ آؤ چلیں۔۔۔۔ نیچے چلیں۔ رات ڈھل چکی ہے' اب کون ہوگا۔ موت کے کمرے میں جھانک کر دیکھ چکا ہوں۔ جنازہ جا چکا ہے اور وہاں کچھ نہیں ہے۔ کوئی نہیں۔ لاش بھی نہیں۔ ماں کے کمرے میں بیڈ لیمپ بجھ چکا ہے۔ جانی واکر اپنا کام

کر رہی ہے۔ اب کوئی نہیں جاگے گا۔ صبح تک کسی کی آنکھ نہیں کھلے گی۔ زینہ کتنا لمبا ہو گیا ہے۔ اترتا ہی چلا جا رہا ہے۔ میری ٹانگوں کو گرم ہوائیں چاٹ رہی ہیں۔ اور کوئی ٹھنڈے ناخنوں سے میرے سینے کے بالوں کو کھرچ رہا ہے۔ سوکھی ہوئی گھاس کی طرح۔ مارو گولی۔ چلتے ہیں۔۔۔۔ اور نیچے چلتے ہیں۔ ڈرائنگ روم میں بڑی ہلچل ہے۔ دیکھیں۔ کونے میں فریج پر بیٹھی بلیاں جماہیاں لے رہی ہیں۔ سائے ایک دوسرے میں مدغم ہو رہے ہیں۔ میز پر کھانا لگا ہوا ہے' سب آخری گھونٹ پیتے ہیں۔ اور میز کی طرف آتے ہیں۔ مدھم روشنی میں بلیاں جماہیاں لیتی رہتی ہیں اور کتے میز کے نیچے بیٹھے دم ہلا رہے ہیں۔ کوئی انہیں نہیں دیکھتا۔ سب اپنی دم ہلا رہے ہیں اور کھا رہے ہیں۔ خوبصورت عورت' جس نے دھند لکے میں جھریوں کو مٹا کر اپنی دل ربائی بڑھالی ہے' موم بتی کی طرح جل رہی ہے۔ ڈراکولا چپ چاپ کونے میں کھڑا ہے۔ آج اس نے پوری شام نہ مٹانے کی بات کی ہے' نہ حاکم اعلیٰ کی مہربانی کی' اور نہ شادی کی دعوت کی' وہ چپ چاپ بیٹھا ان لوگوں کو دیکھتا رہا ہے جنہوں نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ اور اب خوبصورت عورت ہر بار پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لیتی ہے اور کہتی ہے "تم کو کھانے کی کیا ضرورت ہے۔ تم ویسے ہی بہت موٹے ہو۔" وہ مسکراتا ہے اور پھر کونے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ دائیں پانو کا جوتا اسے کاٹ رہا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے بیٹے کے جوتے پہنے ہوئے ہے۔ یہ حرکت اس نے محض اس دعوت کے لئے کی ہے۔ ڈرائنگ روم میں چلنا ہی کتنا پڑتا ہے اور جب منہ چلتا ہے تو جوتے نہیں کاٹتے۔ سب کھانا کھا کر' اور خوبصورت عورت کا ہاتھ دبا کر اور پھر ملنے کا وعدہ کر کے جا چکے ہیں۔ اب سناٹا ہے اور چاندنی کھڑکیوں سے اندر آ رہی ہے اور قالین پر پھیل رہی ہے۔ اس نے اب تک کھانا نہیں کھایا ہے۔ وہ سب کی پلیٹیں جمع کرتا ہے اور سب کی پلیٹوں سے ہڈیاں اٹھاتا ہے اور میز کے نیچے پھینک دیتا ہے۔ کتوں کے جبڑوں میں ہڈیاں ٹوٹ رہی ہیں اور خوبصورت عورت میوزک سن رہی ہے۔ خمار سے آنکھیں بند ہوئی جا رہی ہیں۔ تم ہڈیاں چبا رہے ہو۔ خوش ہو۔ اتنی بڑی دعوت اور اتنی ساری ہڈیاں۔ میں میوزک سن رہی ہوں اور تم کتوں کو ہڈیاں دے رہے ہو۔ ڈراکولا تم بہت احمق ہو۔ وہ تو ہوں۔ لیکن میں کیا کروں۔ میں جوٹھی ہڈیاں تو نہیں چاٹ سکتا۔ جو ہڈیاں میں نہیں چاٹ سکتا وہ کتے کیوں نہ چاٹیں۔۔۔۔ جب کتے جوٹھی ہڈیاں چاٹتے ہیں تو مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔

کبھی کبھی میرا جی چاہتا ہے کہ تمہیں بھی میز کے نیچے پھینک دوں۔ بکواس! مجھے میوزک سننے دو۔ تم جاؤ اور اپنے کتے بھی لے جاؤ۔ یہ کتے تو تمہارے ہیں۔ میں تو صرف ان کی دیکھ بھال کرتا ہوں۔ ماں کی سرخ ڈوروں والی آنکھیں خمار کے اجالے میں چمکتی ہیں۔ وہ اٹھتی ہے اور اوپر چلی جاتی ہے۔ میں احتیاطاً موت کے کمرے میں جھانک کر دیکھتا ہوں۔ وہاں کوئی نہیں ہے۔ وہاں نہ اندھیرا ہے' نہ اجالا۔ ڈراکولا سر جھکا کر اور تحریم باندھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔

ٹیپو اور ماں صدیوں بعد' رات کے کھانے پر میز کے دو سروں پر بیٹھے خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔

ماں نے سوپ کا پیالہ' جس سے لچھے دار بھاپ اٹھ رہی تھی' بیٹے کی طرف بڑھایا۔ بیٹے نے پیالہ اس کے ہاتھ سے نہیں لیا۔ ماں کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔

ماں نے سوپ کا چمچہ منھ میں لیا اور کہا :

"کتنے عرصے بعد ہم انسانوں کی طرح ایک ہی میز پر کھانا کھا رہے ہیں۔"

ٹیپو نے تھوڑی کھجائی اور کوئی جواب نہیں دیا۔

"تم کم عمر ہو' مگر گہرے ہو' تم جینئس ہو میری طرح۔ باقی سب گھاس نکل گئے۔"

ٹیپو نے تھوڑی کھجائی اور کوئی جواب نہیں دیا۔ سوپ کے پیالے کو اور دور کھسکا دیا۔

"کیوں' تم سوپ کیوں نہیں پیتے؟"

"بو آتی ہے۔"

"بو؟ کاہے کی بو؟"

"تازہ خون کی۔"

"پگلے۔۔۔۔۔ مرغی کا سوپ ہے۔"

"مرغی کا خون تازہ نہیں ہوتا کیا؟"

ماں اور بیٹے کی آنکھیں اوپر اٹھیں۔

"ماں جب ڈراکولا مر رہا تھا تو تم کہاں تھیں؟"

ماں کی آنکھیں بجھ جاتی ہیں اور ہونٹ بھنچ جاتے ہیں اور چمچہ ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے۔

"Pig! You are a bloody pig!"

"ماں تم کتنی نرم دل ہو۔ تمہارے ہونٹوں سے شہد ٹپکتا ہے۔ یہ ساری روشنی سورج کی نہیں تمہاری ہے۔"

"For once you are telling the truth!"

"ماں ڈراکولا بالکل گدھا تھا۔"

"تھا۔"

"اچھا ہوا ہم نے اسے دفن کر دیا۔"

ماں کھانے کی میز سے اٹھ جاتی ہے اور ڈرائنگ اور ڈائننگ روم کے درمیان ٹہلنے لگتی ہے' کبھی قالین پر' کبھی ننگے فرش پر۔

وہ یونہی اپنے طوفان کو دبانے کی کوشش کرتی رہے گی۔ پنڈولم بائیں سے دائیں اور دائیں سے بائیں ڈول رہا ہے۔ وقت گزرتا جا رہا ہے۔ اور اب میں کمرے میں زیادہ بند نہیں رہ سکتا۔ میں نے سب کر کے دیکھ لیا ہے۔ بات نہیں بنتی کسی چیز سے۔ میں جتنا ہاتھ پاؤں مارتا ہوں' دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہوں۔۔۔۔ وہ یکایک رک جاتی ہے۔ جیسے اس نے بیٹے کے دل کی گونج سن لی ہو۔

تم چرس' بھنگ' ایل ایس ڈی سب مزے چکھ چکے ہو۔ ہاں ٹھیک ہے۔ چکھ چکا اور اب تم تھک چکے ہو۔ ہاں تھک چکا۔ لیکن' موم' تمہیں یاد ہے۔ جب میں نیپال جا رہا تھا تو تم نے کیا کہا تھا۔ میرے لئے بھی لانا کوئی چیز۔ تب ہم دونوں ساتھ جائیں گے ٹرپ پر۔ اور ہم گئے تھے ایک ساتھ ٹرپ پر۔ اسی ڈرائنگ روم میں۔ اور ڈراکولا رات بھر ہماری نجات کے لئے دعا مانگتا رہا تھا اور روتا رہا تھا۔ جب گوا گیا تھا تو تم نے کہا تھا اور سچ کہتا ہوں میں تمہارا مشورہ نہیں بھولا۔ وہ وہاں کا بھیگا ہوا ٹھنڈا ساحل اور بکھری ہوئی بیئر کی بوتلیں! اور جب لوسی کی برتھ ڈے پارٹی میں جا رہا تھا تو تم نے کیا کہا تھا۔ Go my boy, go, enjoy yourself اور میں نے کہا تھا Mom! God bless you, Mom! کیا میں نے تمہیں مایوس کیا؟ نہیں بیٹے تم نے کبھی مایوس نہیں کیا۔ مگر اب کیا کر رہے ہو۔ وہ کیسے موم؟ تم اس دبے کو ڈراکولا کیوں کہتے ہو؟ وہ نحس بکرا۔ موم' تم میں بڑا سینس آف ہیومر ہے۔ تم نے اس کو پہچاننے میں بہت دیر کر دی'

موم۔ لیکن تم نے نہ جانے کتنی بار رورو کر اپنے جسم اور روح پر زخموں کے نشان دکھائے ہیں' وہ سب لمبے لمبے خون آلود دانتوں کے لگائے ہوئے تھے۔ ایسے دانت صرف ڈراکولا کے ہوتے ہیں۔

وہ پھر قالین پر اور کبھی ننگے فرش پر ٹہل رہی تھی اور ہاتھ مل رہی تھی۔ ٹیپو اٹھا۔ اس نے ماں کے سگریٹ کے پیکٹ سے سگریٹ نکالی۔ سلگائی اور ماں کے ہونٹوں میں تھما دی۔ ماں کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ وہ پھر ٹہلنے لگی۔ جب رکی تو اس نے دیکھا کہ وہاں ٹیپو نہیں ہے۔ وہ آہستہ آہستہ تھکے تھکے قدموں سے اوپر چڑھی۔۔۔۔ کمرے میں پہنچ کر اس نے بیڈ لیمپ جلایا۔ پرانے خط پڑھتے پڑھتے اس کی آنکھیں بوجھل ہو گئیں۔ ان باتوں میں کچھ نہیں ہے۔ بہلاوے کی باتیں۔

اس نے بیڈ لیمپ بجھا دیا۔ اور اندھیرے میں آنکھیں کھولے پڑی رہی۔ پیر سے پیر کو ملتی رہی۔ اس کی پیشانی پسینے سے بھیگ رہی تھی اور گلا خشک ہوا جا رہا تھا۔ کوئی پرندہ آن کر چھت پر گرا۔ تھوڑی دیر کو پھڑ پھڑایا۔ پھر خاموش ہو گیا۔ بلی نے دبوچا ہو گا۔ کبوتر۔ بے چارہ۔۔۔۔ سیانی بلی۔۔۔۔ بڑھیا' چڑیل۔

وہ اٹھی اور کھڑکی پر گئی۔ دور دور تک اندھیرے میں خاموشی کے جال چمک رہے تھے۔ ریلوے اسٹیشن کی روشنیاں جگ مگا رہی تھیں۔ گورستان کے درختوں میں بھی سناٹا تھا۔ کہیں دور الو چیخ رہا تھا۔ گھر کا پہلو والا دروازہ کھلا اور کوئی نکلا۔ سائے نے احتیاط سے دروازہ بند کیا' کھڑا کھڑا کچھ سوچتا رہا اور آہستہ آہستہ چلتا ہوا پھاٹک سے نکلا اور گورستان کی طرف مڑ گیا۔

یہ ڈراکولا کے لئے جان دیئے دے رہا ہے۔

آہستہ آہستہ سایہ گورستان کے سایوں میں کھو گیا۔ وہ اسی طرح کھڑی اس کے واپس آنے کا انتظار کرتی رہی۔ سایہ واپس نہیں آیا۔ کمرے میں روشنی بھر گئی۔ اس کی آنکھوں میں اندھیرا چھایا رہا۔ دور ٹیلے پر سایہ ابھرا اور اس راستے پر غائب ہو گیا جو اسٹیشن کی طرف جا رہا تھا۔

اس نے زور سے کھڑکی بند کر دی۔ اسے اپنے بیڈ لیمپ کے پاس وان گوخ کے ایک کارڈ

پرنٹ پر، جس پر پل کی تصویر چھپی تھی، کچھ لکھا ہوا نظر آیا۔

ٹیپو کی آواز گونج رہی تھی۔

"موم ـــ گورستان سے گورستان تک کا فاصلہ بہت کم ہے۔ ایک قدم۔ میں نے جو راستہ چنا ہے، بہت لمبا ہے، بہت دور جاتا ہے۔"

ماں دیر تک کارڈ کو دیکھتی رہی۔ سامنے کا کمرا کھلا تھا۔ کھڑکی بھی۔ اس میں دھوپ بھری ہوئی تھی۔ اور دیواروں پر بنائے ہوئے ڈرائنگ لکیروں کے جال میں سانس لے رہے تھے۔

"جاؤ ـــ جاؤ ـــ لوٹ کر یہیں آؤ گے۔"

ٹیپو نے بھاگتی ہوئی گاڑی کی کھڑکی پر سر رکھ دیا۔ ہوا اس کے بالوں کو نوچنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد، اسے محسوس ہوا کہ اس کا سر کٹ کر ہوا میں اڑا چلا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور صدیوں بعد اس کے ہونٹوں پر جو مسکراہٹ ابھری، اس کا بوجھ اسے محسوس نہیں ہوا۔

○

دھان کٹنے کے بعد

نیم کا درخت کسی بوڑھے سادھو کے گچھوں سے بھرے ہوئے سر کی طرح ہل رہا تھا۔

''موہنا راجہ۔ راجہ بیٹا۔ آجا۔''

منگرا کے کتے نے ایک بھرپور جمائی لی۔ اس کا منہ دیر تک کھلا رہا۔ اس کے تیز نکیلے دانتوں کی باڑھ جھلک پڑی۔ اس کے حلق کا گوشت 'لال' نرم 'پسیجتا ہوا گوشت نظر آنے لگا۔ منگرا نے لکڑی کا ٹکڑا اس کے کھلے ہوئے منہ میں ڈال دیا۔ موہنا چیختا ہوا تڑپا اور اچھل کر نیم کے سائے میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

''موہنا راجہ' روٹھ گیا ہے' اچھا اب آجا' اب کچھ نہیں کروں گا۔ چو چو چاہ۔'' منگرا اپنے موہنا کو چمکارتا رہا۔ لیکن وہ نیم کے سائے میں ڈٹا رہا۔ وہاں سے ایک قدم ہٹنے کا اس میں ارادہ بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ البتہ اس نے دو تین بار منہ پھاڑ کر اور مہین سے سر میں قوالی گا کر ایک پیار بھرا شکایتی احتجاج ضرور کیا۔

منگرا کے موٹے بھرے ہوئے ہونٹوں پر ہنسی دوڑ گئی۔ اس نے اپنی تھل تھل بھدی گول رانوں کو تھپتھپایا۔ پسینہ پونچھا اور پورب کے افق کو گھورنے لگا۔ جیسے اسے کسی چیز کے طلوع ہونے کا انتظار تھا۔ دھوپ سیال چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ کھیتوں میں دھول اڑ رہی تھی۔ لو کے لپیٹ سے بچنے کے لئے مویشی چھاؤں میں پناہ لے کر بیٹھے تھے۔ سوکھے ہوئے نالے کے پاس آم کے باغ میں گوالوں کے چھوکرے ڈول پتہ کھیل رہے تھے اور چھوٹے چھوٹے ننگے لڑکے اور لڑکیاں سور کی طرح زمین پر لوٹ رہے تھے۔

وہ چھپر کی اوٹ میں بیٹھا اپنی بیوی کا غصہ رینڈی کی کچی شاخ کے ٹکڑے پر اتار رہا تھا۔ وہ اپنی عورت سے لڑنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن ادھر پچھلے چند دنوں میں کئی بار سکری سے اس کی لڑائی ہو گئی تھی۔

اس کی ضد سے وہ عاجز آ گیا تھا۔

"میری چاندی کی ہنسلی لادو۔ کانا میری چاندی کی ہنسلی کھا جائے گا۔ کانا بنیا نہیں راکھشش ہے۔ آج لادو آج، نہیں تو چولھے پر ہانڈی چھوڑ میں چلی۔۔۔۔۔ یہ جا وہ جا، ہوں، اوں، اوں۔۔۔"
وہ آنچل کا کونا چبا رہی تھی اور دھیمے دھیمے آہنگ کے ساتھ گنگنا رہی تھی۔

"دھت تیری سسری ہنسلی کی ایسی کی تیسی۔ ایسی ایسی جانے کتنی ہنسلیاں موت میں بہہ گئیں سالی۔۔۔۔ چلی جائے گی۔ دھونس چلے گی کسی اور پر۔ چلی جائے گی۔ کوئی سالا پوچھنے نہیں آتا۔ کہاں تو چلی جائے گی۔ رک مت ہاں۔"
"میرا بھائی جب تک جیتا ہے تو واہی تباہی منہ سے نہیں نکال سکتا۔ مریں تیرے ہوتے سوتے ہاں۔"

اس کی عورت سکری نے سانس پھلا کر اپنی ساری کو کمر میں اڑس لیا۔ جیسے دوسرے ہی لمحے وہ اکھاڑے میں اتر جائے گی اور منگرا کو دھان کے گانٹھ کی طرح کندھے پر اٹھا کر زمین پر دے مارے گی۔ "بس جیبھ ہی تو اتنی لمبی ہے۔ کام کچھ نہیں ہوتا نکما۔ نکھٹو۔ ہوتھ تھوتھ۔"

منگرا کا غصہ آگ کی طرح لہک اٹھا۔ اس نے سکری کی چپڑ چپڑ بند کرنے کے لئے اس کو جھنجھلاہٹ کے ساتھ پیچھے دھکیل دیا۔ سکری بھنائی ہوئی اٹھی اور اس نے اس کے کڑیل بھرے بھرے گٹھیلے بازو کو کاٹ کھایا۔ راموں نے تڑپ کر اس کے منہ پر ایک بھرپور تھپڑ جڑ دیا اور اپنے بازو کو ملتا ہوا باہر چلا آیا۔ اس کا سینہ اندر ہی اندر جلنے لگا۔ اس نے پہلی بار سکری کو جسمانی چوٹ پہنچائی تھی۔ بات کا بتنگڑ پہلے کئی بار بن چکا تھا۔ لیکن طمانچہ بازی تو پہلی بار ہوئی تھی۔ اس کو اس کا بڑا پچھتاوا تھا۔ اس کے ضمیر میں ایک دہکتا ہوا بلیڈ دوڑ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک زخمی پرندے کی اداسی پیدا ہو گئی تھی۔ جس کی تہہ میں آنسو صاف جھلک رہے تھے۔

سورج پچھم کے چمکیلے نیلے آکاش سے ٹوٹ کر نیچے سرکتا جا رہا تھا اور پورب کے آکاش کے کنارے کا رنگ پھیکا پڑنے لگا تھا۔ منگرا کی نظریں پھیکے پھیلتے ہوئے دھبے پر گڑی ہوئی تھیں۔ منگرا کا خیال گونجنے لگا۔

تھوڑی دیر میں رت بدل جائے گی۔ ہوا کا رخ' ہوا کی چال' ہوا کا دباؤ۔ ساری آنے والی باتوں کا راز کھول کر رکھ دیتا ہے۔ کوئی چیز چھپی نہیں رہ سکتی۔ یہ دھوکہ نہیں ہے۔ تھوڑی دیر میں یہی پھیکے' گہرے ہوتے اور پھیلتے ہوئے دھبے بادلوں کے کالے کالے' اجلے اجلے' میلے میلے پہاڑوں' ہاتھی کے پیکروں' سونڈوں اور محلوں میں بدل جائیں گے اور پھر یہ موٹی موٹی بوندیں ٹپ ٹپ گرنے لگیں گی۔ کھیت' نالے' منڈیریں' بیلیں' چھپر' نیم' شہتوت اور برگد کے درخت کے ساتھ ساتھ یہ سالا موہنا بھی نہا کر مست ہو جائے گا۔ ابھی تو اس کے بدن سے پسینہ چھوٹ رہا تھا۔ تھوڑی دیر میں ساری دھرتی پسینے میں نہا جائے گی۔

دیکھو۔ دیکھو!

وہ گھرے بادل۔ وہ اڑیں گھٹائیں۔ وہ ٹپکیں بوندیں۔ گولیوں کی طرح سیٹی بجاتی ہوئی' گاتی ہوئی۔ سانس لیتی ہوئی دھول کیچڑ بن گئی۔

کھجور کی ڈاڑھی سے پانی ٹپکنے لگا۔ چھپر سے پانی کا ریلا۔ پانی کی کئی دھاریں دھڑلے سے زمین پر گر رہی تھیں اور اپنی مسلسل چوٹ سے گڑھا سا بنا دیتی تھیں۔ بلبلے بنتے۔ گول گول آنکھیں چمکاتے اور ٹوٹ جاتے۔ کھیت نہا کر ہشاش بشاش مسکرانے لگے۔ ایک انوکھا نشہ۔ ایک عجیب خوشبو پھیل گئی۔ یہ خوشبو' ابٹن' عطر اور تیل میں لپٹی ہوئی نئی نویلی دلہن کے پسینے کی خوشبو چرا کر لے آئی تھی۔ ہاہاہا۔ کیسی رت بدل گئی۔ کیسی بہار آگئی ہے موہنا راجہ۔۔۔۔ ہاہاہا۔ دیکھتا ہے کچھ۔ یہ لو! یہ تو آنکھیں ٹمٹماتا ہے۔ جماہیاں لیتا ہے۔ رنگ پر مجاج۔ کیوں بے اور جو سردی گرمی ہو گئی تو تیری تائی آئے گی کہیں سے تیمارداری کرنے۔ میں تو اب کچھ نہیں کروں گا۔ میری محنت کا زمانہ آگیا۔ اب میں ہوں اور ہل بیل۔ چوکی اور پھارنی۔ ارے او موہنا کے بچے۔ اب کے اپنا کھیت دیکھنا ضرور ہے۔ سمجھا کچھ۔ ہائیں؟"

سکری ٹٹی سے لگی منگرا اور موہنا کی خاموش بات چیت کو سنتی رہی۔ دھول پانی سے بھیگ

کر بیٹھ گئی تھی۔ اب پانی کا دھواں تھا۔ کھیتوں میں جلتی ہوئی گرد کے بگولوں کا ناچ دفن ہو گیا تھا۔ ہوا سے لو کی جلن اور اس کی تیزابی کیفیت آہستہ آہستہ مٹ رہی تھی۔

منگرا نے پلٹ کر سکری کو دیکھا۔ مسکرایا۔ رانیں تھپتھپائیں اور الاپ لے کر لگا گانے۔

ہو ہو ہو او'

ہو رانی' ہو رانی'

کاگا ہو کاگا۔

بدرا ہو بدرا

کارے ہو کارے۔۔۔۔ ہو ہو ہو ہوا

اور ادھر رانی کا منہ پھول گیا۔ رانی نے اپنی ساڑی کو اٹھا کر کمر میں اڑس لیا۔ اس نے کدال اٹھائی اور دروازے پر جمع ہوتے ہوئے پانی کا راستہ کاٹنے لگی۔ تا کہ پانی راستے میں نہ گھسے اور گلی کی طرف منہ نکال کر بہہ جائے۔ وہ بھیگتی رہی اور کدال چلاتی رہی۔ سکری کا سر' اس کے پیلے ڈھیلے بازو۔ اسکی بھری بھری کپکپاتی نائی نائی ٹانگیں جو گھٹنے کے اوپر تک ننگی تھیں۔ پانی میں بوتھ ہو گئی تھیں۔ لیکن سکری کا پیلا' نرم اور اداس چہرہ چمکنے لگا تھا اور اس کی بلی جیسی گول گول آنکھوں میں تو دیپ سے جل اٹھے تھے۔ پانی کے برستے ہی کھیتوں میں' درختوں میں' پنکھ پکھیروؤں میں' نیم' شیشم اور جھلسے ہوئے کنوئیں کے پاس کیلے کے چوڑے داغدار پتوں میں۔ اور گولر کے پیڑ پر بیٹھی ہوئی بھیگے ہوئے پر جھاڑتی سرمئی فاختہ میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی تھی۔ ایک نئی بیداری جیسے ان کی رگوں میں خون نہیں کوئی گیت دوڑ رہا تھا۔ منگرا نے اٹھ کر کدال سکری سے لے لی اور خود پانی کی نکاسی کا راستہ بنانے لگا۔ تین ہی چار بھرپور ہاتھ کے بعد پانی کا ریلا لنگوٹی چھوڑ کر بھاگتے ہوئے شریر چھوکرے کی طرح اچھلتا کودتا گلی کی طرف دوڑنے لگا۔ منگرا کے بازوؤں میں بڑی چھوٹی مچھلیاں ابھر آئی تھیں اور سکری کی ساڑی بھیگ کر اس کے بدن سے چپک گئی تھی۔ اس کے میلے بال پیشانی اور گردن سے لپٹے ہوئے تھے۔ جیسے پیلے کاغذ کے گلدستے پر کسی نے پنسل سے دھوئیں کی لکیریں پھیلا دی ہوں۔ موہنا اس کے داہنے پیر کی پنڈلی کو چاٹ رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ ان کے درمیان صلح ہو

گئی تھی۔ برسات کے پہلے چھینٹوں نے پچھلے چند دنوں کی گھٹن اور تلخی کو دھو دیا تھا۔ سکری نے موہنا کا کان مروڑ دیا۔ وہ سعادت مندی کے ساتھ دم ہلاتا ہوا اسی طرح سر جھکائے اس کی پنڈلی سے شہد چاٹتا رہا۔ اس نے منگرا کی طرف دیکھا۔ پھر اپنے بدن کی طرف اور گردن مٹکائی اور بے وجہ کمر ٹٹولتی ہوئی دروازے کے اندر چلی گئی۔

"کیوں رے موہنا۔۔۔۔۔اب کے برس برسات بڑی دیر سے آئی' دیکھ تو کیسا رنگ بدل گیا دھرتی کا۔ یہ جلے مرے پیڑ گنگنا اٹھے نا۔ یہ چین جاگ پڑی۔ اور بھی کچھ دیکھا تونے۔۔۔۔۔بتا بتا۔۔۔۔۔ہی ہی ہا۔ یہ سالی سکری کیسی رات کی رانی کی طرح مہک اٹھی ہے۔" وہ دل ہی دل میں موہنا سے باتیں کرتا رہا اور موہنا ایک فرمانبردار شاگرد کی طرح زانو تہہ کیے سنتا رہا۔

رات بھیگی ہوئی تھی۔ چھپر سے اب تک پانی ٹپک رہا تھا۔ آسمان پر بادلوں کا خیمہ تر بتر ہو گیا تھا۔ چاند کا سونا پگھلا پگھلا بادلوں کو اجالتا ہوا بہہ رہا تھا۔ سکری چٹائی پر بیٹھی منگرا کے پیر دبا رہی تھی۔

"سکری میری ٹانگیں نہیں دکھتیں۔۔۔۔۔سویرے سویرے کھیت پر جانا ہے نا۔ اب تو سو جا مجھے یہ نہیں اچھا لگتا۔۔۔۔۔ایں۔"

سکری نے پیر دبانا چھوڑ دیا اور اس کے پاس ہی بھیگی بلی کی طرح سو رہی۔ ہوا کی نمی اور سبک ہو گئی تھی اور چاند بادلوں کے درمیان سفر کر رہا تھا۔ چھپر سے اب بھی تھوڑی تھوڑی دیر بعد پانی کا کوئی قطرہ ٹپک جاتا تھا۔ اس سناٹے میں پانی کی بوند کی آواز پیدا ہوتی۔ یا کبھی کبھی موہنا کی جماہی کی آواز۔

منگرا کی آنکھیں کھلیں اور بند ہوگئیں اور اس کے نتھنے پھڑکے اور اس نے اپنے پھیپھڑوں میں بھور کی صاف' خنک اور سوندھی ہوا کو بھر لیا۔ اس ہوا میں بھیگی ہوئی زمین' پیڑ پودے اور سکری کے پسینے کی ملاوٹ نے نرالی خوشبو پیدا کر دی تھی۔ سکری منگرا کے پہلو سے اٹھ کر بھور کے دھندلکے میں باہر نکل گئی۔ موہنا اٹھا۔ وہ اپنی دونوں ٹانگوں کو پیچھے دبا کر اور اپنے پورے بدن کو تان کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی پیٹھ جھک گئی۔ لمبوترا منہ آگے کو نکل آیا۔ دم دونوں ٹانگوں کے درمیان گھس گئی۔ اس نے منہ چیر کر ایک زوردار جماہی لی۔ اس کا منہ بالکل منگرا

کے قریب آ گیا تھا۔ اس کی اچانک چھینک سے پانی کی پھوار اڑی اور منگرا کے چہرے پر پھیل گئی۔ وہ اچھل کر اٹھ بیٹھا۔

"دھت تیری ماں کی۔۔۔۔ سالا میرا ہی منہ رہ گیا ہے چھینک مارنے کو۔۔۔۔"

منگرا کو ایک نیا تجربہ ہوا۔ یہ صبح پچھلی صبحوں سے مختلف تھی۔ وہ شاید اس صبح کا بہت دنوں سے انتظار کر رہا تھا۔ اب کے برسات نے آنے میں بہت دیر کی۔ اتنی دیر کہ کتنی آنکھیں افق اور آسمان کو تاکتے تاکتے پتھرا گئیں۔

منگرا سوچتا اگر اس سال برسات نہ آئی تو کتنا برا ہو گا۔ کھیت' درخت' مویشی' آدمی سب ہی جل جائیں گے۔ مر جائیں گے۔ نہ بیج بوئے جائیں گے۔ نہ دھانی موریاں لہرائیں گی۔ نہ کٹنی ہو گی۔ نہ گیت گائے جائیں گے۔ نہ رات کے سناٹے میں جھینگروں کی چیخ کو دبا کر جھوم کر فضا میں ابھریں گے۔ اُمڈیں گے۔ ترسیں گے اور چھا جائیں گے۔ کیسی مردنی آئے گی' فاقہ آئے گا۔ اکال' گدھ اور چیل آدمی کے گوشت سے اپنی چونچ بھر کر ہوا میں اڑتے پھریں گے۔ اوہ! وہ ایسی ہولناک باتیں سوچ سوچ کر تھک گیا تھا۔ وہ چڑچڑا ہو گیا تھا۔ اسی چڑچڑے پن میں وہ اکثر سکری سے الجھ پڑتا اور کئی کئی دن تک دونوں ایک دوسرے سے خفا رہتے۔

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔

پوری بستی وقت سے پہلے ہی جاگ گئی تھی۔ گاؤں کے دوسرے کونے سے بھی ہانک لگانے کی آواز آ رہی تھی۔ اس طرف گوالوں کا ٹولہ تھا۔ اتری ٹیلے پر باہمنوں اور راجپوتوں کے کئی مکان تھے۔ ان کی تعداد بہت کم تھی۔ لیکن ان کی کھپریل سے ان کی خوشحالی کا پتہ چلتا تھا۔ ان کی لاٹھیوں کی اچھی دھاک تھی۔ کہاروں کا ٹولہ دکھن کی طرف تھا۔ وہاں پر ایک گندے جوہڑ کی کیچڑ میں سور اور مرغیاں لت پت ہوتی رہتی تھیں۔ ان سوؤروں' مرغیوں اور بطخوں کے بیچ ان کہاروں اور مسہروں کے ننگے' کالے کلوٹے' سیاہ روئی کے گالوں سے بنے ہوئے گول مٹول سے بچے کھیلا کرتے تھے۔ ان کی ناک اور آنکھوں سے پیپ بہتی رہتی۔ ان کے گھٹنوں اور کہنیوں تک کیچڑ اور دھول لپٹی رہتی۔ وہ اپنی بے خیالی اور موج میں اپنے ہاتھوں کی کیچڑ' اپنے سر' اپنی ناک اور منہ میں لپیٹ لیتے تھے۔ وہ ایک دوسرے کو جسمانی اشاروں سے بری

بری طرح گالیاں بکتے اور جو کمزور پڑتا' دانت سے کاٹ لیتے۔ پھر یہ دانت کٹائی ان کے ماں باپ تک پہنچ جاتی اور زبردست شور اٹھتا۔ گردن کی رگیں پھول جاتیں۔ منہ سے کف جھڑتا اور ایک اچھا خاصا تماشہ ہو جاتا۔

منگرا کا جھونپڑا ٹھیک چھوٹے سرکار کے مکان کے پاس تھا۔ وہیں پر ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ جس پر کائی جمی ہوئی تھی۔ جس کے دو بوسیدہ مینار دعا کے لئے اٹھے ہوئے دو نامراد ہاتھ نظر آتے تھے۔ وہ چھوٹے سرکار کا کمیا تھا۔ اسے چھوٹے سرکار کی کمیوٹی اپنے باپ کے جھونپڑے کی طرح ورثے میں ملی تھی۔

وہ جب ہل کندھے پر ڈال کر اپنے جھونپڑے سے نکلا تو اس نے دیکھا کہ موہنا اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اس نے پلٹ کر اس ٹیلے کی طرف دیکھا جس پر ایک کالی بھینس بندھی رہتی تھی۔ چند مہینے پہلے تک وہ اسی جگہ کھڑی نظر آتی تھی۔ پر آج وہ جگہ خالی تھی۔ وہ اتنا مقروض ہو گیا تھا کہ اسے اس بھینس کو بیچ دینا پڑا۔ اب وہ صرف ہل رکھتا تھا۔ اس کے پاس ہل کھینچنے والی وہ اسودی دیو ہیکل قوت نہیں تھی' جس کو اہرے میں ڈال کر پانی سے دھوتے ہوئے وہ عجیب مسرت محسوس کرتا تھا۔ اس کے سینگوں کو دھوتے ہوئے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے بچے کی دو سوکھی ہوئی ٹانگیں دبا رہا ہے۔ بھینس اس کی دونوں رانوں کے درمیان اپنا سر ڈال کر اتنے زور سے پھنکارتی کہ پانی کی چھینٹیں دور دور تک چمکتے ہوئے ذرات کی طرح اڑی چلی جاتیں اور اس کی گردن میں پڑا ہوا گھنٹیوں کا ہار مترنم گونج کے ساتھ بول اٹھتا اور بولتا رہتا۔

اس کا پرانا کبوتر خانہ بھی ویران تھا۔ اب اس میں صرف ایک جوڑا کبوتر کا رہ گیا تھا۔ اس کا کبوتر خانہ اس لئے ویران ہو گیا تھا کہ وہ چھوٹے سرکار کے شوقین لڑکے کو کبوتروں کا شکار کھیلنے سے نہیں روک سکتا تھا۔ کبوتری سفید تھی لیکن اس کا سر کالا تھا۔ اس کی آنکھیں تازہ خون کے قطرے کی طرح چمکتی رہتی تھیں۔ کبوتر کی گردن سفید تھی اور باقی حصہ کتھئی رنگ کا تھا۔ پیر سے اوپر کچھ سفید سی محراب بنی ہوئی تھی۔ دونوں کبوتر اڑے اور اس کے سر پر منڈلائے۔ کبوتری تو آگے نکل گئی لیکن کبوتر اس کے پھیلے ہوئے ہاتھ میں آ گیا۔ منگرا نے اس کی چونچ کو چوم لیا اور پھر اس کو ہوا میں ایک تڑپتی ہوئی زندہ گیند کی طرح اچھال دیا اور وہ بھی پر

پھڑ پھڑاتا ہوا مسجد کے فریادی میناروں کے اوپر اڑتا ہوا غائب ہو گیا۔

اب جھٹ پٹا ختم ہو گیا تھا۔ دھند لکے کی جھلملاہٹ پگھل کر روشنی میں بہتی چلی جارہی تھی اور اس کو اپنا کھیت صاف نظر آنے لگا تھا۔ جواہرے کے بائیں طرف ہتھیلی کی طرح اتھلی سطح پر بھیگا پڑا تھا۔ منگرا نے سوچا' اگر اس کا بھینسا ہوتا تو وہ ہل لے کر اپنے کھیت کی طرف چلا جاتا۔ اور پہلی پھارنی کر ڈالتا۔ ہل دودھ سے کٹتی ہوئی ملائی کی طرح ابھرتی اور گیلی لیک بناتی چلی جاتی۔ مٹی سے ایک نشہ سے بھری ہوئی سوندھی خوشبو نکلتی اور اس کی ایک ایک نس میں رچ جاتی۔ وہ خوشبو کبھی اس کو تاڑی کی یاد دلاتی اور کبھی سکری کے بدن سے نکلے ہوئے پسینے کی۔
اس کے قدم ڈیوڑھی کی طرف اٹھنے لگے۔
وہ چھوٹے سرکار کا کمیا تھا۔
اور سب سے پہلے چھوٹے سرکار کے کھیت کی پھارنی ہوگی۔ ہاں!
وہ اب برتن بھی چھوٹے سرکار کے لئے بناتا تھا۔ کچھ دوسرے چھوٹے زمیندار پاکستان چلے گئے تھے اور ان کی زمینوں پر قبضہ کر کے جو دوسرے لوگ زمیندار بن بیٹھے تھے' ان کی حالت نئے مسلمانوں کی تھی جو پیاز زیادہ کھاتا ہے۔ انہوں نے منگرا کو اس کھیت سے مٹی لینے کی ممانعت کر دی تھی' جس سے وہ برتن بنایا کرتا تھا۔ اس سے اس کی آمدنی کو ایک دھکا اور لگا تھا۔ البتہ چھوٹے سرکار کے لئے تو اسے برتن بنانا ہی تھا اور وہ اس کے لئے دور سے مٹی لے کر آیا کرتا تھا۔ ورنہ براہیل کی گالی اور وہ بھی بکری کو۔ وہ اس تو تو میں میں سے بچنا چاہتا تھا۔ وہ براہیل کی نیت کو اس کی گالیوں میں ننگا محسوس کرتا تھا۔ اسی لئے اسے اس کے چہرے سے بھی سخت نفرت تھی۔

منگرا کے آگے آگے تین اور کمیے سرجو' گوبند اور جھمیلا کندھوں پر ہل رکھے اپنے بیلوں کی جوڑیوں کو ہانکتے چلے جارہے تھے۔ دور تک کھیتوں میں ہلوں اور بیلوں کے دھبے ہلتے ڈولتے نظر آرہے تھے۔ بستی کے ٹھیک پچھم میں چھوٹے سرکار کا کھیت تھا۔ یہ کھیت اس علاقے کا سب سے اچھا کھیت سمجھا جاتا تھا اور کھیتوں میں اٹھارہ بیس من بیگھ دھان ہوتا تو سرکاری کھیت میں چالیس پینتالیس من بیگھ دھان ہوتا تھا۔ دکھن کی طرف بستی کے باہر قبرستان تھا اور وہاں

سے لے کر سرکاری کھیت کا تختہ لوئر پرائمری اسکول تک پھیلا ہوا تھا۔ جو اتر پچھمی کنارے پر واقع تھا۔

بادل پھر گھر آئے تھے اور بوندیں ٹپکنے لگی تھیں۔ آسمان کا مشرقی کنارا سرخ اور صندلیں پیشانی کی طرح جھلک رہا تھا۔ منگرا نے اپنے کالے اجلے بیلوں کی جوڑی کو چمکارا۔ ان کی موٹی موٹی گردن پر جواڈالا۔ ہل میں لوہے کی طرح چمکتا ہوا پھل پہنایا اور اپنے گمچھے کو سر پر لپیٹ اور ایک ہاتھ ہل کے مٹھر پر دھر افق کی طرف تاکنے لگا۔ اس کے بازو سخت ہو گئے۔ بیلوں نے اپنے سروں کو ادھر ادھر جھٹکا۔ زمین کے سینے میں لوہے کا پھل دھنسا اور دوڑنے لگا۔ کھیت کی مٹی چڑچڑائی اور منگرا کو لگا کہ زمین ہلکے ہلکے ٹھنڈے سانس بھر رہی ہے۔ اس کی سانسیں گرم ہو گئی تھیں۔ اس کی پیشانی پسیجنے لگی تھی۔ وہ ہل کو پکڑے ہوئے کھیت کی گردش لگا رہا تھا۔ دوسرے ٹوپروں میں بھی ہل دوڑ رہے تھے۔ ہر ایک طرف سے ایک ہی خوشبو' ایک ہی لے' ایک ہی تازگی ہمک ہمک کر اٹھ رہی تھی۔ کبھی کبھی چڑچڑاہٹ سے بھری ہوئی تکرار کی آواز بھی آتی۔

"ہیا ہیا۔۔۔۔ ہت تیری بہنی کی۔ مار ب ایک پینا لگو بالا میں ٹاپے۔۔۔۔ ہیا ہیا۔ ہرے با ۔۔۔۔ توری بہنی کی۔ بتی کریو اسار۔ دوسر پینا دیب۔ بھس دیکن بلبے اڑ جائی۔۔۔۔ ہیا ہیا ہرے ہاہہ۔"

کھیت کا سینہ چر تا رہا۔ مٹی کٹتی پھٹتی رہی۔ زمین سانس لیتی رہی۔ بیل جھوم جھوم کر چلتے رہے سر جھٹکتے رہے۔ کمیوں کے بدن سے چوتے ہوئے پسینے کھیت کی سوندھی مٹی میں جذب ہوتے رہے۔ بیل تھکتے رہے۔ زمین زخم کی طرح ہنستی رہی۔ کمیۓ جھکے جھکے بیلوں کو گالیاں بکتے رہے۔ ہوا بالکل تھم گئی۔ پتے ساکت ہو گئے۔ بادل جم گئے۔ پوربی افق بھی بادلوں سے چھپ گیا۔ بگلوں کی قطاریں ایک طرف سے دوسری طرف پرواز کرتی رہیں۔ دوپہر کے بعد موقع پاکر سورج نے اپنی کرنوں کا جال زمین پر پھینکا۔ لیکن بادل جم گئے اور جال سمٹ کر غائب ہو گیا۔ چھوٹے سرکار کی پرانی پر جلال عمارت ایک بوڑھے ہیبت ناک دیو کی طرح اپنی اندھی آنکھوں سے کھیت کو گھورتی رہی۔ وہاں کچہری میں بیٹھے ہوئے چھوٹے سرکار اور ان کے عملے والے موسم پر بات چیت کرتے ہوئے نئی کھیتی کے منصوبے باندھتے رہے۔ پتلی پتلی

گلیوں سے عورتیں چمکتی ہوئی پیلی تھالیوں میں کھانا لے کر کھیت کی طرف آئیں۔ بیل کھل گئے۔ ہل گر پڑے۔ کچھ قہقہے لگے کچھ پسینے پونچھے گئے۔ کچھ منہ بنے۔ کچھ ہونٹوں پر تھکن مسکراہٹ بن کر ابھری اور بادل گھنے ہو گئے۔ ہوا میں تلاطم پیدا ہوا۔ گھٹائیں زمین کی طرف لپکیں۔پانی برسنے لگا اور عورتیں اپنی چمکتی تھالیوں کو سر پر رکھ کر اپنی اپنی پتلی گلیوں کی طرف لوٹ گئیں۔ان کی ساڑیاں بھیگ گئی تھیں اور انہوں نے چھوٹے سرکار کے جلال وادب سے گھونگھٹ کاڑھ لئے تھے۔

کمیوں کے ارادے تازہ دم ہو کر بیلوں کی پیٹھ پر پھر چمکنے لگے۔پانی موسلا دھار برسنے لگا۔ بادل اتنے نیچے اتر آئے کہ انہیں اچھل کر نوچ لیا جا سکتا تھا۔ہر چیز کہرے میں چھپ گئی تھی۔

شام کے وقت سرکاری کھیت کی پھارنی ختم ہو گئی۔پانی رک گیا۔ فضا کنواری لڑکی کی طرح اشنان کے بعد نکھر آئی۔ بیل سر جھکائے گاؤں کی طرف چل پڑے۔ ان کے پیچھے کیچڑ میں لت پت کمئے چلے آ رہے تھے اور دور سے وہ کہر آلود افق سے ٹمکتے ہوئے دھبوں کی طرح پراسرار نظر آ رہے تھے۔

سرکاری زمین کی پہلی پھارنی ختم ہو گئی اور کھیت مہک اٹھے تھے۔ لیکن منگرا کے دماغ میں ایک ہی خیال تھا اپنے محروم کھیت کا خیال۔ اس نے اپنے دروازے پر ہل ٹیک دیا۔ موہنا اس کے بدن کو سونگھنے اور چاٹنے لگا۔ منگرا شام کے دھندلکے کے باوجود' سرمئی غبار کو چیر کر' اہرے کے پاس اتھلی زمین کو دیکھ رہا تھا۔ نا آسودہ اور محتاج کھیت کو۔ جس پر ہل کا ایک ہلکا سا نشان بھی نہیں تھا۔ جس کی سطح دودھ پر جمی ہوئی چھالی کی طرح بے شکن تھی۔ البتہ کہیں کہیں ایک ہی سیدھ میں جنگلی گیدڑوں کے پیروں کے نشان ابھرنے لگے تھے جو گزشتہ رات چھوٹے سرکار کی مرغیوں کے ڈربے سے مال غنیمت لے کر بھاگتے ہوئے اسی کھیت سے گزرے تھے اور اپنی دیدہ دلیری کا اعلان کرنے کے لئے کچھ نچے ہوئے خون آلود پر چھوڑ گئے تھے۔

سکری نے پانی کی بھری ہوئی بالٹی اس کے سامنے رکھ دی۔ بنئے کی دکان میں چراغ جھلملانے لگا تھا۔ جھینگروں کی سیٹی کی طرح بجتی ہوئی چیخ اور مینڈکوں کی ٹراہٹ پورے گاؤں کو سر پر اٹھائے ہوئے تھی۔ منگرا ہاتھ منہ دھو کر وہیں بیٹھا رہا۔ جگہ جگہ سے بادلوں کا غلاف چھدرا

چھدرا ہو گیا تھا۔ چاند کی نرم روشنی بھیگی ہوئی ہوا میں خاموش رسیلے گیت کی طرح تیر رہی تھی۔ جو کی روٹی' پیاز کے کوچا اور آم کی چٹنی کے ساتھ اسے بہت اچھی لگتی تھی اور وہ خوب چٹخارے مار کر کھایا کرتا تھا۔ لیکن ابھی تو روٹی اس کے حلق میں اٹک رہی تھی۔ وہ ہر نوالے کے ساتھ ایک گھونٹ پانی غٹک جاتا۔ اس نے موہنا کے سامنے بھی تھوڑے تھوڑے وقفے پر روٹی کا ٹکڑا پھینکا۔ موہنا ایک لمحہ آنکھیں جھپکا کر منگرا کی طرف دیکھتا۔ پھر اپنا حصہ چٹ کر جاتا اور از سر نو مجبور صبر کے ساتھ دوسرے ٹکڑے کا انتظار کرنے لگتا۔ منگرا کھاتا چلا گیا' بجتے کے چراغ کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے ہاتھ دھو لیا اور بھرے لوٹے کا سارا پانی اپنے پیٹ میں انڈیل لیا۔ دیئے کی جھلملاتی ہوئی روشنی میں دوڑتے ہوئے پانی سے اس کی گردن میں زلزلہ سا پیدا ہوا۔ جو پسلیوں کے نیچے کی سرحد کے پاس پہنچ کر ایک تلاطم میں بدل گیا۔

"کیا بات ہے۔۔۔۔ پہلے ہی دن اتنا تھک گئے۔۔۔۔ ایں۔" سکری نے ہمدردی میں پوچھا۔

"کون تھک گیا ہے' میں۔ میں کوئی تھکنے والا جیو ہوں۔ ہونہہ۔ میرے دھیان میں اپنا کھیت تھا۔ تور ہو گیا بن بیل کے۔ اور اس سالی کیسولی میں اپنا کھیت جتے گا کیسے' یہی سمجھ میں نہیں آتا۔ ابھی سرکاری کھیت کی پہلی پھارنی کے لئے دور دور کھیتوں میں جانا ہوگا۔ اپنا کھیت تو ایسے ہی منہ تاکتا رہ جائے گا۔ سچ کہتا ہوں۔ من کہتا ہے۔ کہیں بھاگ جاؤں۔"

"بھاگو گے کہاں۔ یہ تو بھاگ کا لکھا ہے۔ ہونا کیا ہے۔ کچھ ماتھا لڑاؤ ماتھا۔"
"کروں کیا۔ کہیں بھاگنا ہی پڑے گا۔"
"آخر کہاں بھاگ کر جاؤ گے؟"
"میں چلا جاؤں گا ٹاٹا نگر؟"

"ٹاٹا نگر۔۔۔۔ ارے وہاں تو میرا بھیا بھی چلا گیا ہے۔ وہ ایسے ہی تنگ آ گیا تھا۔ اور تم جانو وہاں کی کمائی کیا ہے۔ ساون کا برسن ہے۔ برسن۔۔۔۔ ہاں سنا ہے۔ وہاں لوہے کے کالے کالے دیو ہیں۔ کالے کالے بھوت۔ منہ سے آگ اگلتے رہتے ہیں۔ بجلی سے دھونکنی چلتی ہے۔ شاؤں شاؤں شاں شاں جھک جھک۔۔۔۔ اوہ مجھے تو بھئے لگتا ہے۔۔۔۔ ارے باپ رے باپ۔۔۔۔ جانتے ہو بھیا اپنی جورو کے لئے کیا کیا لایا تھا۔ تیل' لال شیشی والا تیل' چمکی' سیندور' مسی'

کرن' پھول۔۔۔ہی ہی ہی۔"

"تیرا بھائی تو پاگل ہے سالا۔۔۔۔اپنا کھیت بیچ کر چلا گیا۔ جانور۔ ہونہہ۔" اس کی آواز میں غصہ سے بھری ہوئی تھرتھراہٹ تھی۔

"اے میرے بھیا کو پاگل مت کہو۔ تم واہی تباہی بکنے والے کون ہوتے ہو۔"

"اے بس کر۔۔۔۔ٹیں ٹیں!"

"چپ تم ٹیں ٹیں تم۔ ہاں تب ہی تو کھیت میں آگ لگی ہوئی ہے۔ ہائے کیسے دھان پٹے پڑے ہیں۔ ہونہہ۔ آج نہیں تو کل کرو گے وہی۔ جاؤ گے ٹاٹا نگر۔"

"ٹاٹا نگر جائے تیرا باپ' تیرے باپ کا باپ' تیرے باپ کے باپ کا باپ۔ میں اپنے کھیت میں گدھ کو اپنا مانس کھلا دوں گا۔ پر کھیت بیچوں گا نہیں۔ اور تو ابھی جانتی کیا ہے۔ بس ذرا مینے ملنے دے۔ کھیت میں ہل لگا نہیں کہ کایا پلٹ ہوئی۔"

سکری کا منہ بن گیا۔ وہ کڑھتی ہوئی بالکل بددلی سے اس کے پاس سے چلی گئی اور آنگن میں سو رہی۔

منگرا دیر تک بنئے کے یہاں کانے چراغ کو جلتا ہوا دیکھتا رہا اور موہنا کا سر سہلاتا رہا۔ کبوتر خانے سے کبوتروں کے گنگنے کی آواز آئی۔ ایک گیدڑ دبے پاؤں چھوٹے سرکار کی حویلی کی طرف نکل گیا۔ بانسیڑی کی طرف سے سانپ کے تتیانے کی آواز خاموشی کو لرزاتی رہی۔ مسہر ٹولہ سے اب تک ڈھول کی لہراتی ہوئی دھوم سنائی دے رہی تھی۔ تاڑ اور کھجور آسیبی سائے کی طرح ابھرے کے پاس کھڑے ہل رہے تھے۔ نیم کا درخت ملگجی چاندنی میں نہا کر ایک وظیفہ خوار درویش دکھائی دے رہا تھا۔

موہنا نے جمائی لی اور منگرا کے پیر پر تکیہ لگا کر سو گیا۔ آہستہ آہستہ منگرا کی سانسوں کے آہنگ سے نیند چھلکنے لگی اور بنیا کا تھرتھراتا ہوا کانا چراغ پھک سے بجھ گیا۔

تھپ تھپ
دھم دھم تھپ تھپ
تھپ دھم تھپ دھم تھپ تھپ دھم......

ڈھول کی تھاپ دور تک پھیل رہی تھی۔ چار روز کی موسلا دھار بارش کے بعد بادلوں کا جھکاؤ اوپر کو ہو گیا تھا۔ وہ اب اتنا گھنا نہیں رہا تھا۔ ان کے درمیان دراڑیں بھی پڑ گئی تھیں اور آدھے چاند کا منہ پونچھتے ہوئے بادبان اڑتے چلے جا رہے تھے۔ چاند کبھی چھپ جاتا۔ کبھی جھلک آتا۔ دھوپ چھاؤں دھوپ چھاؤں۔

تھپ تھپ
دھم دھم تھپ تھپ
تھپ تھپ......

جھینگروں کی گونج، کتوں کی بھونک اور مینڈکوں کی ٹراہٹ سہم کر رہ گئی تھی۔ ڈھول کی تھاپ کے ساتھ عورت اور مرد کے ملے جلے گیت ایک جادو کی طرح چھائے چلے جا رہے تھے۔ اس کی وجدانی صدا میں للک اور جذباتی ٹیس پیدا ہو گئی تھی۔ ایک نالہ، ایک ہوک۔

"آہے آہے...... آہے ماہے...... آہے ماہے۔"

سنہری چاندنی میں پیپل اور برگد کے درختوں کے آگے چاروں طرف موری سے بھرے کھیت پڑے سو رہے تھے۔ منگرا، بسوا، مانجھی اور دوسرے تمام جوانوں نے مل کر خوب گایا۔ وہ اپنے نچلے لب کے اندر کھینی کی چٹکیاں رکھتے تھوکتے اور پھر ایک والہانہ بے ڈھنگے رقص میں کھو جاتے۔ ان کے ناچ سے، ان کے گیت سے، ان کے جسم کے زیر و بم سے، تھرک اور اچھل کود سے ایک جنگلی رقص کا وجدان پیدا ہو رہا تھا۔ اس رقص میں تاج محل کا ترشا ہوا حسن تو نہیں تھا۔ لیکن اس میں ایک تڑپتے ہوئے چشمے کی دلکشی ضرور تھی۔ جیسے وہ خودرو چشمہ جنگل سے ڈھکے ہوئے پہاڑ کی بلندی سے پھوٹ کر وادی میں پھیل رہا ہو۔ چٹانوں میں دوڑ رہا ہو اور کہیں نشیب میں سمٹ کر وحشی مور کی طرح ناچ رہا ہو۔

ہلکی ہلکی سردی پڑنے لگی تھی۔ لیکن تاڑی کے نشے میں اچھل اچھل کر دیر تک ناچتے رہنے سے سبھوں کے جسم گرم ہو گئے۔ تمباکو کا دھواں سنہری چاندنی میں ابھر ابھر کر مٹ رہا تھا۔ عورتیں اپنی بے ڈھنگی ہنسی سے مردوں کی خود فراموشیوں پر ہنستیں، مٹکتیں اور اپنے آنچلوں میں منہ چھپا لیتیں۔

رات آنسوؤں سے بھرے بھرے موٹے پپوٹوں کی طرح بھاری ہو گئی۔ بادل پھر تہہ در تہہ جم گئے۔ چاند کا چہرہ اداس ہو گیا۔ چاندنی مرجھا کر پھیکی پڑ گئی۔ ڈھول کی تھاپ میں ایک وحشی پرندے کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ پیدا ہونے لگی اور پھر اچانک پورا گاؤں قبر کی طرح خاموش ہو گیا۔

صبح کا وقت تھا۔ ہوا کے جھونکوں میں پانی کی نمی تیر رہی تھی۔ دھند چھائی ہوئی تھی۔ موریاں ہوا کے ہلکوروں میں جھوم رہی تھیں۔ ہر طرف دھانی آگ سی لگ رہی تھی۔ اسکول کے پاس جوہڑ سے پرے، قبرستان کی چاروں طرف بچھہ کی طرف، سانپ کی طرح رینگتی ہوئی پگڈنڈیوں کی طرف۔ دور دور تک سیمل، کٹنیل، پیپل اور شیشم کے سائے میں وہی ہری ہری لہلہاتی ہوئی آگ پانی کی نرم لہر کی طرح دوڑتی چلی گئی تھی۔

منگرا ریڑھ کی ہڈی کی طرح اٹھی ہوئی منڈیر سے اتر رہا تھا۔ اس نے اپنے کھیت کی طرف دیکھا۔ ایک طرف چھوٹے سرکار کا کھیت تھا۔ جس میں بوائی ہو چکی تھی اور نئی روپن کے بعد دھان کے پودے ران تک پانی میں گڑے ہوئے تھے۔ ان کھیتوں میں ایک عجیب گمبھیرتا اور ملائمیت بھری ہوئی تھی جس کے ایک ایک بال میں آسودگی اور زندگی کا وعدہ ماں کی کوکھ میں بنتے ہوئے بچے کے نقوش کی طرح پل رہا تھا۔

منگرا کی آنکھوں میں دھواں ہی دھواں بھرا ہوا تھا۔ اپنے کھیت میں کسی طرح منگرا اور سکری نے مل کر بوائی تو کر دی تھی۔ لیکن ابھی سے ان موریوں کا چہرہ زرد پڑ گیا تھا۔ چار ہاتھوں نے مل کر اپنے کھیتوں کو شاداب کرنے کی کوشش تو کی تھی۔ مگر بوائی بہت چھدری چھدری ہوئی تھی۔

منگرا سوچ رہا تھا کہ اگر اب کے بھی اس ہیرا پھیری میں اس کا کھیت ٹھیک سے نہ پٹ سکا تو کتنا برا ہو گا۔ بوائی کا موسم تو ختم ہی ہو چکا تھا۔ ٹھنڈک پڑ گئی تھی۔ اوس خوب گرنے لگی تھی۔ یہی اوس تو دھان کے خوشوں میں دودھ بھرتی ہے۔ پانی اور مٹی پودے کی رگوں میں زندگی کا خون دوڑاتی ہے اور سورج کی کرنیں دودھ کو خشک کر کے چاول بناتی ہیں۔ لیکن یہ اوس کیا کرے گی۔ اگر کھیت کی مٹی سوکھ گئی تو۔۔۔۔۔ پانی نہ ملا تو بنا بنایا کھیل بگڑ جائے گا۔ سکری کی اور میری محنت یونہی اکارت جائے گی۔ اس کی پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ اس کی پلکیں کئی بار

جھپکیں۔ اس کے جبڑے کس گئے اور وہ اپنے کھیت کی منڈیر پر بیٹھ گیا۔ خزانے کا منہ کھل گیا تھا۔ رات ہی دو گروہوں میں سر پھٹول ہو چکی تھی۔ اس لئے چھوٹے سرکار کے عملوں کی نگرانی میں پانی تیزی سے نکل کر کھیتوں کو سیراب کر رہا تھا۔ تمام تختے نہا رہے تھے۔ پانی کے پہنچتے ہی کھیتوں میں ایک تازگی اور جوانی پیدا ہو جاتی تھی۔ دور جہاں جہاں روپن ہو رہی تھی' پانی میں گھٹنوں تک دھنسی ہوئی عورتیں گیت گا رہی تھیں۔ ان میں اس کی سکری بھی تھی۔ وہ گیت بھی گا رہی تھی۔۔۔۔ وہی گیت۔ اس کی آواز تیز اور چنیلی تھی اور منگرا زخمی پرندے کی طرح چیختی ہوئی آواز کو خوب پہچان رہا تھا۔

"اے ماہے۔۔۔۔ اے ماہے۔۔۔۔ اے ماہے۔۔۔۔"

ایک گیت' ایک کراہ۔۔۔۔ ایک زمین میں ڈوبی ہوئی فریاد!

بابل سے آنے والے بھائی کا انتظار۔ کاگا کی خوشامدیں۔ بنئے کے قرض کا دکھڑا۔ مرد کی نشہ بازی اور مار کٹائی کا گلہ۔ ساس کی گالیوں کا زخم اور طعنوں کا نمک۔۔۔۔ ہولی بھی تو آنے والی ہے۔ بلما مجھے نئی لال چنریا لادے۔ میری مانگ کو سیندور سے بھر دے۔ رنگ کی پچکاری مار اور مجھے اپنی گود میں چھپالے بلما۔

یہی سب تو تھا ان گیتوں میں۔

وہ جھکی ہوئی تھیں اور گا رہی تھیں۔ جیسے ازل سے ہی وہ اسی طرح جھکی ہوئی تھیں۔ گدھ کی طرح گوشت نوچتی ہوئی۔ ان کی ساڑیاں رانوں تک چڑھی ہوئی تھیں۔ ان کے بازو ننگے تھے۔ ان کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ ان کے دونوں ہاتھ جیسے پانی کے اندر چھپے چھپے گیتوں کی ناؤ میں بیٹھ کر زندگی کا جال بن رہے تھے۔

"اے ماہے۔۔۔۔ اے ماہے۔۔۔۔ اے ماہے۔"

اپنے اپنے کھیتوں کی طرف لمبے لمبے ڈنڈے لئے لوگ دوڑے' کہیں اری کاٹی گئی۔ کہیں اری باندھی گئی۔ پانی کا منہ نہیں کھلا۔ کہیں رک کر دوسری طرف مڑنے لگا۔ مگر اتنا سب کچھ ہونے پر بھی منگرا کے کھیت پانی کے پیاسے ہی رہے۔ منگرا کو اس وقت کا انتظار کرنا تھا جب سب کی

پٹائی ہونے کے بعد پانی بچ رہے گا۔ یہ وقت کی بات تھی اور کون جانے پانی رہے یا نہ رہے۔ منگرا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ اس سے اس کی جاک کی مٹی چھن چکی تھی اور اب اس کا کھیت بھی یونہی جل جائے گا۔ اس کی جورو کی ہنسلی بنئے کے یہاں سے نہیں چھوٹے گی اور وہ اپنی موت تک اسی طرح بیگاری کرتا رہے گا۔ اس کے پیٹ کی بھوک اس کی آنکھوں میں کوندتی رہے گی۔

بادلوں کے دل پہاڑی سلسلے کے اوپر منڈلا رہے تھے۔ جن کو چیر کر خوں فشاں سورج ڈوبتا چلا جا رہا تھا۔

کسان گاؤں کی طرف پلٹ آئے تھے۔ ہوا میں خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ کھیت میں دھان کے نئے پودے چمک رہے تھے اور ان کی بے چین لہروں میں سورج کی روشنی کبھی تیز کبھی مدھم ہو جاتی تھی۔ گاؤں کے کچھ لوگ آنکھ بچا کر اندھیرے میں پانی چرا لینے کی نیت سے ٹک گئے تھے اور کچھ ان کی نیت پر پہرہ دینے کے لئے پیچھے رہ گئے تھے۔ ان کی کھپتاں اونچی ہرے کی منڈیر پر گڑی ہوئی تھیں۔

لیکن منگرا ایک بے حس مٹی کے تودے کی طرح اپنی پگڈنڈی پر بیٹھا ہوا تھا۔ وہ بغیر پلک مارے سورج کو دیکھ رہا تھا جو سرخ کرنوں کے جنگل کے پیچھے مریض اور تھکا ہوا دکھائی دے رہا تھا۔ گائے' بیل اور بکریوں کے گلے پانی کے گندے نالوں میں چھپڑ چھپڑ کرتے ہوئے گاؤں کی طرف چلے جا رہے تھے۔ شام کی ہوا بھی بوجھل تھی۔

اب تو بوائی کا کام بھی ختم ہو جائے گا۔ سکری بھی بیکار ہو جائے گی۔ گھر میں دھان کی مجوری کا آنا بند ہو جائے گا۔ اب کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔ اب نزدیک کے گاؤں سے بابھن بھی غلہ پیشگی دے کر بلانے نہیں آئیں گے۔ بلکہ وہ تو کٹنی کے وقت بھی نہیں پوچھیں گے۔ ہر طرف اندھیرا تھا۔ کیا ہوگا۔۔۔۔ کیا ہوگا۔۔۔۔۔

خاموش کھیت میں ہوائیں پر اسرار ہو گئیں اور ایسا لگا کہ سیاہ کھجور نے منہ چیر کر منگرا کو نگل لیا ہے۔

کڑاکے کا جاڑا پڑنے لگا تھا۔

جب بہت رات گئے منگرا گھر پہنچا تو بنئے کی دکان کے سامنے بھیڑ جمی ہوئی تھی۔ ڈھول بج رہے تھے اور دو تین مرد' ہاتھی' بیل اور بھیانک بھوت کے پتلے سر پر ڈالے دھما دھم کود رہے تھے اور تین عورتیں ناچ رہی تھیں۔

ٹھمک ٹھمک ٹھم
ٹھم ٹھم ٹھمک۔۔۔۔ ٹھم ٹھم ٹھمک
ٹھمک ٹھم۔ ٹھمک ٹھم
"اے ماہے۔۔۔اہے۔۔۔اہے ماہے۔"

سکری کی آواز اسے بہت دردناک معلوم ہوئی۔ وہ جانتا تھا کہ اب چند دنوں کے بعد سکری کو پھر آدھا پیٹ کھانا پڑے گا۔ وہ مہوے کا دارو پی کر آئے گا۔ آنکھیں چڑھی' نیم خواب' مونچھیں پھڑکتی ہوئی اور پھر وہ اسے بے وجہ پیٹے گا۔ وہ روتی دھوتی گاؤں میں کہیں چلی جائے گی۔ اور پھر کئی کئی دن تک وہ اس کے سینے سے لگ کر نہیں سوئے گی۔ اس کا چہرہ روز بروز بیمار ہوتا جائے گا اور ابھی جو اس پر دھان کی جوانی کی چمک چھا گئی ہے مٹ جائے گی۔

وہ جا کر بنئے کی دکان پر بیٹھ گیا۔ وہاں گاؤں کے مالکوں کے چند منچلے چھوکرے بیٹھے ہوئے تھے۔ منگرا کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ وہاں کیوں بیٹھتے تھے اور ان کی بنئے سے کیوں اس قدر گہری چھنتی تھی۔ بنیا ہر طرح کا کاروبار کرتا تھا۔ وہ گہنے رہن رکھتا تھا۔ کھیت نیلام پر چڑھواتا اور دوسروں کو خریدنے کے لئے روپیہ ادھار دیتا اور پھر اس کے لئے کڑے سود وصول کرتا۔ گاؤں کے کڑیل جوانوں کو ابھار کر لوگوں کے گھروں میں سینھ ڈلواتا۔ اپنی بہن کی دلکشی سے گاہک پھانستا۔۔۔۔ لیکن اس کے علاوہ گاؤں کا راجہ اندر بھی تھا۔ وہ غریب کسان عورتوں کو پھانستا اور ان کی عزت کے بیوپار سے اچھا منافع اٹھاتا۔ اپنی دکان کی گلی سڑی چیزوں کو کھیت میں پھینک دینے کی ضرورت سے زیادہ کسر اس طرح نکال لیتا۔

اسے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں نفرت کی آگ جل اٹھی۔ اتنے میں گاؤں کا چالیس مار خاں فلسفی علی حسن وہاں آ پہنچا۔ اس کی آنکھیں دوگنی نفرت سے جلنے لگیں۔ وہ جانتا تھا کہ یہ فلسفی اوٹ پٹانگ باتیں کرے گا۔ کبھی کہے گا' یہاں جنگ ہو رہی ہے۔ کبھی کہے گا' وہاں خون کا دریا

بہہ گیا۔ اکال آئے گا۔ دھان سونے کے بھاؤ بکے گا۔ لوگ بھوکے مریں گے تو عقل آئے گی۔ اور اسی طرح کی اناپ شناپ اور ان باتوں کے پیچھے علی حسن جیسے کاشتکار کی وہ تمنا کام کر رہی تھی جو گزشتہ جنگ کی برکتوں سے متاثر ہو کر پیدا ہو گئی تھی۔ جس کے فیض سے بہت سے ٹٹ پونجیے دھنی سیٹھ ہو گئے تھے۔ اس کی پرانی عینک' چوڑے لب' لمبے چہرے' اتھلی پیشانی اور ہونٹوں پر بکھری ہوئی رذیل مسکراہٹ سے صرف اسی لالچ' اسی فریب' اسی خواب کا پتہ چلتا تھا۔

فلسفی علی حسن کو دیکھ کر بنیا کھانستا۔ وہ یک چشم تو تھا ہی۔ لیکن ایسے موقع پر اس کی بدصورتی اور نحوست میں چار چاند لگ جاتے۔ اس کا چہرہ مکروہ اور خطرناک دکھائی دینے لگتا۔ بکری کی دم کی طرح اس کی مونچھیں جھکی ہوئی تھیں۔

"کیا ہے منگرا۔۔۔۔ بوائی ہو گئی۔۔۔۔ اب کے برس دھان اچھا رہے گا کیوں؟" بنیا نے پوچھا۔

"اچھا کیا رہے گا۔ اپنا کھیت تو بن پٹے ہی منہ پھاڑ کر رہ جائے گا۔"

"ارے ایسا کیسے ہوگا۔ جانتا بھی ہے۔ کیسی لام چھڑ گئی۔" اس نے لام کا نام لیتے ہوئے ہاتھ اٹھا کر اشارہ کیا۔ جیسے بس دوسرے ٹولے میں وہ جنگ گھمسان ہو گئی ہے۔ اس کے چہرے پر ایک کمینہ مسرت کی چمک پیدا ہو گئی تھی۔ "پتر میں لکھا ہے کہ سارے سنسار میں یدھ ہونے والا ہے۔ دھان تو دیکھنے کو نہیں ملے گا۔ ایک ایک دانہ جیون کی کنجی ہے۔ اکال پڑے گا۔ ایٹم بم ما گرے گا۔۔۔۔ اور یہ سب بھگوان کی لیلا ہے۔ کل جگ آگیا رے منگرا۔۔۔۔ ہائے۔"

بنئے نے کڑوا تیل گاہک کو بڑھایا اور ہاتھ میں لگا ہوا تیل اپنی سیاہ چپچپاتی ہوئی رانوں پر ملنے لگا۔ اس کا کانا چراغ اس کی کانی آنکھ کی طرح ٹمٹما رہا تھا۔ اور اس کی ناک لومڑی کے نتھنے کی طرح پھڑک رہی تھی۔

فلسفی علی حسن نے ایک چٹکی بھری اور اس کی بیڑی کی چھائی اڑ کر منگرا کے ماتھے پر جا گری۔ اس نے دور کونے میں دال کھٹکتے ہوئے چوہے کو متانت سے دیکھا اور اپنی قاعدہ بغدادی شروع کر دی۔۔۔۔ ارے اس لام سے لاب ہی لاب ہے۔ بھوک ہو گی۔ بم گرے گا۔ آدھے سے زیادہ آدمی مر جائیں گے۔۔۔۔ پھر چین چکال ہو جائے گا۔ ہاں لوگ جاگ جائیں گے۔۔۔۔ اور یہ دھرتی پاک ہو جائے گی۔۔۔۔ ابھی تم سب کو جگانے کے لئے گناہ کی'

بیکاری کی' چور بازاری کی ضرورت ہے۔ میں تو یہ چاہتا ہوں' جلد یہ لڑائی بھارت میں بھی چھڑ جائے۔ کیوں؟"

بنئے نے فوراً دریں چہ شک کے انداز میں لقمہ دیا۔ "ہاں سرکار ۔۔۔۔ ایک دم ٹھیک سولہ آنے ۔۔۔ سوا سولہ آنے ٹھیک ۔۔۔۔!"

فلسفی علی حسن اپنا قاعدہ بغدادی ختم کر کے کسی مجہول بغدادی خچر کی طرح سر نہوڑائے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

اور لوگ بھی آ کر بیٹھ گئے۔ وہ ایک دوسرے کے قریب ہو گئے جیسے گائیں اپنے بچوں کو سینے میں چھپا کر کسی درندے کے حملے کا انتظار کرنے لگی ہوں۔ پھڑ کتے کان اور اٹھی ہوئی دم کے ساتھ۔

"جانتے ہو چاول چونتیس روپے من چڑھ گیا ہے۔ کل ڈیوڑھی میں منوں چاول بکا ہے۔ آڑھتیے آ کر لے جا رہے ہیں۔ دوسرے لوگ بھی چاول بیچ رہے ہیں۔ بستی سے چاول اٹھ رہا ہے۔" کاکا نے بنئے سے کہا اور تم نے گنگو کل منوں چاول خریدا ہے۔ کیا سچ مچ اکال آئے گا۔۔۔ سنا ہے کوریا کوئی دیش ہے۔ جہاں یدھ ہو رہا ہے۔ "یدھ تو کوریا میں ہو رہا ہے۔ پھر ہمارے دیش میں مہنگی کیوں ہے؟"

بنیا ہنسا۔ "یہی ہوتا ہے کاکا۔ آج کے سنسار میں یہی ہوتا ہے۔ جنگ کہیں ہو مہنگی تمام میں ہوتی ہے۔" وہ پھر ہنسا۔

"ہاں جی ۔۔۔۔ تم کالج پڑھتے ہو۔ بدھی تو تم کو ہو گی ۔۔۔۔ پر میں کہتا ہوں۔ یہ اندھیر ہے۔"

"ہاں اندھیر تو ہے۔ بالکل اندھیر ہے۔" سب نے کورس میں کہا۔

اور پھر کھینی کی چٹکیاں نچلے لب کے اندر بھری گئیں اور منڈلی سے سب سے پہلے کاکا اٹھ کر چلا گیا۔ اس نے چلتے چلتے اپنی ہتھیلی پر رکھی ہوئی کھینی میں راموسے لے کر چونا ملایا۔ دو تین تالیاں لگائیں اور پوری چٹکی اپنے لب کے نیچے دبا کر تھوکتے ہوئے اس نے کہا۔ "لام ہو یا اکال آئے۔ گنگو کو کیا ہے۔ یہاں تو روپے کی تین چار اٹھنیاں بنتی رہیں گی اور پیلے کھاتے پر نئے بیاج کا ڈھیر لگتا رہے گا۔ مجا ہے مجا ۔۔۔ کھاؤ گھی کھچڑی کیوں گنگو۔" ایک مردہ سا قہقہہ بلند ہوا۔

کاکا چلا گیا۔ بنیا کھسیانا ہو کر دیر تک ہنستا رہا۔ "کاکا اب تو بالکل سڑی ہو گیا ہے۔"

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اور سوکھے ہوئے پتے کے ڈھیر کی طرح منڈلی بکھر گئی اور ایک ایک کر کے سب وہاں سے چلے گئے۔ منگرا یونہی بیٹھا رہا۔ وہ بھی اٹھنا چاہ رہا تھا کہ اس کے سامنے ایک عورت کا سایہ ابھرا۔ وہ سایہ رک گیا۔ پلٹا اور جلدی جلدی قدم اٹھاتا ہوا پیپل کے پاس دیوی کے استھان کی طرف بڑھا اور اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

منگرا ہر چیز سے دھوکا کھا سکتا تھا۔ لیکن سکری کی چال اس کی آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتی تھی۔ اس کے دماغ میں بجلی کوند گئی۔ بار بار جھلمل جھلمل۔ بجلی کے اس چھلاوے میں اس کی آنکھوں نے سگریٹ اڑاتے ہوئے ان بدقماش چھوکروں کی آنکھوں اور میلے کچیلے دانتوں کی چھچھوری چمک اور ان کی گہرائی سے جھانکتی ہوئی وحشت دیکھی۔ اس نے بنئے پر بھی ایک بھری ہوئی نگاہ ڈالی۔ جواب پوری سنجیدگی سے اپنے پیلے کھاتے پر گدھ کی طرح جھک گیا تھا۔ وہ بھی اٹھا۔ دیوی استھان کے پاس سے وہ پیپل کے پیڑ کے پاس آیا۔ جہاں کچھ دیر پہلے ناچ ہو رہا تھا۔ لیکن اب وہاں کچھ نہ تھا۔ دو تین کتے کورس الاپ رہے تھے اور ایک خوفزدہ بکری کا بچہ ایک جھونپڑے کی ٹٹی سے بندھا ممیا رہا تھا۔

وہ جب اپنے جھونپڑے میں پہنچا تو اس کی سکری چٹائی پر لیٹ چکی تھی اور زور زور سے سانس لے رہی تھی۔ وہ جھکا۔ اس نے اس کے چہرے پر اندھیرے میں ہاتھ پھیر کر اس کی آنکھوں کو چھو کر دیکھا۔ اس کی پلکیں لگی ہوئی تھیں۔ اس کے ہاتھ سکری کے چہرے پر سے دوڑتے ہوئے اس کی چھاتی پر آ کر رک گئے۔ اس کے ہاتھوں کے نیچے ایک ہراساں اور مجبور پرندہ پھڑ پھڑا رہا تھا۔ اس کی سانس جیسے رکنے لگی ہو اور خود اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

وہ چیخ کر کھڑا ہوا۔

"سالی ۔۔۔۔ کتیا، کتیا، کتیا، حرامی۔"

اور اس نے لاتوں کی بارش شروع کر دی۔ جب وہ دس پندرہ لاتوں کی بارش کر چکا تو اس کی اپنی سانسیں پھول رہی تھیں۔ اس نے لاتیں برساتے ہوئے نہ اس کی پیٹھ کا خیال کیا تھا نہ سینے کا، نہ سر کا، نہ رانوں کا، نہ پیڑو کا ۔۔۔۔ اتنے میں موہنا آیا اور اس کے پیر سے لپٹ گیا۔

سکری کی آہستہ آہستہ سسکیوں کے ساتھ موہنا کی چچیاہٹ اور بھونک بہت مہیب معلوم ہو رہی تھی۔

منگرا کتے کو لے کر باہر چلا آیا۔

اس نے بنئے کی دکان کی طرف دیکھا۔ چراغ ابھی تک جل رہا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے چراغ پھک سے بجھ گیا اور پورا گاؤں ایک بے داغ اندھیرے میں غرق ہو گیا۔ البتہ دور کی کسی بستی میں ایک روشنی کا جھلملاتا ہوا داغ سیاہ کیچڑ میں گرے ہوئے روشن ستارے کی طرح لرزاں تھا۔

وہ چپ چاپ کھیتوں سے گزر رہا تھا۔ کبھی موہنا لپکتا ہوا اس کے آگے نکل جاتا اور کبھی دم ہلاتا ہوا اس کے پیچھے رہ جاتا۔ ایک جگہ ٹیلے کے پاس کھڑے ہو کر اس نے اپنی پچھلی ٹانگ اٹھالی۔ فارغ ہوا اور پھر سے اپنے آقا کے ساتھ ہولیا۔
"سالی۔۔۔ کتیا' حرامی' چھنال' بنئے کی دکان۔ اس حرامی کی ہو الگ گئی کتیا کو۔ چڑیل' سور کی جنی۔ وہ من ہی من میں سکری کا حساب کتاب ٹھیک کرتا چلا جا رہا تھا۔ آنکھیں گرم آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ اسے اپنی ڈبڈباتی آنکھوں میں رات کا اندھیرا بھی دھندلا دکھائی دیتا تھا۔

وہ جاتے ہی مولوی یار خاں کے کھیت میں اتر گیا۔ اس نے آری سے کچی مٹی کے ایک تازہ تونددے کو اٹھایا اور پانی سنسنا کر بالائی تختے کی طرف مڑ گیا۔ اس نے دوسرے ٹوپروں کی طرف دوڑتے ہوئے پانی کا رستہ اس کچی مٹی کے تودے سے بند کر دیا۔ پانی اوپر چڑھنے لگا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے مٹی کے بڑے بڑے تودوں کو اٹھا کر دوسری آریوں کو بند کرتا رہا۔ ہوا کافی ٹھنڈی ہو کر اس کے بدن کو کاٹ رہی تھی۔ اس کی سانسیں پھولنے لگیں۔ اس کا سارا بدن پسینے سے بھیگ گیا تھا اور آنسو آنکھوں سے ڈھلک کر اس کے گالوں پر چمکنے لگے تھے۔

پانی اوپر چڑھنے لگا۔ آہستہ آہستہ چڑھتی جوانی کی طرح۔ بادل پھٹ گئے تھے اور چاندنی پھر نکھر آئی تھی۔ دور سے دو لالٹین کی روشنیاں کھیت کی طرف بڑھتی ہوئی نظر آئیں۔ اس کا دل خوشی سے جھوم رہا تھا۔ اب اس کا دھان جی اٹھے گا۔ ہریالی کی مخمل سے منڈھ جائے گا۔ اس کا تختہ۔ اس کو لگا کہ نئے دھان کی خوشبو رنگ برنگ کی ننھی تتلیوں کی طرح اڑ کر آ رہی ہے

اور اس کی سانسوں میں دھنک کی پھوار کی طرح گھلتی چلی جارہی ہے۔ میٹھی، نرم اور پیاری خوشبو۔۔۔۔ہاہاہا۔

جب پانی اس کے کھیت میں دوڑنے لگا تو وہ واپس آگیا۔۔۔۔ موہنا پہلے ہی پلٹ گیا تھا۔ سکری کو نیند آچکی تھی۔ موہنا اس کے پھیلے ہوئے ٹھنڈے بالوں پر سر رکھ کر سویا ہوا تھا۔ منگرا اندھیرے میں جھک کر پھر ایک بار سکری کے چہرے کو ٹٹولنے لگا۔ سکری کی پلکیں اب تک بھیگی ہوئی تھیں۔ وہ اور جھکا۔ اس نے سکری کی آنکھوں کو چوم لیا۔ اور موہنا کو ہٹا کر خود اس کے چپٹے بالوں میں اپنا منہ چھپا کر سو گیا۔ جیسے وہ بال نہ ہوں بلکہ کالے کالے ندامت کے ناگ۔

دوسرے دن سکری کی آنکھیں کھلیں تو منگرا غائب تھا۔ موہنا کا بھی کہیں نشان نہ تھا۔ دن بھر سکری کا بدن دکھتا رہا۔ وہ اس دن کہیں باہر نہیں نکلی۔ تین چار بار براہیل منگرا کو ڈھونڈنے آیا اور بھانت بھانت کی سڑی سڑی گالیاں سنا کر چلا گیا۔ سکری سمجھ گئی کہ چھوٹے سرکار کا غضب اس کے مرد پر برسنے والا تھا۔ اس نے کوئی بڑا گناہ کیا ہے اور جب ہی تو وہ صبح سے لاپتہ تھا۔

جب رات گئے تاڑی کے نشے میں گھر لوٹا تو اس کے منہ سے بھک بھک کھٹی سڑاند نکل رہی تھی۔

ابھی اس نے موہنا کو گلے سے لگا کر دو تین بار بھاری بھاری قہقہے لگائے تھے کہ چھوٹے سرکار کے عملے والے پہنچ گئے اور گالیاں دیتے ہوئے اسے کچہری کی طرف لے گئے۔

سکری اٹھ کر بیٹھ گئی۔ یہ کیا غضب ہوا۔ اس کا اپنا بدن دکھ رہا تھا۔ وہ ٹٹی تک آئی۔ پھر واپس اندر چلی گئی۔ وہ اسی طرح اندر باہر آتی جاتی رہی۔ بہت رات چڑھ آئی تو منگرا واپس آیا۔ اکیلا، خاموش، تپے ہوئے لوہے کے برتن کی طرح۔ اس کے چہرے پر گرد کے دھبے تھے اور نچلے لب سے خون نکل رہا تھا۔ بازو پر خون کے جمے ہوئے چتے ڈھبری کی روشنی میں بہت ہلکے دکھائی دے رہے تھے۔

وہ چٹائی پر اوندھے منہ گر گیا۔ موہنا نے چاٹ کر اس کے چہرے کو دھو دیا۔ سکری اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کے بازو سہلانے لگی۔ منگرا گولی سے زخمی گھڑیال کی طرح نتھنے پھلا پھلا کر سانس لیتا رہا۔

موہنا نے منگرا کا بدن چاٹنا چھوڑ دیا اور اپنا منہ پیٹ میں گھسا کر سو رہا۔ کبوتر خانے میں کبوتر کا جوڑا ہڑ کا اور پھر ایک خون رستا ہوا زہرناک سناٹا چھا گیا۔

ہتھیا برسا۔ مگر کانا بالکل صاف کنے سے نکل گیا۔ گاؤں کے لوگ تشویشناک اور آرزومند نظروں سے اوپر بے جان بادلوں کو تاکتے۔ لیکن بادلوں کا کارواں آتا' جمتا بھی۔ گو بغیر برسے آگے نکل جاتا۔ منگرا سوچتا۔ یہ تو دیش کی آزادی ہوگئی۔ آئی یا نہ آئی۔ دنیا جیسی تھی ویسی ہی رہی۔ ہونہہ۔۔۔۔!

اس کے کھیت کا دھان جل گیا۔ گاؤں کے چاروں طرف دور دور تک دھان جل رہے تھے۔ صرف چھوٹے سرکار اور دوسرے زمینداروں اور ان کے شریک کاروں کے کھیت میں کسی طرح ابرے کے بچے کھچے خزانے سے پانی پہنچا دیا گیا تھا اور وہ پانی کی کے باوجود تر و تازہ' شاداب اور شگفتہ تھے۔

لیکن منگرا کا کھیت اتھلی سطح پر تھا۔ نہ وہاں پرنالہ تھا' نہ چین۔ اسے پانی نہیں مل سکا۔ کھیت جل گیا۔ آخر ایک دن منگرا نے سونو گوالے کے لونڈے کو پکار کر کہا۔ "اپنے ڈھور ڈنگر ڈال دے میرے سوکھے کھیت میں۔۔۔۔۔ لے آچر ادے سب ان کو۔"

سونو سالے کو تو جیسے اس پکار کا انتظار ہی تھا۔ وہ اپنے جانوروں کو موڑ کر اس کی طرف لے آیا اور شام کے جھٹپٹے سے پہلے اس کے کھیت سے کچھ زردی' کچھ ہریالی کا رنگ اڑ گیا۔ جب سونو اپنے جانوروں کو ہانک کر لنگڑاتا ہوا گاؤں سے قریب ہو رہا تھا تو منگرا بیٹھ گیا اور سرمئی خاموش شام میں لپٹا ہوا وہ اب تک لگے ہوئے دھان کی کھونٹیوں کو دیر تک سہلاتا رہا۔

کٹنی شروع ہو چکی تھی۔ جاڑا کڑاکے کا تھا۔ آدمی کی ایک ایک سانس ٹھٹھری معلوم ہوتی تھی۔

شام کا دھندلکا گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ سورج کی کچھ نارنجی' کچھ سرخ زمین کھیت میں سلگی سلگی اور بجھی بجھی سست رو موج رنگ کی طرح لوٹ پوٹ ہو رہی تھی۔ کٹے ہوئے زرد دھان کے ڈھیر شعلے کی طرح بھڑک اٹھے تھے۔ کھیت مجور دھان کے ڈھیروں کو پھرتی سے گولیا رہے

تھے۔ عورتیں ان بوجھوں کو اٹھا کر گاؤں کی طرف سلسلہ وار چلی جارہی تھیں۔ ان کے سروں پر دھان کا مہکتا ہوا بوجھا چاروں طرف سے جھک گیا تھا اور ان کے چہرے پر دھان کے پیلے جھولتے ہوئے خوشوں میں چھپ گئے تھے۔

ادھر چھوٹے سرکار کا کھلیان لگ رہا تھا اور دوسری طرف جلے ہوئے کھیتوں میں دھول اڑ رہی تھی۔ چاول کا بھاؤ آسمان کی طرف اڑتا چلا جارہا تھا۔ اطراف میں بڑے خوفناک ڈاکے پڑنے لگے تھے۔ شام ہوئی نہیں کہ درجنوں ٹارچ کی آنکھیں چمکنے لگتیں۔ عورتیں سہم جاتیں اور بچے ماں کی گود سے چمٹ جاتے۔ چھوٹے سرکار سے حکومت نے پانچ سو من غلے کا مطالبہ کر دیا تھا اور ان کے ذخیرے کی چھان بین بھی ہونے والی تھی۔ وہ جلدی جلدی اپنا پرانا ذخیرہ دور کے بیوپاریوں کے ہاتھ بیچ رہے تھے۔ ان کو اس کی بہت جلدی تھی جیسے ماں کو عمر رسیدہ لڑکی کو جلد بیاہنے کی جلدی ہو۔

جنگلی کھجور 'پھلیے' دوب اور گھاس کھا کر غریب لوگ اپنا وقت کاٹنے لگے تھے۔ منگرا زندگی میں پہلی بار اتنا خاموش، گمبھیر اور اداس ہو گیا تھا۔ وہ بھوک سے تڑپ تڑپ کر لوگوں کے مرنے کی خبریں سنتا اور اس کے پیر کے نیچے سے دھرتی نکل جاتی۔ لوگ گاؤں چھوڑ کر شہر کی طرف بھاگنے لگے تھے۔ ٹاٹا نگر سے اس کے سالے کی چھٹی ہو گئی تھی۔ وہ اپنی بیوی اور بچی سمیت بھوک مری کا شکار ہونے کے لئے اپنے گاؤں واپس آ گیا تھا۔

اور جب بھوک مری سے بچنے کے لئے سکری اسے ٹاٹا نگر یا کسی اور شہر کی راہ لینے کے لئے اکساتی تو وہ اسے جھڑک کر چپ کرا دیتا۔

''دیکھا نہیں اپنے بھائی کو۔۔۔۔ کیا بنا اس کا۔۔۔۔ میں یہیں مروں گا اور اگر تو شہر میں مرنا چاہتی ہے تو چلی جا اکیلی۔ میرا تیرا کوئی سمبندھ نہیں۔۔۔۔ ہاں!''

سکری نے رفتہ رفتہ شکایت چھوڑ دی۔ وہ چپ ہو رہی۔ اس مسافر کی طرح جو ناؤ کے شکستہ ٹکڑے پر طوفان میں ایک ایسے مقام پر بہتا ہوا گزر رہا ہو' جہاں دور کناروں پر جنگل ہی جنگل ہو اور فریاد رسی کرنے والا کوئی نہ ہو۔

کانا بنیا بغلیں بجا رہا تھا۔ اس کی تو مٹی بھی چاندی تھی۔ اس کی دکان میں میل بھرے گہنوں کا انبار لگ گیا تھا۔ چاندی کے بازو بند ہنسلیاں، چھڑے، جگنو۔۔۔ اور وہ ڈاکے کے ڈر سے ان پر سانپ کی طرح بیٹھا رہتا۔ اس کے پیلے یرقانی کھاتے میں نئے شکاروں کے نام ٹنکتے جاتے۔ کبھی کبھی رات کے وقت دور سے چمکتے ہوئے ٹارچ کی آنکھیں دیکھ کر اس کی دھک دھکی اتنی بڑھتی کہ اس کی گھگھی بندھ جاتی اور خوف سے اس کی تنہا آنکھ بھی آنسوؤں سے بھر جاتی۔

منگرا بھی آخر فاقہ کے چنگل میں پھنس گیا۔ نہ جو، نہ منڈوا اور گھر میں چاول کا ایک دانہ بھی ڈھونڈھنا تو کسی بانجھ عورت سے بچے کی امید رکھنے کے برابر تھا۔ گھر میں چراغ بتی کا تو سوال ہی نہیں رہا تھا۔ ہو ہو ہو۔۔۔ بس۔ ہو ہو ہو۔

اب سکری اکثر بستی میں منڈلاتی رہتی۔ موہنا اب دو دو تین تین دن صورت نہ دکھاتا اور جب کئی دن کے بعد آتا تو اس کی آنکھوں میں ایک بھوکی شرمساری اور ندامت کی خفیہ سی چمک دکھائی دیتی۔ منگرا اسے دیکھ کر اپنی آنکھیں جھکا لیتا۔ کتے کا پیٹ اندر کو دھنس گیا تھا۔

خود اسی گاؤں میں ایک ماہ کے اندر تین بھوک مری ہو چکی تھی۔ اکال کا درندگی سے بھرا ہوا چہرہ اب چھپا ہوا چہرہ نہیں تھا۔ خوف، بھوک اور موت کی جوت سارے سوکھے ہونٹوں، دھنسے گالوں، ہانپتے پیٹوں اور مرتی آنکھوں میں لرزتی دکھائی دیتی۔۔۔ ہر طرف، ہر جگہ۔

اب بنئے کی دکان پر گہنوں کے انبار کی رفتار سست پڑ گئی تھی۔ سرکار نے ضلع سے باہر غلہ بھیجنے کی ممانعت کر دی تھی۔ سرکار بار بار اخبار میں اعلان کر رہی تھی کہ بھوک مری بالکل نہیں۔ لیکن منگرا جانتا تھا کہ اس کے کتنے جانے پہچانے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ بھوک سے مر چکے تھے۔ بنیا جب اخبار پڑھ کر سرکار کا اعلان سناتا تو اس کا اثر صرف ان بھوکوں کی آنکھوں میں دیکھا جا سکتا تھا جن سے ایک جلتی ہوئی روشنی نیزے کی طرح بنئے کے چہرے پر برسنے لگتی تھی۔۔۔ وہ روشنی جو دوڑتی ہوئی چھوٹے سرکار کے کھلیان پر جا کر اٹک جاتی تھی۔ جہاں سے دھان اب ڈھلا ڈھلا کر کھیتوں میں بند ہو رہا تھا۔

"لیکن اخبار میں تو لکھا ہے کہ سرکار غلہ بھیج رہی ہے۔" بنئے نے اپنی کانی آنکھ میچ کر کہا۔

"تیرا اخبار سالا حرامی ہے اور تو بھی حرامی ہے۔ سالا بکتا ہے۔ اور یہ کاکا کیسے مرا تیری سرکار کا غلہ کھا کر۔۔۔۔ بول بول۔۔۔۔ اندھی کا جنا۔"

کانا بھی بپھر گیا۔ وہ منگرا سے گتھ گیا۔ پہلے تو منگرا نے دو تین گھونسے کھا لئے۔ لیکن پھر وہ ایک شعلے کی طرح لپکا اور اس نے بنئے کو اٹھا کر دیوی کے استھان کے سامنے پٹک دیا۔ لوگ دوڑ پڑے اور بیچ بچاؤ ہو گیا۔

بنئے کا اثر عورتوں پر اور بڑھ گیا تھا اور کتنے گھر رات کو سنسان رہنے لگے تھے۔ دن یونہی بھوک مری اور دکھ میں بیتتے رہے۔

وہ رات بہت اندھیری تھی۔ منگرا جب تین کوس کی بیگار کر کے گاؤں لوٹا تو نشے میں متوالا ہو رہا تھا۔ وہ بالکل آپے میں نہیں تھا۔ وہ بے سری بھونڈی آواز میں گا رہا تھا۔ اس نے اپنی نیم آستین اپنی لاٹھی کو پہنا دی تھی اور اپنی چھوٹی سی تنگ دھوتی کو لنگوٹ کی طرح لپیٹ لیا تھا۔ اور اپنی ہیکڑی میں ہانک لگاتا چلا جا رہا تھا۔ موسم بدل رہا تھا۔ مگر ہوا میں اب بھی خنکی تھی۔

اس نے اس دن کی مجوری سے راستے میں خوب تاڑی پی لی تھی۔ مجوری کے سارے پیسے اس نے اپنی ذات پر خرچ کر لئے تھے۔ اسے اس وقت سکری کا خیال ضرور آیا۔ لیکن ادھر وہ اس سے بے طرح ناراض رہنے لگا تھا۔ وہ اس کی طرف سے بے دھیان تھی۔ تو وہ اس کی پروا کیوں کرتا۔

راستے میں اس نے ایک جگہ ایک انسان کی لاش پر گدھوں کو چونچ گاڑ گاڑ کر گوشت نوچتے ہوئے دیکھا تھا۔ جب وہ قریب گیا تو گدھ بھاگے نہیں۔ اس کے دل میں اس لاش کو دیکھنے کی عجیب پراسرار خواہش پیدا ہوئی۔ اس نے جب نچے پھٹے مردہ جسم کو دیکھا تو اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنے آپ کو دیکھ رہا ہے۔ شاید وہ کل مر جائے تو اس کا بھی یہی حال ہوگا۔ ایں گدھ اس کی طرف چونچ اٹھا کر نڈر لپکے تو وہ وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا۔ بے تحاشہ اس کے کانوں میں دیر تک گدھوں کے خوفناک قہقہے چکر لگاتے رہے۔

اور اب بھی جبکہ وہ اپنے گھر پہنچ گیا تھا' اس کے ذہن کے پردوں پر وہی لاش تھی۔ اس کا نچتا

ہوا سوکھا گوشت' ٹن ٹن بولتی ہوئی ہڈیاں' ناریل کی طرح چمکتی ہوئی کھوپڑی اور گدھوں کا وہی خوفناک بھیانک قہقہہ گونج رہا تھا اور کہیں دور سے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ اسے پہلی بار زندگی میں گیدڑوں اور کتوں کی آواز ڈراونی اور دل آزار محسوس ہوئی۔

وہ آدھی رات تک سکری کا انتظار کرتا رہا۔ لیکن وہ نہیں آئی۔ پہلے تو وہ صرف اوٹ پٹانگ گاتا رہا۔ کراہتا رہا۔ قہقہے لگاتا رہا اور پھر بکنے لگا۔

"سکری تو چڑیل ہے۔ بنیا راکھشش ہے۔ چھوٹے سرکار۔۔۔۔ اس کی کوٹھی میں کتنا غلہ ہے۔ یہ چاول چھینا جا سکتا ہے۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔ چلو۔۔۔۔ چلو ہاہاہا۔ کوٹھی سے چاول چھین لو۔ میرا کھیت کتنا اچھا ہے۔ وہ جل گیا۔ پر وہ سکری کی طرح چڑیل نہیں ہے۔ وہ بنیا کے پاس نہیں جاتا۔ سالا کھیت مانگتا ہے۔ ابے کانے وہ کھیت ہے کھیت۔۔۔۔ وہ سکری کی بچی۔"

کبھی اس کی بکواس کا اتار چڑھاؤ دردناک معلوم ہوتا اور کبھی اس میں ایک کرب انگیز جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی۔

دبے پاؤں سکری داخل ہوئی۔ وہ سمٹی سمٹائی آکر ایک طرف کونے میں بیٹھ گئی۔ منگرا بڑبڑاتا رہا۔

"سکری سالی حرامی ہے۔ کانا بنیا بھی حرامی ہے۔۔۔۔ میرا کھیت' چھوٹے سرکار تم تو ان داتا ہو۔۔۔۔ ایں' پھر کوٹھی میں چاول رہتے ہوئے اکال کیوں۔۔۔۔ میں تو تمہارا کمیا ہوں۔ ہاں ٹھیک تمہیں تو اسی سال اپنی بیٹی کی شادی کرنا ہے۔ ہاتھی اور گھوڑے سے سجی برات آئے گی۔ شہنائی بجے گی۔ انگریزی باجا بجے گا۔ کیوں۔ ایک بات کہہ دوں چھوٹے سرکار۔ اب کے اسٹیشن سے گاؤں تک دوسرا راستہ بنانا ہوگا۔ پہلے والے راستے پر لاش ہے' سڑی سڑی بدبو اٹھتی ہے۔ کیا کہیں گے براتی۔ ناک سکوڑے سکوڑے کب تک آدمی کی ہڈیوں کے بیچ چلتے رہیں گے اور پھر دولہا بابو کو سہاگ رات ہو ہو ہو۔ میرا کھیت۔ راما ہو راما۔ ہاہاہا۔ میرا دھان۔ راما ہو راما۔۔۔۔ میری جورو۔۔۔۔ کہاں جاتے ہو رسیا۔۔۔۔ مہوا کا دارو ڈھال کا کا۔ لیکن تو تو مر گیا ہے کاکا۔ اور کون جانے وہ کھوپڑی۔۔۔۔ باسمتی چاول کھائے رے موہنا' ارے یہ مجال'

چھوٹے سرکار کیا کھائیں گے۔ پھر دو من کا بوجھ کیا ہے منگرا کے لئے۔ ہش۔ مانو چھوٹے سرکار کی بیٹی کے ماتھے پر سہرے کے پھول ہیں۔ ہی ہی ہی ہو ہو۔۔۔۔ لیکن اتنا مان لے۔ تجھے سرکی قسم۔ سکری کی قسم۔ اتنا تو ماننا ہی پڑے گا۔ تو گدھا ہے۔ ٹٹو ہے۔ خاندانی گدھا' پیدائشی ٹٹو۔ کیا ہے نا۔ دو من کا بوجھ اٹھا لیتا ہے۔ شاباش۔ ہی ہا ہا۔ تاڑی ہو تاڑی۔ راما ہو راما۔"

وہ اچھل کر ناچنے لگا۔ پھر اچانک کھمبے کی طرح ساکت کھڑا ہو گیا اور گلا پھاڑ کر رونے لگا۔ پھر اٹھا اور ناچتے ناچتے سکری پر جا گرا۔

جیسے اسے بجلی کی لہر نے چھو دیا ہو۔ اس نے پوری وحشت سے اندھیرے میں ہی سکری کی بنیا کی دی ہوئی نئی ساڑی کھینچ لی۔ وہ مادرزاد برہنہ اندھیری رات میں لپٹی ہوئی تھی۔ چند آنے پیسوں کی جھنکار اور زمین پر گرے ہوئے تمباکو کی بو منگرا کے خون میں گردش کرنے لگی۔

"تو حرامی ہے سکری۔۔۔ تو کتیا ہے۔ تو بھوکی ہے۔ میں بھی بھوکا ہوں۔ پر تو حرامی ہے۔ میں حرامی نہیں ہوں۔ کتیا ہی ہو نہہ۔۔۔ سوریا ہی ہو نہہ 'تھو تھو تھو۔"

اس نے سکری کو بال پکڑ کر اٹھا لیا اور زمین پر چت پٹک دیا اور اس کے سینے پر سوار ہو گیا۔ پہلے دھڑا دھڑ گھونسے سوکھے منہ پر پڑے اور ناک سے خون تڑتڑ پھوٹنے لگا۔۔۔۔ تھوڑی دیر کے لئے اس نے اپنی مٹھی میں لگے ہوئے خون کی گرمی محسوس کی اور رک گیا۔ مڑا اور اس کے ننگے پیڑو کو ٹٹولنے لگا۔ سکری بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اس کے ہاتھ نے کوئی کڑی دھڑکتی ہوئی زندہ چیز محسوس کی۔ "ارے یہ تو براہیل کا سر گھٹا ہوا ہے۔ سالا یہاں گھس پڑا ہے۔۔۔۔ ہو ہو ہو۔ براہیل کی مونچھ ہے۔ براہیل کے دانت ہیں۔ ہی ہی ہو ہو اور یہ اس کے منہ کی سڑانڈ ہے۔۔۔۔ یہ گالی ہے گالی نا!"

وہ بکتا جا رہا تھا اور گھونسے برساتا ہوا جا رہا تھا اور ہر گھونسے کے ساتھ سکری کا کلیجہ چیخ بن کر منہ سے باہر چھلانگ لگا رہا تھا۔

"نکال سالے براہیل کو' ابھی نکال۔۔۔۔ نکال چھوٹے سرکار کی کوٹھی کا یہ حرامی بچہ۔" میں اس کا خون پی جاؤں گا۔ میں اس کو اپنے کھیت میں زندہ گاڑ دوں گا۔"

موہنا بھونکتا ہوا اندھیرے میں تڑپتا ہوا جھپٹا اور آتے ہی اس نے منگرا کی ران میں اپنے دانت گاڑ دیئے۔ منگرا نے بائیں ہاتھ سے موہنا کو جھٹک دیا اور باہر چلا گیا۔

وہ نیم کے درخت کے تنے سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا۔ سامنے چھوٹے سرکار کی حویلی کی طرف سے کچھ سائے نظر آئے۔ بیلوں' خچروں اور ٹٹوؤں کا ایک چھوٹا سا کارواں چاول کے بوروں سے لدا ہوا سامنے سے دھبوں کی طرح گزر رہا تھا۔ کانا بنیا اور اس کے ساتھ ساتھ دو تین آدمی اس کارواں کو ہانکتے ہوئے دکھنی پہاڑی کی طرف چلے جا رہے تھے۔ جہاں صرف ایک سرکاری چوکی۔ دو تین سو روپے میں معاملہ پٹ جاتا اور سرکاری ممانعت کا حکم نامہ برف کے گالے کی طرح پگھل جاتا اور پھر جنگلی راستوں سے ہوتا ہوا یہ چاول کا کارواں دوسرے ضلع میں پہنچ جاتا تھا۔

منگرا کا دماغ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ کارواں مہیب رینگتے ہوئے سایوں کی طرح آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔ بنئے کی ڈانٹ اور ہانک کی آواز دب گئی تھی۔ جھلسے ہوئے آکاش پر سنہرے چاول کے ان گنت دانے بکھرائے ہوئے تھے۔

منگرا کے کانوں میں سکری کے کراہنے کی تکلیف سے بھری ہوئی آواز سلاخ کی طرح رینگ رہی تھی جو جلتی ہوئی اس کی روح تک اترتی چلی جا رہی تھی۔

ہر طرف سناٹا تھا۔ اچانک اس سناٹے میں دور کہیں سے درختوں پر اودھم مچ گئی اور ساری فضا چڑیوں کی چاؤں چاؤں سے گونج اٹھی۔ رات ڈھل رہی تھی۔ کبوتر خانے سے پر پھڑپھڑاتا ہوا کبوتر کا جوڑا اڑا اور دکن کی طرف زناٹے کے ساتھ نکل گیا۔ اندھیرے کی جھولی سے مسجد کے اٹھے ہوئے فریادی بھکاری ہاتھ ابھرنے لگے۔ سکری کی ایک دلدوز چیخ نے ہر چیز کو تھرا دیا۔ موہنا نے اپنی دونوں اگلی ٹانگیں منگرا کی ران پر جمادیں اور زخم سے ابلتے ہوئے گرم اور تازہ خون کو زبان سے چاٹنے لگا۔

سکری نے پھر ایک خوفناک چیخ ماری جیسے کہیں قریب سے ہی کسی زندہ سور کی کھال اتاری جا رہی ہو۔

منگرا کا دل دھڑکنے لگا۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ اس کے اپنے دل کی دھڑکن تھی یا موہنا کے خون چاٹنے کی آواز۔

اندھیرے میں خچروں، ٹٹوؤں اور بیلوں کا ایک اور کارواں ابھرا اور رینگتا ہوا دکھنی پہاڑی کی طرف منہ پھاڑے ہوئے اندھیرے کے جنگل میں غائب ہونے لگا۔

کتے نے دونوں ٹانگیں زمین پر رکھ دیں۔ اس نے زبان چٹپٹائی اور انڈے کے چھلکے کی طرح اترتے ہوئے بھرپور جماہی لی۔

لیکن اس کے بعد پھر سکری کے رونے اور کراہنے کی آواز سنائی نہ دی۔۔۔!

○

ڈھلان

ابھی دوپہر کی دھوپ کالی کلوٹی مین روڈ پر، بڑی بڑی، عنابی اور اجلی پیلی عمارتوں پر چمک رہی تھی۔

طفیل ٹریفک کانسٹبل کے سامنے سڑک کے کنارے کھڑا ہوگیا۔ اس کا لباس، اس کے ویران بال، اس کے ہاتھ کا تھیلا، اس کے خشک ہونٹ جن کی پپڑیاں وہ برابر اپنے تیز دانتوں سے کھرچ رہا تھا ـــــــ ہاں ان سب چیزوں سے، ان سب سیلانی حرکتوں سے، بڑی وحشت ٹپک رہی تھی۔ وہ ایک ایسی مچھلی دکھائی دیتا تھا جو سمندر میں اکیلی ہو اور جس کے چاروں طرف مگرمچھ منہ پھاڑے ہوئے تیر رہے ہوں۔

اس نے اپنے خشک لبوں پر زبان پھیرتے ہوئے ٹریفک کانسٹبل سے پوچھا ''کیوں بھئی! اس سڑک کا کیا نام ہے؟'' اس شہر میں وارد ہونے کے بعد طفیل کا یہ پہلا مکالمہ تھا۔ بگڑے کانسٹبل نے ایک نگاہ غلط انداز سے معشوق کی طرح اس کی طرف دیکھا، مسکرایا اور ایک ہارن بجاتی ہوئی کار کو ہاتھ دکھانے لگا۔ کار گزر گئی اور طفیل اپنے خشک ہونٹوں کی پپڑیاں کھرچتا رہا۔ کانسٹبل کا اٹھا ہوا ہاتھ گر گیا۔ اس نے رحم بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھا اور اپنی خاکی پگڑی کے سرخ پھندے کو انگلیوں سے سہلاتے ہوئے کہا ''یہ مین روڈ ہے۔''

''اچھا تو ایسا ہوتا ہے مین روڈ'' طفیل نے حیرانی کا لہجہ اختیار کرتے ہوئے کہا جیسے اس نے اس سڑک کا نام بہت سن رکھا ہو۔

''اور نہیں تو کیا ـــــــ مین روڈ کے کوئی سینگ ہوتے ہیں؟ لیکن اب اس کا نام بدل گیا ہے۔

اب اسے گوتم بدھ پتھ کہتے ہیں ــــ چلو یہاں سے کھسک جاؤ ورنہ دیکھتے نہیں' یہ کاریں جھپٹ لے جائیں گی تمہیں ــــ اور پھر ــــ" اور پھر وہ اپنے ہاتھ مشین کی طرح الٹے سیدھے نچانے لگا۔
"گوتم بدھ پتھ ــــ چغد صحرائی پتھ ــــ ایڈیٹ ــــ فول"

وہ دل ہی دل میں بخار نکالتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ سامنے ایک بہت ہی رنگین قسم کا مارکیٹ تھا۔ وہاں ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ لیکن یہ بھیڑ مچھلی کی دکان کی بھیڑ سے مختلف تھی۔ یہ بھیڑ صاف شفاف تھی۔ آسودہ اور نرم گام۔ باہر سائیکلوں کے اسٹینڈ کے پاس لیچی کی دکان پر کچھ صاحب نما اور کچھ چپراسی نما لوگ کھڑے تھے۔ طفیل کا جی بھی چاہا کہ اور کچھ نہیں تو اس اجنبی شہر میں لیچی ہی کھائی جائے۔ اس نے اپنی پتلون میں بایاں ہاتھ ڈال کر ایک چونی نکالی جو اکیلی اس کی رفیقہ حیات تھی۔ اس نے بڑی حسرت بھری نظروں سے اس چونی کو دیکھا۔ جب وہ چونی دیکھ رہا تھا اور اپنے ہونٹ سے پپڑیاں کھرچ رہا تھا اسے محسوس ہوا کہ دھوپ کی جلن اچانک مٹنے لگی ہے۔ اس کی آنکھیں اوپر اٹھ گئیں۔ ایک طرف سے سیاہ بادل امڈتے چلے آرہے تھے اور سورج کی کرنیں چاندی کی جھالروں کی طرح بادل کے کناروں پر لہرا رہی تھیں۔ پارے کی طرح تڑپ رہی تھیں لیکن بادل آگے ہی بڑھتے جارہے تھے اور سر پر چھاتے ہی چلے جارہے تھے۔ اس نے قمیص کے بٹن کھول دیئے۔ پسینے سے بھیگے ہوئے سینے پر ہوا نے ہاتھ پھیر کر اس کے پورے جسم میں ایک خوشگوار خنک اور تھکی ہوئی پھریری سی دوڑا دی۔

وہ سب کچھ بھول گیا اور اس نے جھٹ اپنی چونی لیچی والے کی ہتھیلی پر رکھ دی۔

ایک موٹر سائیکل آکر ٹھیک اس کے قریب رک گئی۔ اس نے پتے سمیت لیچیاں اپنی دونوں کھلی ہوئی ہتھیلیوں میں لیں اور مڑ کر موٹر سائیکل کی طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت اس کا تھیلا اس کی کہنی تک سرک کر پہنچ گیا تھا اور بہت ہی مایوس کن انداز میں بند ہوتی ہوئی گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہل رہا تھا۔

اس کی آنکھیں جم کر رہ گئیں۔ اس کے سامنے ایاز خان کا چہرہ تھا۔ لیکن اس کا جسم ایاز خان کا جسم نہیں تھا۔ اس کا رنگ وہی تھا۔ صندل کی طرح رستا رستا گھبراہٹ میں پسیجتا ہوا۔ لیکن ایاز

خان اتنا موٹا کیسے ہو سکتا تھا۔ کالج تک تو وہ بالکل چھریرے بدن کا نوجوان تھا۔ تیز چمکیلی چھری کی طرح ادھر سے ادھر تڑپتا ہوا اور ہمیشہ گھبرایا اور پسیجتا ہوا اور اپنے دکھتے ہوئے شرمسار ماتھے سے پسینے کو رومال میں جذب کرتا ہوا۔ چہرہ تو وہی تھا لیکن جسم تو بہت بھاری ہو گیا تھا۔ بھاری کیا خاصا موٹا ہو گیا تھا۔ پیٹ اتنا نکل آیا تھا کہ پتلون ٹھہرتی نہیں تھی اپنی سرحد پر مشین کی سانس اکھڑ چکی تھی اور بھاری بھر کم ایاز خان فیشنبل مارکیٹ میں گھس گیا تھا۔

ہاتھ رکشائیں اپنی گھنٹیوں کے ترنم کے ساتھ بھاگ رہی تھیں۔ کاریں گزر رہی تھیں۔ بادل اور کالے ہو کر نیچے جھک آئے تھے۔ رکشا کھینچنے والے اس لئے تیز دوڑ رہے تھے کہ ان کے پیر سڑک کی پگھلتی ہوئی کولتار میں چپک کر نہ رہ جائیں۔ لیکن طفیل نے سڑک کی اور دوسری چیزوں سے اپنی توجہ ہٹا کر موٹر سائیکل کا ایک چکر لگایا' دوسرا اور تیسرا۔ اس دوران میں وہ لیچیاں کھا چکا تھا اور اپنی وحشت میں دو تین گٹھلیاں بھی اپنے بھوکے پیٹ میں اتار چکا تھا۔ اب اس کے ہاتھ میں لیچی کی سبز پتیاں تھیں اور وہ انہیں ایک ایک کر کے نوچ رہا تھا اور اپنے نچلے ہونٹ کی پپڑیاں نوچے جا رہا تھا جس سے اب خون کے ننھے ننھے موتی ابھرنے لگے تھے۔

وہ موٹر سائیکل کو دیکھ ہی رہا تھا کہ ایاز خان اس کے پاس آکر کھڑا ہو گیا اور اسے غور سے دیکھنے لگا۔ طفیل سٹپٹا گیا اور وہ وہاں سے ہٹنے والا ہی تھا کہ ایاز خان نے اپنی پتلون پیٹ کے اوپر کھینچتے ہوئے اور پلاسٹک کے کمر بند کو اوپر سرکاتے ہوئے کہا "میں نے۔۔۔۔ میں نے۔۔۔۔ آپ کو کہیں دیکھا ہے۔۔۔۔ معاف کیجئے گا۔۔۔۔ میرا ایک دوست۔۔۔۔"

"جی میں بھی۔۔۔۔ کیا آپ ایاز خان۔۔۔۔"

ایاز خان موٹر سائیکل کا چکر لگا کر اس کے پاس پہنچ گیا۔۔۔۔ اوہ طفیل۔۔۔۔ مائی ڈیر طفیل۔۔۔۔ ایاز خان اس سے لپٹ گیا۔ لیکن طفیل کے ہاتھ نیچے ہی گرے رہے۔ اس نے تھیلے کو اور زور سے دبوچ لیا تھا۔

"ارے تم یہاں کہاں۔۔۔۔ کیا صورت بنا رکھی ہے" ایاز خان نے اسے چھوڑتے ہوئے پوچھا "تم تو بالکل شرنارتھی معلوم ہوتے ہو۔"

"ہوں۔۔۔۔"

"کچھ بتاؤ تو سہی ــــــ یہ کیا حلیہ ہے؟"

طفیل نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا سن رہا ہے اور کیا کہہ رہا ہے۔ اس کے ہاتھ میں پیچی کی پتیاں اب بھی تھیں اور وہ انہیں نوچے جا رہا تھا "کیا بتاؤں ایاز خان ــــــ عجیب حادثہ ہوا ہے میرے ساتھ۔"

"کیوں کیا بات ہے۔ کہاں ہو۔ کیا کر رہے ہو؟"

"لکھنؤ میں بزنس کر رہا ہوں۔ بزنس ٹور پر ہی تھا۔ رات ٹرین سے میرا بکس' بستر اور دوسری چیزیں لے کر کوئی اتر گیا۔ میری آنکھ کھلی تو میں اس اسٹیشن پر تھا۔ میں اتر گیا ــــــ اب مارا مارا پھر رہا ہوں۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ تم یہاں ہو ــــــ" طفیل نے یہ کہانی سنا دی۔ لیکن اس کو یقین تھا کہ ایاز خان کو اس کا یقین نہیں آیا ہوگا۔ اس لئے کہ وہ دیکھ رہا ہوگا کہ اس کی قمیض کتنی بوسیدہ ہے' اس کی بنیان کتنی میلی ہے اور پسینے میں اس کا جسم کس طرح چکٹ ہو رہا ہے۔ اس کی پتلون کتنی خستہ اور بے کریز ہے۔ اور جوتے کا پوچھنا ہی کیا ــــــ پھر یہ تھیلا ــــــ پھر یہ ــــــ وہ اسی طرح سوچ رہا تھا اور ایاز خان سے آنکھیں ملائے بغیر ادھر ادھر دیکھ رہا تھا کہ ایاز خان نے اس کے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "تو پھر کیا ہوا بھئی' اپنا گھر ہے۔ چلے چلو۔ ایں؟"

طفیل خان نے مسکراتے ہوئے اور اپنے ہونٹ پر جمے ہوئے خون کو اپنی زبان سے چاٹتے ہوئے اپنی آنکھیں اٹھائیں تو اس نے دیکھا کہ ایاز خان کے ہونٹوں پر ایک ظالمانہ مسکراہٹ ہے اور آنکھوں میں رحم کا اندھیرا چمک رہا ہے۔

جب وہ ایاز خان کے ساتھ موٹر سائیکل پر بیٹھا ہوا ڈھلان پر اتر رہا تھا اور ادیباسی عورتیں سروں پر جنگلی لکڑیوں کے بوجھ اٹھائے پتنگوں کی طرح اڑتی چلی جا رہی تھیں تو اس نے ایسا محسوس کیا جیسے تیزی سے' بہت تیزی سے' بجلی کی تیزی سے' خلا میں گرتا چلا جا رہا ہے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور خشک بال اس کی پیشانی اور گالوں پر چیونٹیوں کی طرح چپک رہے تھے۔ اور اس کا تھیلا اس کی گود میں ایک مردہ بچے کی طرح پڑا ہوا تھا ــــــ اور موٹر سائیکل چیختی ہوئی ڈھلان میں اترتی چلی جا رہی تھی ــــــ پھٹ پھٹ ــــــ بادلوں نے ساری فضا میں خنکی اور اندھیرا بھر دیا تھا۔

اچانک دائیں طرف موٹر سائیکل جھکی اور ایک سفید پھاٹک میں دندناتی ہوئی اندر گھس گئی اور برساتی میں جاکر رک گئی۔

ایاز خان پلٹ کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے دونوں گالوں میں گڈھے سے پیدا ہو گئے۔ تمبا کو سے رنگے ہوئے دانت جھلکنے لگے اور بینگنی رنگ کی ٹائی ہوا میں اڑنے لگی جس پر ایک امریکی عورت کی ننگی ٹانگ ہوا کے جھونکوں سے ہل رہی تھی۔

"یہی ہے ہمارا گھر۔ آؤ۔ آؤ۔ یار تم تو بالکل وہ رہے ہی نہیں۔ اتنی مردنی کیوں ـــ۔ آؤ ـــ۔ آؤ"

آگے آگے ایاز خان اور اس کے پیچھے طفیل بنگلے میں داخل ہوئے۔ کمرہ نیم تاریک تھا اور اس میں ایک سبک سی خنکی روپوش تھی۔ ایاز خان نے اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پردہ اٹھا کر اندر چلا گیا۔ طفیل کا سر چکرانے لگا۔ اس کا جی چاہا کہ وہ اٹھ کر یہاں سے بھاگ جائے۔ لیکن وہ تو صوفے میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ اس کا تھیلا اب اس کے ہاتھ میں نہیں تھا۔ اسے یاد بھی نہیں تھا کہ وہ اسے اندر لایا بھی تھا یا نہیں۔ پردے آہستہ آہستہ سرگوشی سی کر رہے تھے۔ پردوں کا رنگ گہرا نیلا تھا۔ پردوں پر پیلے رنگ کی دو پہاڑی عورتیں بنی ہوئی تھیں۔ ایک عورت پورے آہنگ سے ناچ رہی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ جڑے ہوئے تھے اور دوسری عورت جھکی ہوئی اور آہستہ آہستہ تھرکتی ہوئی ڈھولک پر تھاپ لگا رہی تھی۔ طفیل کو محسوس ہوا کہ اس کے کانوں میں دھیمے دھیمے سروں میں گانے اور ناچنے کی آواز آرہی ہے۔ وہ چونک پڑا۔ اندر سے ایک عورت کے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ طفیل اپنے لباس کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا لباس کتنا خراب ہے۔ اس گھر میں تو وہ اس وقت ریشم میں ٹاٹ کا بخیہ معلوم ہو رہا ہے۔ ایں۔ بس بھاگ چلنا چاہئے۔ ایک قہقہے نے اسے پھر چونکا دیا۔ اندر کی طرف کا پردہ سرگوشی کے انداز میں ہل رہا تھا اور اس پر سنہرے ہیولے اسی طرح ناچ رہے تھے۔

اسے غنودگی سی محسوس ہو رہی تھی کہ ایاز خان کمرے میں پھر واپس گیا۔ وہ اب دوسرا سوٹ پہنے ہوئے تھا۔ سر سے پیر تک سفید۔ اس نے آتے ہی گولڈ فلیک کا ٹین اس کی طرف بڑھایا۔ طفیل نے میکانکی انداز سے سگریٹ لی اور پینے لگا۔ اس کا دم گھٹنے لگا۔

"طفیل کتنے دنوں کے بعد ملے ہیں ہم۔ اف آدمی نہیں جانتا کب کس سے چھوٹ جائے گا۔ کب کس سے مل جائے گا۔"

پردے کے ہلنے سے روشنی کا ایک لمحاتی عکس ترچھا ہو کر اندر آتا اور ایاز خان کے چہرے پر سے نیم تاریکی کی نرمی دور کر دیتا۔

"زندگی میں بہت سی باتیں توقع کے خلاف ہوتی ہیں اور آدمی حیران رہ جاتا ہے۔" طفیل نے یہ بات بے سوچے سمجھے کہی تھی اور اس وقت وہ اس بات کی پوری معنویت سے بھی آگاہ نہیں تھا۔ اس کا سر اور زور سے سنسنانے لگا تھا۔ اس کے اندر ایک خاموشی امڈ رہی تھی اور حلق تک پہنچ کر وہ چیخ بن جاتی تھی۔ وہ اس چیخ کو دھوئیں کی تلخی میں گلا گھونٹ کر مار رہا تھا' دبا رہا تھا' پیچھے دھکیل رہا تھا۔

"ہاں۔۔۔۔ لیکن میں تو تم سے مل کر بہت خوش ہوا۔ اچھا ہوا کہ چور تمہارا سامان صاف کر گیا ورنہ پھر یہ ملاقات کیسے ہوتی۔"

"ہاں بہت اچھا ہوا۔ مجھے بھی تم سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ یونی ورسٹی کے دن یاد آگئے۔" طفیل نے غیر ارادی طور پر ایک لمبا کش کھینچتے ہوئے کہا۔ اس کی آواز بھرا گئی اور اس نے لرزتی ہوئی انگلیوں سے سگریٹ کا جلا ہوا آخری ٹکڑا راکھ دان میں کچل کر چھوڑ دیا اور دیر تک اس میں سے زندگی کو دھوئیں کی شکل میں پرواز کرتے ہوئے اور مٹتے ہوئے دیکھتا رہا۔

تمہارے کپڑے تو سب لے کر چمپت ہو گیا۔ خیر کوئی بات نہیں۔ میرے کپڑے تو تمہیں آئیں گے نہیں۔ دیکھتے نہیں دنیا کی فکر نے مجھے کیسا ہاتھی بنا دیا ہے۔ لیکن میرا چھوٹا بھائی بڑا لا ابالی ہے۔ وہ اپنے کپڑے یہاں چھوڑ گیا ہے۔ وہی پہن ڈالو۔ اچھا ہے وہ لا ابالی ہے۔۔۔۔ کیوں۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ لیکن۔۔۔۔"

"لیکن ویکن نہیں دوست۔ چلو اٹھو یہاں سے۔ تم بہت تھکے ہوئے ہو۔ آؤ نہالو۔۔۔'

وہ طفیل کو بغل والے کشادہ کمرے میں لے گیا۔ وہاں ایک چمڑے کے سوٹ کیس میں اس

کے سائز کے بہت سے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔ ”انہیں بے فکر استعمال کرو۔۔۔۔ اور یہ رہا غسل خانہ۔۔۔۔“ اس نے ایک اور دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔

طفیل جب اس کمرے سے دوبارہ ایک سوا گھنٹے بعد نکلا تو اس کا گندمی رنگ شیو کرنے کی وجہ سے پانی میں بھیگ کر نکھر آیا تھا۔ اس کے بال سجے ہوئے تھے۔ البتہ آنکھیں سرخ تھیں اور نچلے لب پر پپڑیوں کے کھرچے جانے کا باریک سا نشان موجود تھا۔ اس وقت وہ ایک سفید ململ کا کرتہ اور لٹھے کا چکنا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ جب وہ واپس کمرے میں پہنچا تو وہاں ایاز خان کے برابر ہی ایک نازک سی عورت بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے بال شانوں تک کٹے ہوئے تھے۔ آنکھیں شوخی اور حقارت سے بھری ہوئی تھیں۔ طفیل ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

”آہا آؤ۔۔۔۔ یہ رہیں بھئی میری نیلوفر۔۔۔۔ میری لائف پارٹنر۔۔۔۔“

”اچھا“ طفیل انہیں سلام کر کے صوفے پر بیٹھ گیا۔

”دیکھو طفیل میں تو ایک جگہ اس وقت ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تم نیلو کے ساتھ کھانا کھا لینا۔ آں؟۔۔۔۔ میں رات کو ملوں گا۔ پھر باتیں ہوں گی۔“

ایاز خان کے جانے کے بعد بارش شروع ہو گئی اور جب طفیل نیلوفر کے ساتھ کھانے کے کمرے میں پہنچا تو سامنے پست دیواروں سے آگے آم کے درختوں کا جنگل سا بسا ہوا نظر آ رہا تھا۔ پانی میں نہا کر یہ درخت بہت مگن' خوش اور گاتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ ایک ہلکی سی خوشی کا احساس طفیل کے دل میں بھی پیدا ہوا۔ ملازم مودبانہ ایک طرف دہلیز سے آگے نکل کر آنگن کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو گیا۔ طفیل نے ایک مبہم سی طمانیت کے جذبے کے ساتھ اپنی آنکھیں نیلوفر کی طرف اٹھائیں۔ اس کی آنکھیں اس وقت جھکی ہوئی تھیں' لیکن سرمے کی لکیریں پلکوں کے جنگل سے جھانک رہی تھیں۔ اس کے لب لپ اسٹک کی بہت ہی موٹی تہہ کے نیچے اپنا گداز کھو چکے تھے۔ آنچل ریشمیں اور باریک تھا' اور اپنی ذمہ داریوں سے غافل۔

یہ عورت واقعی عورت ہے۔

یہ عورت بہت دلکش اور چکیلی ہے۔ دل میں اترتی چلی جاتی ہے۔

لیکن یہ میرے دوست کی بیوی ہے۔ جس نے مجھے پناہ دی ہے۔

مجھے زندگی میں ایک بار تو شرافت کے ساتھ سوچنا چاہیے۔

طفیل خاموش اسی طرح کھانے کے دوران میں سوچتا رہا۔ "مجھے ایاز خان کے اعتماد کے ساتھ کھیلنے کا کوئی حق نہیں۔"

یکایک چاندی کی گھنٹیاں سی بول اٹھیں "کیوں پڈنگ تو کھائیے۔"
"جی۔۔۔۔جی میں میٹھی چیز بالکل نہیں کھاتا۔"
"کیوں۔۔۔۔ کھائیے تو سہی۔ میٹھی چیز کوئی زہر تو نہیں ہوتی" نیلوفر نے اپنے بال جھٹکتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ اس وقت اس کی آنکھیں پورے وحشیانہ زہر قند سے اس کے چہرے پر چبھ رہی تھیں۔ طفیل نے دوسری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "معاف کیجئے۔"
"بارش تیز ہوتی جا رہی ہے۔ کیا آپ کے احاطے میں صرف آم کے ہی پیڑ ہیں۔ کتنے پیڑ ہیں۔۔۔۔"
"بھئی ہم تو آم کھانا جانتے ہیں' پیڑ گننا نہیں جانتے۔"

طفیل اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر مصلحت نے اس کی زبان پکڑ لی۔

تھوڑی دیر تک اسی کمرے میں گولڈ فلیک کے کش لگاتے لگاتے اسے نیند آ گئی۔ جب اس کی انگلیاں جلنے لگیں تو اس نے سگریٹ کے ٹکڑے کو راکھ دان میں پھینک دیا اور صوفے میں ہی ایک کونے میں دھنس گیا اور زور زور سے سانسیں لینے لگا۔

اس وقت بنگلے میں سناٹا چھا گیا تھا۔ ملازموں نے سارے دروازے بھیڑ دیئے تھے۔ ہر طرف کمروں میں اندھیرا رینگ رہا تھا۔

باہر برآمدے میں ایاز خان کا کتا کبھی کبھی بھونکنے لگتا تھا اور بارش کی آواز اس کی بھونک میں کھو جاتی تھی۔

ہوا درختوں میں چیخ رہی تھی۔ رات سیاہ پیپ کی طرح آہستہ آہستہ ٹپک رہی تھی۔ چاندنی میں آم' لیچی اور جامن کے درخت بہت پر اسرار اور زندگی پر چھائے ہوئے معلوم ہو رہے تھے۔

طفیل نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور اپنی آنکھیں کھول دیں۔ دور سے گھڑیال کی آواز آ رہی تھی۔ گیارہ بج گئے تھے۔ ایاز خان ابھی تک واپس نہیں آیا تھا۔ شام کی چائے پر طفیل اکیلا شغل کرتا رہا تھا۔ اسے بڑی گھبراہٹ محسوس ہوتی رہی تھی۔ رات کے کھانے پر نیلو فر منہ بنائے بڑی نزاکت سے کھانا کھاتی رہی تھی۔ اور اس نے ایک بار بھی اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا تھا۔ اس طرح اسے اس کے چہرے پر نظریں گاڑ کر دیکھنے کا کافی موقع مل گیا تھا۔ وہ کھانے کے دوران میں پھر ایک بار وہی باتیں سوچتا رہا تھا جو دن کے وقت کھانے پر اس کے ذہن میں پیدا ہو گئی تھیں اور جنہیں ڈنک مارتے ہوئے بچھوؤں کی طرح اس نے جھٹک کر الگ کر دیا تھا۔

بڑا اسڈول جسم ہے۔

لبوں میں بڑا گداز ہے 'بڑا رس' بڑا زہر ہے۔

آنکھیں بڑی خمار آگیں ہیں 'بڑی تیز' تیکھی اور غم کا مذاق اڑاتی ہوئی۔

لیکن اس وقت اسے ایاز خان کا انتظار تھا۔ آنکھیں بند کرنے کے بعد بھی اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ اندر سناٹا ہو گیا تھا۔ اب ریڈیو کی آواز بھی بند ہو گئی تھی۔ ملازموں کے دبے دبے قہقہے بھی سو گئے تھے۔ وہ باہر کے برآمدے میں پڑا بار بار مچھروں کو بھگا رہا تھا۔ چاندنی کی ترچھی روشنی اس کے پلنگ کی سفید چادر پر بھی لوٹ رہی تھی جس پر وہ بار بار ہاتھ پھیر رہا تھا اور وہ شیشے میں سے جھانکتی ہوئی خوابیدہ سی نیلی روشنی کو دیکھ رہا تھا جہاں سے کچھ دیر پہلے زرد روشنی کا طوفان امڈ رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی رسیلے گیت 'ٹھمری اور داد کے ریلے بھی۔۔۔۔

اب تو نیلو فر سو رہی ہو گی۔ اس نے شب خوابی کا لباس پہن لیا ہو گا۔ اس کے ہاتھ کہنیوں تک ننگے ہوں گے۔ ایک ہتھیلی پیشانی پر رکھی ہو گی اور دوسرا ہاتھ گال کے نیچے دبا ہو گا اور آنکھ کے نیچے رخسار کی پہریداری کرنے والے تل پر بال پر پھیلا کر چھا گئے ہوں گے۔۔۔۔ اور سانسیں اس طرح ابھر رہی ہوں گی جیسے ستار کے تار سے کوئی وجدانی نغمہ پھوٹتا ہے۔۔۔۔

موٹر سائیکل دندناتی ہوئی اندر گھس گئی اور برساتی میں آ کر رک گئی۔ طفیل اچک کر بیٹھ گیا۔ اور اپنی آنکھیں ملنے لگا جیسے گہری نیند میں ڈر گیا ہو۔ اس وقت ہوا میں خنکی اور زیادہ رچنے لگی تھی۔

ایاز خان موٹر سائیکل سے اتر کر اسی کی طرف بڑھا۔ اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے اور اس کے

لباس سے ایک انتشار اور لٹی پٹی ہوئی کیفیت کا اظہار ہوتا تھا۔

وہ آکر طفیل کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ تھوڑی دیر تک آہستہ آہستہ ہلتا رہا۔ اس کی ٹائی کی گانٹھ سینے تک اتر آئی تھی اور کالر کا بٹن کھلا ہوا تھا۔ اس کی پتلون توند سے نیچے سرک گئی تھی۔ اس نے طفیل کے کندھے پر ایک ہاتھ رکھتے ہوئے اپنی جیب سے ایک چپٹی سی بوتل نکالی۔

"دیکھتے ہو طفیل۔۔۔۔ میں اس وقت جن در جیب آیا ہوں۔ پیو! پیو اور دنیا کے سارے غم اس میں غرق کر دو۔"

طفیل نے اس کے مرتعش ہاتھوں سے جن کی بوتل لے لی۔ ایاز خان اس کے پاس ہی پلنگ پر بیٹھ گیا" کیوں مچھر دانی کیوں نہیں لگی۔ میاں یہاں تو مچھر تمہیں نوچ کھائیں گے۔۔۔۔ اچھا کوئی بات نہیں۔۔۔۔ ابھی دیکھتا ہوں' پیو میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ یہ کوئی ہندوستانی جن نہیں ہے۔ ہندوستانی چھوکری کی طرح شرمیلی' بے جان' مردہ سی شراب۔۔۔۔ ہونہہ۔۔۔۔ یہ جن ہے جن' انگلستان کی شراب۔۔۔۔ امریکی چھوکری کی طرح گرم۔۔۔۔ سنسنا کے چڑھتی ہے۔ ہاں۔۔۔۔ پیو پیو یار۔" اس نے زبردستی بوتل چھین کر اس کے منہ سے لگا دی۔ شراب جلتی ہوئی اس کے حلق میں دوڑنے لگی۔ اس کا سینہ جلنے لگا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ اور دونوں طرف لبوں سے شراب چھلک چھلک کر اس کی قمیص اور پاجامے پر گرنے لگی۔ وہ اپنا منہ ہٹانا چاہتا تھا لیکن ایاز خان پوری قوت سے اس کی گردن پکڑے ہوئے تھا۔ اور "پیو پیو۔۔۔۔ یہ ہندوستانی شراب نہیں۔۔۔۔ امریکی چھوکری ہے امریکی چھوکری" کی رٹ لگائے جا رہا تھا۔

"طفیل معاف کرنا' آج میں ایک بڑے بزنس میں لگا ہوا تھا۔ کام سولہ آنے پورا ہو گیا۔ یار بزنس بڑے تگڑم کا معاملہ ہے۔ تم بھی بزنس کرتے ہو۔ تم بھی تگڑم جانتے ہو۔ نیلوفر بھی بزنس کرتی ہے۔ وہ بھی تگڑم جانتی ہے۔ میں تگڑم' تم تگڑم' نیلوفر تگڑم۔۔۔۔ ساری دنیا تگڑم ہے دوست۔"

"ہاں ساری دنیا تگڑم ہے۔ ہماری پیدائش بھی تگڑم اور ہماری موت بھی تگڑم۔ تم بھی تگڑم اور میں بھی تگڑم۔۔۔۔" طفیل اب مزے میں جن کی بوتل خالی کر رہا تھا اور منہ بگاڑ بگاڑ کر

اپنی آستین سے لبوں کو رگڑ رگڑ کر چھیلے دے رہا تھا۔

دیر تک ایاز خان زور زور سے سانس لے کر بکتا رہا۔ طفیل پر بھی اب نشے کی کیفیت طاری ہو گئی تھی، لیکن وہ اس کی باتیں کان لگا کر سن رہا تھا۔

بات ہی بات میں ایاز خان نے اپنی زندگی پر سے پردہ سرکا دیا۔

علی گڑھ یونی ورسٹی سے نکلنے کے بعد سب سے پہلا سوال اس کے سامنے شادی کا آیا۔ اس کا زمیندار باپ اس بات پر مصر تھا کہ اسے شادی نہیں کرنی چاہئے۔ اس لئے کہ وہ دمے کا مریض ہے۔ ساتھ ہی اس نوجوانی میں بلڈ پریشر کا خطرہ بھی ہے۔ ماں کہتی تھی کہ شادی کا یہی وقت ہے۔ شادی سے دمے کو بھی فائدہ پہنچے گا اور دوسرے اس وقت جیسی لڑکی مل رہی ہے بعد میں نہیں ملے گی۔ سال میں برسات کا موسم ایک ہی بار آتا ہے۔ ایاز خان اس وقت خاندان کی ایک غریب لڑکی سے عشق کرتا تھا۔ اس نے اکثر کلکتے میں اس کی تیمارداری کی تھی اور ہلکے پھلکے فلمی گانے بھی سنائے تھے، لیکن جب شادی کا سوال آیا تو اس نے دوراندیشی سے کام لے کر ایک ہرے بھرے جنگل کے مالک زمیندار کی بھتیجی سے شادی کر لی۔ زیورات اور جہیز میں بڑا سامان ملا۔ لیکن بعد میں معلوم ہوا کہ وہ لڑکی مجوب ہے۔ ایاز خان نے اپنی زبان سے تاسف کی آواز پیدا کرتے ہوئے کہا "یار میں تو مارا گیا۔ میں اس عورت سے بیزار ہوں۔ کمبخت نکلی بھی تو مجوب نکلی۔ اور عقل تو بالکل نہیں۔ ہسٹریا کی مریض الگ۔ فیشن کا اتنا شوق ہے کہ ہر بار جب تیر نشانے پر لگتا ہے' اسقاط کی دوا کھا لیتی ہے۔ کمر کی نزاکت کھونا نہیں چاہتی۔ مجرم کہیں کی۔۔۔۔" وہ دیر تک اسی طرح اپنی زبان مروڑ کر اور ڈکار لے لے کر اپنی بیزاری کا اظہار کرتا رہا۔

اس نے شادی کے بعد اپنے باپ سے لڑائی مول لے لی۔ اس لڑائی میں اسے ماں سے محاذ مضبوط کرنے میں بڑی مدد ملی اور آخر میں باپ نے کھیت بیچ کر اس کے حصے کا روپیہ اسے دے دیا۔ اس نے لوہے کا کاروبار شروع کر دیا۔ ہر قسم کے بکس اس کے کارخانے میں بنتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کے کئی ٹرک چلتے تھے۔ ویسے وہ سرکاری نوکر پیشہ حلقے میں بہت ہردلعزیز تھا۔

طفیل کے دماغ میں ایاز کی زندگی کا تصور ذرا صاف ہو گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ بات بھی آ گئی

تھی کہ ایاز جو کبھی بالکل دبلا پتلا سا نوجوان تھا اور جسے علی گڑھ میں طلبا معشوق کہتے تھے' اتنا موٹا کیسے ہو گیا ہے۔ یہی ایاز یونی ورسٹی کی زندگی میں موٹی موٹی مارکسزم کی کتابیں پڑھتا رہتا تھا اور لوگوں کو انقلاب کی تلقین کیا کرتا تھا۔ مفت میں بحث کر کے دوستوں کو اپنے آپ سے ناراض کر دیتا تھا اور پھر اپنے حلقے میں بیٹھ کر کہا کرتا تھا "ذرا دیکھنا یہ سمجھتے ہیں اصول سے زیادہ مجھے ان کی دوستی عزیز ہے۔ میں انقلاب کے لئے بڑی سے بڑی چیز کی قربانی دے سکتا ہوں۔" اس پر کوئی منچلا کہہ دیتا۔ "میاں یہ علی گڑھ یونی ورسٹی ایک جزیرہ ہے۔ یہاں کوٹ پینٹ پہن کر گھومنا اور انقلابی تقریریں کرنا بہت آسان ہے۔ تمہارے ابا زمینداری سے دو سو روپے بھیج دیتے ہیں۔ پھر کیا ہے۔ یہاں سے نکل کر یہی جوش دکھاؤ تو ہم تمہیں انقلابی جان لیں گے۔" اس وقت ایاز کی آنکھیں غصے سے سرخ ہو جاتیں اور لب خشک ہو کر تھرتھرانے لگتے۔ وہ میز پر ہاتھ پٹک کر کہتا۔ "دیکھنا۔۔۔۔ میں موقع پرست نہیں ہوں۔"

ایاز نے ہنس کر بہت ہی درد کے ساتھ کہا۔ "یار میری زندگی بہت تلخ ہے۔ خیر اب سو رہو۔ میں کل صبح ملوں گا۔ ایں؟"

"لیکن ذرا ٹھہرو تو۔۔۔۔ میں بھی تمہیں کچھ اپنے بزنس کی داستان سنانا چاہتا ہوں۔ کچھ اپنی زندگی کا واقعہ۔۔۔۔"

"ارے چھوڑو بھی۔ تمہاری زندگی میں کوئی واقعہ ایسا نہیں ہوا ہے۔ تمہاری زندگی میں کوئی نیلوفر نہیں آئی ہے اور تمہارا بزنس۔۔۔۔ تو اس کے بارے میں مجھے سب معلوم ہے۔ مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ معلوم ہے۔ اچھا اب سو جاؤ۔ وقت برباد نہ کرو۔"

ایاز اٹھ کر اندر چلا گیا۔ طفیل ایک ہاتھ میں جن کی بوتل پکڑے ہوئے تھا اور دوسرے ہاتھ سے اپنا گال سہلا رہا تھا جیسے ایاز نے بھرپور تھپڑ جڑ دیا ہو۔ اس نے بوتل کو منہ سے لگا لیا اور ایک ایک قطرہ چوس گیا۔ اس نے بوتل زور سے پھینک دی۔ ٹائیگر زور سے بھونکا اور دوڑ کر جن کی بوتل کو سونگھنے لگا۔

وہ میرے بارے میں بہت کچھ جانتا ہے۔ کتے کا پلہ میرے بارے میں سب کچھ جانتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں نے اسے ایک جھوٹی کہانی سنائی ہے کہ کوئی میرا سامان لے کر گاڑی سے اتر گیا

ہے۔ وہ جانتا ہے کہ میں ایک زمانے سے ادھر ادھر چکر لگا رہا ہوں۔ کبھی اس شہر میں اور کبھی اس شہر میں۔ جہاں ٹرین انسپکٹر پکڑ لیتا ہے وہاں سفر ختم ہو جاتا ہے اور پھر اس نئے شہر میں سر ٹکرا کر اپنا بغیر ٹکٹ سفر شروع کر دیتا ہوں۔ ابھی بھی میری آنکھوں میں اس ٹکٹ انسپکٹر کا بھیانک چہرہ گھوم رہا ہے جس نے مجھے یہاں زبردستی ٹرین سے اتار دیا اور کھڑکی سے باہر تھوک کر کہا "جاؤ اس وقت تمہارا ستارہ بلندی پر ہے۔ ورنہ میں تمہیں حوالات میں بند کرا دیتا۔ جاؤ فقیروں میں بتاشے بانٹو" (بتاشے کی اولاد چوٹ کرتا ہے۔ خیر کبھی تیری گردن بھی میرے ہاتھ آئے گی۔ دیکھا جائے گا۔ آج تیرا دن ہے تو عیش کر۔ کل میرا دن آئے گا میں تجھے جنت سے نکالوں گا۔ یہ تو خیر چھٹی چر سی کھڑ کھڑ کرتی ہوئی گاڑی ہی ہے۔ سو روپلی تنخواہ کے ملتے ہیں اور یہ رعب دکھاتا ہے)۔ تو ایاز کو یہ معلوم ہے کتنی حقارت سے اس نے اس وقت کہا "ارے چھوڑو بھی۔ تمہاری زندگی میں ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا ہے۔"

لیکن ایاز تمہیں کیا معلوم کہ میری زندگی میں ایسا واقعہ کیوں نہیں ہوا ہے۔ تم بہت کچھ جانتے ہو میرے بارے میں۔ لیکن ایک بات نہیں جانتے کہ میں اس بے ننگ و نام آوارگی پر کیوں اتر آیا ہوں۔ اور نہ تمہیں یہ جاننے کی ضرورت ہے۔ تم ایک اچھے کاروباری ہو۔ تمہاری آغوش میں نیلوفر ہے۔ تمہارے پیٹ میں شراب ہے۔ شراب حرام کی ہو یا حلال کی' نشہ تو اتنا ہی کرتی ہے۔ اور میں اب تم سے یہ بات نہیں کہوں گا کہ لکھنؤ میں میرا بزنس ہے۔ اس لئے کہ تم جانتے ہو لکھنؤ میں میرا کوئی بزنس نہیں ہے۔ وہاں بھی میں ریلوے مسافر خانے ہی میں سوتا ہوں۔ میرا کوئی اپنا گھر نہیں ہے۔ میرا اپنا کوئی شہر نہیں ہے۔ میری اپنی کوئی زندگی نہیں ہے۔ میں ایک ڈھیلا ہوں۔ جس کا جی چاہتا ہے ایک جگہ سے اٹھا کر دوسری جگہ پھینک دیتا ہے۔ اچھی بات ہے' اچھی بات ہے۔ اب تم سے یہ سب نہیں کہوں گا۔ اور اس کا کیا فائدہ۔ کل تو پھر تمہارے گھر سے بھی چلے ہی جانا ہے۔

وہ اٹھا اور جب غسل خانے سے واپس آنے لگا تو اس کے کانوں میں نیلی روشنی میں لپٹی ہوئی نیلوفر کی آواز برف کی سیکڑوں سوئیوں کی طرح اتر گئی۔ "کس بانگڑو کو یہاں لے آئے ہو۔ بالکل جنگلی ہے۔ وحشی۔ بدتمیز۔۔۔۔" جیسے خواب میں بول رہی ہو اور اس کی آواز درمیان

سے منہ میں دب کر رہ گئی ہو۔ غالباً ایاز نے اپنا منہ اس کے منہ پر رکھ دیا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میری جان یہ نہ کہو۔ کاروبار میں ایسے آدمی کی تلاش تھی مجھے۔ قسمت سے مل گیا ہے۔ کام کا آدمی ہے۔ میری نیلو۔۔۔۔۔ میری نیلو۔۔۔۔ ہوں ہوں ہوں ہوں'' اس کی آواز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ اس کے منہ میں گوشت بھرا ہوا ہے جیسے بلی مرغی کو منہ میں دبا کر غرا رہی ہو۔

اس کے کان کھڑے ہو گئے اور ساتھ ہی وہ بھی وہیں دم سادھ کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن جب اس کے بعد کوئی آواز نہ آئی اور نیلی روشنی بھی اندھیرے میں کھو گئی' تو وہ دبے پاؤں اپنے بستر پر آیا اور لیٹ گیا۔ ٹائیگر اس کے تلوے کو چاٹ کر کسی اور طرف بھونکتا ہوا نکل گیا۔ درختوں میں ہوا خاموش ہو گئی تھی جیسے کوئی پرندہ ڈر کر اپنے پر سمیٹ لے اور پتوں میں چھپ جائے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ اس وقت طفیل جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا۔ رات صبح کی طرف دوڑ رہی تھی اور چاروں طرف اندھیرا اگبرا ہو گیا تھا۔ چاند زرد ہو گیا تھا اور دم توڑ رہا تھا۔۔۔۔ اس کا بے حس چہرہ اترتے ہوئے چاند کی طرف تھا۔ اس کی آنکھیں ضرور کھلی ہوئی تھیں اور رخسار آنسوؤں سے بھیگ رہے تھے۔

صبح کے وقت چائے کی میز پر پیالیاں کھنک رہی تھیں۔ اس وقت طفیل کے چہرے پر افسردگی کی زردی چھائی ہوئی تھی۔ پپوٹے بوجھل اور بھیگے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ وہ بار بار چائے کی پیالی میں زور زور سے چمچے کو چلا رہا تھا۔ ایک گھونٹ پیتا تھا اور پھر چمچے کو گھمانے لگتا تھا۔ اسے اس کا احساس ہی نہیں تھا کہ اس نے شکر پیالی میں ڈالی ہی نہیں ہے۔ ایاز صبح کا اخبار دیکھ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تھا۔ اس سے اگلا صفحہ تھا۔ وہ قرینے سے اپنی چائے کی چسکیاں بھر رہا تھا۔ اس وقت نیلو فر نہا کر آئی تھی۔ سفید ریشمی جمپر میں اس کا گورا بدن بہت ہی چکنا اور لپلپاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ جب دودھ دان یا کچھ اور اٹھانے کے لئے ہاتھ بڑھاتی اور میز پر جھکتی تو اس کے لبوں کے خم کے ساتھ اس کے پورے جسم میں کتنے ادھ کھلے زاویئے بنتے اور ٹوٹ جاتے۔ طفیل گوشت اور خون کی اس نرم اور شگفتہ قوس قزح سے بے خبر نہیں تھا جو ایک آن میں تھرکتی ہوئی ابھرتی تھی اور پھر دوسرے آن میں ٹوٹ جاتی تھی۔ وہ اپنی کنکھیوں

سے اس کے جسم کا سارا طلسم پی رہا تھا۔

"عورت۔۔۔۔اس میں کتنا جلوہ ہے۔اس میں کتنی پیاس ہے۔ کتنی سفاکی ہے۔۔۔۔اور میں کتنا بے بس ہوں۔ کتنا ذلیل ہوں۔۔۔۔"

ایاز نے اخبار کو دوسری طرف تہہ کرتے ہوئے کہا" بھئی طفیل میں تو آج ایک ہفتے کے لئے کلکتے جارہا ہوں۔ کوشش تو کروں گا کہ میں وقت پر آجاؤں۔ لیکن شاید نہ آسکوں۔۔۔۔ خیر تم یہاں رہو گے۔اپنا گھر ہے۔میں آجاؤں تو پھر تم چلے جانا۔ آں؟"

طفیل اب اپنی رات کی طرح بھاری آنکھوں کو اوپر اٹھا کر نیلو فر کو گھور رہا تھا اور وہ آہستہ آہستہ اپنی پیالی سے رنگے ہوئے لب کو سینک رہی تھی۔وہ خاموش رہا۔ صرف اس کے لب تڑپ رہے تھے اور اس کی انگلیوں میں تھرتھراتا ہوا چمچہ پھر ایک بار پیالی میں تیزی سے گھومنے لگا تھا۔

"ایک تکلیف دوں گا تمہیں۔ میرے کارخانے میں دوبے کام کی دیکھ بھال کرتا ہے۔میرے غائبانے میں ذرا اس کی مدد کر دینا۔۔۔۔ آں۔

وہ یہاں آکر تم سے خود مل لے گا۔۔۔۔"اس نے طفیل کے شانے پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔ وہ اس کے ہاتھ کے بوجھ سے دب گیا اور کیڑے کی طرح حقیر نظر آنے لگا۔" نیلو فر تو میں چلتا ہوں۔ ذرا میرے دوست کو سنبھالنا۔ تم دونوں بھئی اب بے تکلف ہو جاؤ۔ یہ مٹی کے مادھو والی بات مجھے پسند نہیں۔"

"ہلو مٹی کے مادھو۔۔۔۔"نیلو فر نے اپنا دپ دپ کرتا ہوا نازک سا ہاتھ میز کے اوپر بڑھا دیا جیسے تلوار تڑپ کر میان سے نکل گئی ہو۔ طفیل سہم گیا' لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کا ہاتھ نیلو فر کے ہاتھ میں تھا'نرم جیسے ریشم' ہلکا جیسے پھول' ٹھنڈا جیسے شبنم' متحرک جیسے ماں کے پیٹ میں انسان کا روپ دھارن کرتا ہوا زندہ گرم اور معصوم خون۔

دونوں ہنس رہے تھے۔ طفیل کی آنکھوں کی رات دن کی چاندنی میں ڈھل گئی تھی اور دھوپ کی طرح جگمگا رہی تھی۔ نیلو فر کی آنکھیں غمگین تھیں اور لب وا تھے۔

ایاز دونوں کو اسی طرح چھوڑ کر ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ سگریٹ کی راکھ جھاڑتا ہوا اپنے

بھاری بھرکم جسم کے ساتھ باہر چلا گیا۔

"چیریو۔۔۔۔"

"چیریو۔۔۔۔"

"بائی بائی۔۔۔۔"

"سی یو سون۔۔۔۔"

اسی دن شام کے وقت دوبے وہاں پہنچ گیا۔ نیلوفر نے طفیل کو اس سے ملایا۔ دوبے نے اپنی بھینگی آنکھ کی ساری نحوستیں اس پر برساتے ہوئے اس سے ہاتھ ملایا اور اپنی بلغمی آواز میں بولا "طفیل صاحب! مجھے آپ کے بارے میں ایاز صاحب بتا گئے ہیں۔ کل میں آپ کو کارخانے لے چلوں گا۔ آپ کے بزنس کے تجربوں سے ہمیں بڑی مدد ملے گی۔

"لیکن میں زیادہ دن تو یہاں رک نہیں سکتا۔ آپ شاید نہیں جانتے۔ میرا اپنا بزنس لکھنؤ میں۔۔۔۔"

"ارے صاحب آپ کے بزنس کو کون مارے جائے گا۔ اس کا کیا بگڑ جائے گا۔ آخر آپ کے دوست کا بھی تو کچھ حق ہے آپ پر۔ ایں؟ مجھے سب کچھ بتا دیا ہے ایاز صاحب نے آپ کے بزنس کے بارے میں۔۔۔۔" اس نے اپنی پوری خباثت کے ساتھ نیلوفر کی طرف دیکھا۔ وہ جب نیلوفر کی طرف دیکھتا تو معلوم ہوتا طفیل کو دیکھ رہا ہے اور جب طفیل کو دیکھتا تو معلوم ہوتا کہ نیلوفر کو دیکھ رہا ہے۔ یعنی اس کی آنکھوں کے اشارے سے پورب پچھم کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔

ایاز نے بزنس کے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا' اس خیال سے ہی طفیل کے حلق میں کانٹے چبھنے لگے۔

دوبے اس کی آنکھوں میں بہت ہی حقیر اور ذلیل نظر آنے لگا۔ اس نے نیم کی طرح تلخ تھوک گھونٹتے ہوئے اور اپنی ایک آنکھ میچتے ہوئے اس کی طرف دیکھا اور نیلوفر کی طرف منہ

پھیر لیا۔ جس کے چہرے کی سرخی زردی میں بدل رہی تھی اور شام کی اداسی اس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔

"ہاں دوبے انہیں کل کارخانے ضرور لے جانا۔ یہ کام کے آدمی ہیں۔۔۔۔" نیلوفر نے خلش سے بھری ہوئی نظروں کے ساتھ طفیل کی طرف دیکھا اور اپنی سرخ پالش زدہ انگلیوں کو میز پر بجانے لگی جو ننھے ننھے سلگتے ہوئے ستاروں کی طرح اچھلتی ہوئی معلوم ہو رہی تھیں۔

دوبے کا چہرہ خشک تھا۔ ایک آنکھ تو بھینگی تھی اور دوسری میں دھول اڑ رہی تھی۔ انگلیوں سے لے کر کہنیوں تک ہاتھ کی رگیں ابھرتی چلی گئی تھیں۔ اس کی عمر تیس اور چالیس کے درمیان ہو گی۔ لیکن اس کے چہرے پر ایک بیمار ساڈراؤنا کھردراپن کھدا ہوا تھا۔ اس کی ہاف قمیض کے کالر ادھڑے ادھڑے سے تھے لیکن ایک کالی سی ٹائی بندھی ہوئی تھی جس کی چھوٹی سی گرہ ازاربند کی گرہ سے ملتی جلتی تھی۔

اس نے دانت نکال کر موسم کے بارے میں ایک دو باتیں کہیں اور پھر یہ کہہ کر چلا گیا کہ کل صبح وہ آکر خود طفیل کو کارخانے لے جائے گا۔ ابھی تو وہ کاروبار کے کام سے کسی وزیر کے ہیڈ کلرک سے ملنے جا رہا ہے۔

اس کے جانے کے بعد پانچ منٹ تک بلکہ شاید کچھ زیادہ ہی دیر تک طفیل اور نیلوفر خاموشی سے ایک دوسرے کو تکتے رہے۔ اس وقت اس کے چہرے پر ایک مسکین سی سنجیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے ہونٹ مسکرا رہے تھے اور آنکھیں نفرت' حقارت اور خشونت کی آگ میں جل رہی تھیں۔

"یہ عورت بھی غضب کی عورت ہے۔ آنکھیں ہنستی ہیں تو لب ان کی تردید کرتے ہیں اور جب لب پھول بنتے ہیں تو آنکھوں میں جہنم دہک اٹھتا ہے۔۔۔۔ کبھی خاموش بیٹھتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے جسم کا ایک ایک زاویہ پکار رہا ہے۔ ناچ رہا ہے۔ اور کبھی اس کا جسم تھرک اٹھتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ برف کے تودے کی طرح جمتی چلی جا رہی ہے۔۔۔۔ یہ کیسی عورت ہے۔ بال میموں کی طرح ترشوا رکھے ہیں اور آنکھوں میں ہندوستان بھر کی عورتوں کی شرم بھر رکھی ہے۔۔۔۔ اور اس کا شوہر اس سے محبت نہیں کرتا بلکہ شاید نفرت

کرتا ہے کیوں؟ اس لئے کہ یہ ایک مجوب عورت ہے۔ اس لئے کہ یہ اپنے باپ کی لوٹ کے حصے سے محروم ہے۔۔۔۔ لیکن اس عورت میں بڑا جلوہ ہے۔۔۔۔ ایاز خان میرا امتحان لے رہا ہے۔۔۔۔ لیکن میں ایک شریف آدمی۔۔۔۔"

"بھئی طفیل آج طبیعت بہت گھبرا رہی ہے۔ کیوں نہ پکچر چلیں۔۔۔۔؟"

رات کو دس بجے جب دونوں پکچر دیکھ کر واپس ہوئے تو طفیل کی آنکھوں میں نیند بھر رہی تھی لیکن نیلوفر کھانے کے بعد اسے اپنے کمرے میں لے گئی۔ خود تو اپنے سائن کے گدے میں بستر پر دھنس گئی اور وہ آرام کرسی میں دفن ہو گیا۔ بٹن دبا کر زرد چمکتی ہوئی روشنی کو اس نے نیلی روشنی میں بدل دیا۔ روشنی بھی انسان کے جذبات کا رخ اسی طرح موڑتی ہے جس طرح ہوا کے دباؤ سے کشتی کے بادبان کشتی کا رخ بدل دیتے ہیں۔ طفیل کے جسم میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ گذشتہ رات ہی وہ اس کمرے کے بارے میں عجیب عجیب باتیں سوچ رہا تھا۔ کل رات یہ کمرہ' اس کی نیلی روشنی' نیلوفر کا قہقہہ۔۔۔۔ یہ سب پر اسرار معلوم ہوئے تھے۔ آج یہ سب کل سے زیادہ پر اسرار ہو گئے تھے' لیکن ساتھ ہی خطرناک بھی۔ اور اسے لگا یہ اسرار صرف اس کی جرات' اس کی رندی' اس کی وحشت کا انتظار کر رہا ہے۔ نیلوفر نے ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا۔ اس میں سے بہت ہی دھیمی آواز میں سارنگی پر بسنت کی دھن پھوٹ رہی تھی۔

"طفیل تم بہت خاموش رہتے ہو۔ تم کچھ سوچتے رہتے ہو۔ کیا تمہیں میرا گھر پسند نہیں؟"

"ہاں۔۔۔۔ نہیں۔۔۔۔ ہاں۔۔۔۔ بہت پسند ہے۔ نہیں میں خاموش تو نہیں رہتا" وہ اور تیزی سے سگریٹ کے کش لگانے لگا۔ نیلی روشنی میں دھوئیں کے محل کمرے میں اڑتے بکھرتے رہے۔

"تم لکھنؤ میں کس چیز کا بزنس کرتے ہو؟"

وہ جانتا تھا کہ ایاز نے اسے سب کچھ بتا دیا ہے۔ لیکن اس نے جھوٹ پر چاندی کا ایک اور طبق لپیٹ دیا۔ "سائیکل اور کوئلے کا بزنس خاص بزنس ہے۔ ویسے اور بھی کئی چیزیں ہیں۔" وہ خود ہی اپنی ذہانت پر مسکرایا اور اپنی ختم ہوتی ہوئی سگریٹ سے اس نے دوسری سگریٹ سلگائی۔

"اچھا" نیلوفر نے کچھ اس انداز میں لیٹے لیٹے سنجیدگی سے سر ہلا کر کہا کہ طفیل چکرا گیا۔ اسے

پھر ایک بار یہ شبہ پیدا ہو گیا کہ معلوم ہوتا ہے رات اس نے محض یونہی اپنی طرف سے باتیں گڑھ لی تھیں۔ ایاز نے کچھ کہا نہیں تھا۔ گنہ گار کا دل بڑا شکی ہو جاتا ہے۔۔۔۔ وہ پتوں کی کھڑکھڑاہٹ پر بھی چونک اٹھتا ہے۔ وہ اپنی کرسی میں تازہ دم ہو کر آگے کو جھک گیا۔

"ایاز کا بزنس کس قسم کا ہے۔۔۔۔؟"

"ایاز کا بزنس؟ اس نے تمہیں سب بتا دیا ہوگا۔ اچھا بزنس ہے۔ وہ بہت مصروف رہتا ہے۔ آج یہاں کل وہاں۔ یہاں بھی رہتا ہے تو مصروف رہتا ہے۔ اتنا مصروف کہ وہ مشکل سے بات چیت کر پاتا ہے۔ بزنس بھئی بزنس ہے۔ رات کو البتہ تھوڑی دیر کے لئے کلب چلا جاتا ہے۔ پینے پلانے سے بزنس کا بوجھ کچھ کم ہو جاتا ہے۔ تم تو خود ایک بزنس مین ہو۔ تمہیں تو اس کا گر معلوم ہی ہو گا۔۔۔۔ کافی پیو گے؟"

"نہیں۔ میں صرف جاڑے میں کافی پیتا ہوں۔" دیوار پر ٹنگی ہوئی فریم میں ایک تصویر پر اس کی نظریں جم کر رہ گئیں۔ دو چار دن کے بچے کی تصویر تھی۔ "یہ کس کی تصویر ہے؟"

"یہ لیاز کے بچے کی تصویر ہے۔ ماں جنم دیتے ہی مر گئی۔ بچہ ایک ہفتے کے بعد مر گیا۔۔۔۔"

"ماں ایک ہفتے کے بعد مر گئی۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔ کیا۔۔۔۔؟" وہ اور جھک گیا۔

"اچھی تھی بے چاری۔۔۔۔ خوبصورت تھی، معصوم تھی، شریف تھی۔۔۔۔ ہم اسے صرف بیس روپے ماہانہ دیتے تھے۔ اس کا ایک اندھا باپ تھا۔ اب وہ صاحب مارکٹ کے سامنے بھیک مانگتا ہے۔۔۔۔ وہ اس بچے کا نانا ہے۔۔۔۔" ابھی آدھی سگریٹ جلی تھی، لیکن طفیل نے ایک اور سگریٹ جلا لی۔

نیلوفر نے یہ سب کچھ بڑے اطمینان، نرمی اور بے پناہ سنجیدگی کے ساتھ کہا تھا۔ اس کے لب سخت اور افسردہ ہو گئے تھے۔ آنکھوں میں چراغ جل اٹھے تھے۔

"اب مجھے نیند آ رہی ہے۔ میں جا کر سو جاؤں گا۔۔۔۔ اب پھر صبح۔۔۔۔" طفیل نے اپنا جملہ بھی پورا نہیں کیا اور باہر نکل گیا۔

"بھئی بچہ تمہیں پسند آیا۔ تمہارے لیاز کا بچہ ہے۔ تم تو اس کے چچا ہو نا؟" نیلوفر کا یہ جملہ باہر تک اس پر جھپٹتا رہا۔ وہ لیٹ گیا۔ اٹھ بیٹھا۔ لان میں ٹہلنے لگا۔ چاندنی پھٹ پڑی تھی۔ اس کا

دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ ریڈیو سے اب گانے کی نرم آواز پھوٹ رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ ٹائیگر بڑی مستعدی سے ٹہل رہا تھا۔ طفیل نے اس کے سر کو جھک کر تھپ تھپایا۔ کمرے کی نیلی روشنی بجھ گئی اور ایک گہرا سناٹا چھا گیا۔ صرف اس کے دل کی دھڑکن اس میں سراسیمگی اور جھنجھلاہٹ پیدا کرتی رہی اسے چونکاتی رہی۔

صبح کے وقت گرمی بہت تھی۔ امس بڑھ گئی تھی۔ پسینے سے کپڑے جسم پر چپک رہے تھے۔ دوبے کے ساتھ طفیل کارخانے میں چکر لگا رہا تھا۔ یہ ایک دو منزلہ مکان تھا۔ اس میں کاریگر ننگے بدن صرف لنگی اور دھوتی باندھے ہوئے بکس بنانے کے مختلف کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ کہیں پر رنگائی ہو رہی تھی۔ کہیں پر پتریاں پیٹ کر برابر کی جارہی تھیں۔ کہیں بکس میں تالے لگائے جارہے تھے۔ کہیں لوہے کے بڑے بڑے چادرے کاٹے جارہے تھے۔ ایک اور طرف ایک بڑا سا گودام تھا جہاں سیمنٹ کے بوروں کا انبار لگا ہوا تھا۔ باہر تالاب کے پاس درختوں کے سائے میں تین چار ٹرک کھڑے تھے۔ ان کے ڈرائیور آدیباسی عورتوں کو چھیڑ رہے تھے۔ وہ سڑک کے کنارے سے تالاب کی مٹی کاٹ رہی تھیں اور سڑک کے دو طرفہ کناروں پر پھیلا رہی تھیں۔ ان سب کے جسم جامن کی طرح سیاہ تھے۔ ان کے جسم کمرے اوپر ننگے تھے۔ لیکن وہ اس طرح اپنے کام میں کھوئی ہوئی تھیں جیسے وہ یہ جانتی ہی نہ ہوں کہ وہ ننگی ہیں۔ ان کی شرم کپڑوں میں لپٹی ہوئی کمر تک پہنچ کر ختم ہو جاتی تھی۔ اس سے اوپر نکتہ دانوں کے لئے نیلوفروں اور ایازوں کے لئے کوئی بات ہو تو ہو ان کے لئے کوئی بات نہ تھی۔ میلا پسینہ ان کی پشت اور گردن سے لے کر سخت سینوں پر بھی چمک رہا تھا۔ ان کے چٹان سے ترشے ہوئے جسم خموش کام کرنا جانتے تھے۔ ان چلتی پھرتی چٹانوں کو طفیل دوسری منزل کے دفتر والے کمرے سے دیکھتا۔ "یہ عورتیں بالکل پتھر کی معلوم ہوتی ہیں۔ ان کے اندر نہ جانے کتنی آگ ہے۔ پتھر جب پتھر سے ٹکراتا ہے۔۔۔۔"

"دیکھئے طفیل صاحب آپ اس درخواست پر دستخط کردیجئے۔" دوبے نے کہا۔

"کیسی درخواست۔۔۔۔؟"

"یہ درخواست جیپلا سیمنٹ ورکس کو جارہی ہے۔۔۔۔ ہاں سیمنٹ کے لئے۔۔۔۔ ایاز صاحب

نے کہا تھا۔۔۔۔"

طفیل نے بغیر کسی حجت کے اور درخواست پڑھے بغیر اس پر دستخط کر دیئے۔ "میں کہاں سے منیجر بن گیا اس کارخانے کا۔ ہوں۔ عجیب بات ہے؟" اس نے یہ سوچتے ہوئے خود کو کرسی میں گرا دیا۔ پنکھے کی ہوا اسے ناگوار معلوم ہوئی۔ اس نے سگریٹ بھی پھینک دی۔ کھڑکی سے اب تک ٹرک کے پاس چند ڈرائیور آپس میں گپ کرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔ دو تین آدیباسی چھوکریاں اپنے نوکروں کے ساتھ ان کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی تھیں اور وہ انہیں اپنی جوٹھی بیڑی پلا رہے تھے۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس کے کان میں کارخانے کے نچلے حصے سے لوہے کے ٹکرانے، پٹنے اور زنجیروں کے جھنکنے کی آوازیں آتی رہیں۔ اس کے پاس ہی میز پر دوبے کے ہاتھوں کے نیچے کاغذات کے پلندے احتجاج کر رہے تھے۔

شام تک دوبے طفیل کو ایک کاغذ کے بعد دوسرا کاغذ، ایک رجسٹر کے بعد دوسرا رجسٹر، ایک اکاؤنٹ کے بعد دوسرا اکاؤنٹ دکھاتا رہا۔ اس کی بھینگی آنکھوں میں جیسے دو مسکراتے ہوئے لب چپک گئے تھے۔ وہ مسکرا رہی تھیں اور اسے غصہ آ رہا تھا۔ اس نے غصے اور اکساہٹ میں دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔

جب شام کے جھٹپٹے میں ہر طرف ایک تھکن سی پھیل گئی تو دوبے نے کہا۔ "آپ کے ہاتھوں کاروبار چمک اٹھے گا۔ آپ تو واقعی بزنس جانتے ہیں۔"

چلتے وقت اس نے موٹر سائیکل کارخانے سے نکلوا کر اس کے حوالے کی اور بولا "کل صبح تو وقت پر آ جائیے گا نا۔ یہاں بہت کام پڑا ہے۔"

اور جب موٹر سائیکل کی مشین سانس بھر کر پھڑ پھڑانے لگی تو وہ لپکا ہوا اس کے پاس آیا اور اپنی گردن سے میل چھڑاتے ہوئے بولا۔ "طفیل صاحب اگر ایک سگریٹ ہو تو دے دیجئے۔"

طفیل نے ایک سگریٹ اس کے ہاتھ میں پھینکی اور اس کی موٹر سائیکل منڈلاتی ہوئی تالاب کے کنارے سڑک پر دوڑنے لگی۔ چیختی ہوئی ہوا کے دباؤ سے بچنے کے لئے اس نے اپنا منہ

تالاب کی طرف پھیر لیا جس میں ننگ دھڑنگ آدیباسی عورتیں نہا رہی تھیں اور جلدی جلدی دن بھر کی محنت کی تھکن اور مٹی دھو رہی تھیں۔

ایک ہفتہ گزر گیا۔ لیکن ایاز نہیں آیا۔ طفیل کی طبیعت کچھ اکتانے لگتی تھی اور کبھی اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ نئے حالات میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو کر رہ جائے۔ خزاں رسیدہ درخت میں اچانک پھل پھول آنے لگیں تو ایسے میں اس کے سائے سے نکل بھاگنا کہاں کی حماقت ہے۔ اس نے یہ حماقت نہیں کی۔ وہ تو اس درخت سے لپٹ کر سو جانا چاہتا تھا۔

ایک ہفتے میں اسے ایاز کے کاروبار کا سارا گر معلوم ہو گیا تھا۔ دوبے نے آہستہ آہستہ اسے بھی کاروبار کی آئینی زنجیروں میں باندھ لیا تھا۔ وہ سمجھ رہا تھا لیکن مسحور انسان کی طرح سب کچھ کئے جا رہا تھا۔ بلیک مارکٹ میں زیادہ سے زیادہ مال کی کھپت ہوتی تھی۔ ایاز نے دوبے کی مدد سے خاصا جال پھیلا رکھا تھا۔ رات کے وقت دس بجے کے بعد ان ٹرکوں میں زندگی پیدا ہو جاتی ہے جو دن بھر درختوں کے سائے میں پڑے رہتے تھے اور جن کے ڈرائیور آدیباسی عورتوں کے ننگے اور سیاہ کڑیل جسموں سے لطف اٹھاتے رہتے تھے۔ یہ ٹرک نیچے لوہے کے چادرے اور سیمنٹ کی بوریاں رکھ لیتے تھے اور ان کے اوپر جنگل کی لکڑیاں اور بکس کی دو منزلہ اور سہ منزلہ عمارتیں کھڑی کر لیتے تھے۔ اور مختلف سنسان اور بے جان سڑکوں کے چکر لگا کر وہ جنگل کی طرف سڑکوں پر نکل جاتے تھے۔ ہر رات کچھ ٹرک غلوں سے لد کر واپس آتے تھے۔ معلوم تھا کہ شہر سے چار چار پانچ پانچ میل کے فاصلے پر غلے کی آمد و رفت کی روک تھام کے لئے چوکیاں تھیں، لیکن یہ ٹرک روزانہ خیریت سے نکل جاتے تھے اور اطمینان سے شہر میں داخل ہو جاتے تھے۔ ایاز نے سرکاری حلقوں میں خاصا رسوخ پیدا کر لیا تھا۔ وہ اپنا کام نکالنے کے لئے بہت سے حربے ایجاد کر چکا تھا۔ اس کا آرٹ روز بروز ترقی کرتا ہوا آرٹ تھا۔

"ایاز خان بزنس میں بالکل مروت نہیں کرتے۔ وہ تو اٹھتے ہوئے کاروباری ہیں۔ اسی لئے انہوں نے اس کو لکھنؤ سے بلایا ہے؟"

"مجھے بلایا ہے؟" اس نے قہر بھری نظروں سے دوبے کو دیکھا۔

دوبے نے اپنے سڑے ہوئے دانت نکال دیئے اور اس کی بھینگی آنکھ مسکراتی رہی۔ طفیل نے کہا۔ "میں اب واپس جا کر اپنا کاروبار......"

دوبے نے بات کاٹ کر کہا "اجی جناب کہاں کا کاروبار اور کہاں کا لکھنؤ۔۔۔۔ چھوڑیئے بھی ۔۔۔۔ مجھے ایاز سب بتا چکے ہیں۔۔۔۔"

طفیل بھناتا ہوا اٹھا اور تیز تیز قدموں سے نیچے اتر گیا اور موٹر سائیکل پر بیٹھ کر وہاں سے نکل گیا۔ وہ بے ارادہ شہر بھر کے چکر لگاتا رہا۔ اپنی وحشت اور ہیجان میں اس نے ایک رکشا والے کو ہلکا سا جھٹکا بھی لگا دیا۔ وہ اپنی زبان میں دیر تک اسے گالی دیتا رہا۔ اس وقت اس کے کان کے سیاہ بالے زور زور سے ہل رہے تھے۔

لیکن وہ اپنی دھن میں اڑا چلا جا رہا تھا..........

اس کے دماغ میں دوبے کی بات گونج رہی تھی۔ پچھلے دن جب کارخانے کے کاریگروں نے ایک ساتھ آ کر مزدوری بڑھانے کا مطالبہ کیا تھا تو طفیل اپنی ڈھل مل یقینی کے ساتھ ادھر ادھر ٹہلنے لگا تھا۔ لیکن دوبے نے سمجھا بجھا کر انہیں ٹال دیا۔

"کیوں دوبے یہاں صرف مسلمان کاریگر کیوں ہیں؟"

"یہاں ایک اور لوہے کا کاروباری ہے 'ناگر مل۔ وہ صرف ہندو کاریگروں کو اپنے یہاں رکھتا ہے۔۔۔۔ لیکن کوئی بات نہیں ناگر مل اور ایاز خان میں یہ طے ہو گیا ہے۔ اس طرح نیچے بھاؤ پر مزدور مل جاتے ہیں۔۔۔۔" اس نے پھر اپنے میلے دانتوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا تھا۔

اس وقت طفیل کی آنکھوں میں اس مزدور کا چہرا ابھر آیا تھا جو سب سے آخر میں کمرے سے باہر نکلا تھا۔ اس نے اپنی لنگی دہرا کر کمر میں کستے ہوئے کہا تھا "تم ہمیشہ ہم لوگوں کو بے وقوف بناتے ہو۔ لیکن یہ کارخانہ ہمارے بل بوتے پر چل رہا ہے۔ ناگر مل لے گا نہیں۔۔۔۔ ورنہ ۔۔۔۔ یہ کارخانہ۔۔۔۔ یہ۔۔۔۔" وہ اپنا غصہ اپنے سینے میں دبا کر باہر نکل گیا تھا۔

دوبے نے طفیل کی طرف اپنا منہ بگاڑتے ہوئے دیکھا اور اپنی گردن سے میل چھڑاتے ہوئے بولا۔۔۔۔ "اس پر بھوت سوار ہو گیا ہے۔ روز سب کو بہکاتا رہتا ہے۔ اسے ٹھیک کرنا ہوگا۔ افسوس ہے سب سے تیز اور محنتی۔۔۔۔ لیکن۔۔۔۔ خیر۔۔۔۔"

طفیل پورے شہر کا چکر لگا کر جب گھر پہنچا تو اس وقت ہلکی بوندا باندی کے بعد بادل پھٹ گئے تھے اور سورج ترچھا ہو کر آم کے درختوں سے جھانک رہا تھا۔ نیلو فر بنگلے سے باہر پھولوں کی کیاریوں کے پاس ننگے پاؤں بھیگی ہوئی گھاس پر آہستہ آہستہ ٹہل رہی تھی۔ اس وقت طفیل کو پہلی بار اس کے ہونٹ بے رنگ اور پھیکے سے نظر آئے۔ اسے ایسا معلوم ہوا کہ اس کے لبوں پر ایک غیر فطری کافوری سپیدی سو رہی ہے۔ اس کی ساڑی سفید تھی اور بلاؤز ہلکا فالسی۔

وہ کھڑی ہو گئی اور طفیل کا انتظار کرنے لگی۔

"کیوں آج بہت سویرے بھاگ آئے۔" نیلو فر نے ایک پھول سے پانی کی بوندوں کو اڑاتے ہوئے کہا۔

"ہاں" وہ اس کے قریب آ گیا اور اس کے سفید پیروں کی چاندنی کو سبز بھیگی ہوئی گھاس میں چمکتے ہوئے دیکھ کر بولا "تم آج ننگے پاؤں کیوں ہو؟"

"ٹھنڈا ٹھنڈا اچھا لگتا ہے" بے وجہ ضرورت سے زیادہ زور سے ہنس پڑی۔

"بھئی ایاز خان کا کوئی خط آیا۔۔۔۔؟ اب میں واپس جانا چاہتا ہوں۔" طفیل نے بے پروائی اور ایک حد تک گھبراہٹ کے ساتھ کہا۔

"تم واپس جانا چاہتے ہو۔ میں تو سمجھ رہی تھی اب تم کبھی واپس نہیں جاؤ گے۔" اس وقت وہ نیا سوٹ اسے جکڑتا ہوا محسوس ہوا جو نیلو فر نے اپنی طرف سے بنوا کر اس کو بطور تحفہ پیش کیا تھا۔

"کیوں تم ایسا کیوں سمجھ رہی تھیں؟"

"یونہی۔۔۔۔ میرا مطلب ہے میں اب بھی سمجھتی ہوں تم کبھی واپس نہیں جاؤ گے" دونوں باتیں کرتے ہوئے برآمدے میں آ گئے۔ شام کے جھٹپٹے میں طفیل اس کی آنکھوں کی مچھلیوں کو دیکھنے کی بیکار کوشش کر رہا تھا۔

"کل میری سالگرہ ہے۔ تم جلدی آ جاؤ گے۔"

دوسرے دن بارہ بجے دن تک وہ اپنے بستر سے اٹھا ہی نہیں۔ گھر میں ایک چہل پہل پھیلی ہوئی تھی۔ سالگرہ کی تیاری ہو رہی تھی۔ دوبے کا فون بھی آیا' لیکن اس نے کہہ دیا اس کی طبیعت بہت خراب ہے اور وہ بالکل باہر نکل نہیں سکتا۔ جب دوبے نے اصرار کیا تو اس نے چیخ کر کہا "شٹ اپ" اور ریسیور رکھ دیا۔ صبح کی چائے نہیں پی' دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تین بجے سہ پہر نیلوفر نے آکر اسے خود اٹھایا۔ "کیوں تمہیں سالگرہ کی خوشی نہیں؟"

"تمہاری سالگرہ ہے آج۔۔۔۔ اسی لئے اتنا لپ اسٹک لپیٹ لیا ہے؟"

"لپ اسٹک اپنے لبوں پر لگائی ہے' تمہیں کیوں تکلیف ہو رہی ہے۔"

"نہیں تکلیف نہیں۔۔۔۔ میں ایاز کے بارے میں سوچ رہا ہوں۔ میں نے آج تک کسی ایسے آدمی کے بارے میں نہیں سنا جو سنگترے کی پھانکوں کو کبوتر کے لہو میں بھگو کر چوستا ہو۔"

وہ فوراً مڑی اور وہاں سے چلی گئی۔ ایک ہوا کا جھونکا تھا جو دروازہ چیر کر نکل گیا۔

اس وقت طفیل کو بہت مزہ آیا۔ تکلیف پہنچانے میں اسے خاص لطف آتا تھا۔ نیلوفر کو جلانے میں یہ لطف دوگنا ہو جاتا تھا۔ لیکن دوسرے ہی لمحہ اس کے دل میں نیلوفر کے لئے رحم کا طوفان سا اٹھنے لگتا تھا۔ اس نے تین چار منٹ کے بعد آپ ہی اپنی ہتھیلیوں کو پیٹ کر زور سے قہقہہ لگایا۔ اس کے ساتھ ہی اندر والے کمرے سے کسی چیز کے جھناکے سے گرنے اور ٹوٹنے کی آواز آئی۔

"چلو ایک گلدستہ شہید ہوا۔ آئی بلا ٹلی۔۔۔۔"

غسل خانے میں بھی نہانے کے دوران میں کئی بار وہ ہنسا اور پانی کی لہریں اس کے جسم میں گدگدی کرتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ نہانے کے بعد کپڑے بدل کر بغیر چائے پیئے ہوئے بنگلے سے نکل گیا جہاں میزیں قرینے سے لگی ہوئی تھیں اور رنگ برنگ کے قمقمے آہستہ آہستہ ڈوروں میں لٹکے ہوئے جھول رہے تھے۔ ملازموں نے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے۔ اور پچھواڑے میں رہنے والے مالی اور دھوبی کے بچے دور ہی سے کھڑے محفل کی رنگت دیکھ رہے تھے جسے مہمانوں کا انتظار تھا۔

رات کو دس بجے کے بعد وہ شراب کے نشے میں دھت واپس بنگلے پر پہنچا تو کوٹھی سے مہمان جا

چکے تھے۔ صرف ایک بنگالی جوڑا الوداعی سلام کہہ رہا تھا۔ یہ تھا مکرجی بائیو کیمسٹ اور اس کی بیوی کا جوڑا۔ اس کے ذریعہ ایاز سرکاری لوگوں کے یہاں کھاد سپلائی کر کے ان کی خوشنودی حاصل کرتا تھا۔ جب وہ بھی چلے گئے تو نیلوفر اس کی طرف بغیر دیکھے ہوئے اندر چلی گئی۔ اس وقت فضا میں ایک شکست اور دلگیری سی پیدا ہو گئی تھی۔ ملازم جلدی جلدی چیزیں سمیٹ رہے تھے۔ وہ تھوڑی دیر اپنے کمرے میں ٹہلتا رہا اور ایک سگریٹ کے بعد دوسری سگریٹ پیتا رہا۔ وہ اتنی تیزی سے سگریٹ پی رہا تھا کہ آدھی سگریٹ پوری طرح تمباکو جلائے بغیر انگارے کی طرح سلگ اٹھتی تھی۔

رات بھاری ہو گئی۔ ہوا چوروں کی طرح کانا پھوسی کرتی رہی۔ خاموشی اس کی روح پر مسلط ہونے لگی۔ وہ اٹھا اور آہستہ سے اپنے کمرے سے نکلا۔ آہستہ آہستہ پچھواڑے کی طرف گیا۔ جہاں ملازمین' دھوبی اور مالی کے ساتھ بیٹھے چلم پی رہے تھے اور مہمانوں کے لطیفے سنا رہے تھے اور گالیاں بک بک کر ہنس رہے تھے۔ وہ واپس آیا اور سیدھا سنسناتا ہوا نیلوفر کے کمرے میں گھس گیا۔ اس وقت وہ ایک بہت مہین سا زرد کرتہ اور ریشمیں پاجامہ پہنے آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کو دیکھتے ہی اس نے چمکتے ہوئے بلب کو گل کر دیا اور نیلی روشنی پر اسرار سرگوشی کے ساتھ کمرے میں پھیل گئی۔ وہ اپنے گدیلے بستر پر لیٹ گئی۔ طفیل اپنی پتلون کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے اسے گھور رہا تھا۔ اس کے بال آگے کو جھک آئے تھے اور اس کے کھلے ہوئے گریبان سے اس کا دھنسا ہوا سینہ متلاطم نظر آ رہا تھا۔ نیلوفر بالکل بے حس اسی طرح لیٹی رہی۔ اس کا ایک ہاتھ اس کی پیشانی پر تھا' دوسرا زلفوں میں کھویا ہوا۔ اس کی آنکھیں کبھی بچے کی تصویر کا طواف کرتی تھیں اور کبھی طفیل کے وحشی برہم اور جذباتی چہرے کا۔

"تم اس کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ تم بہت تھکے ہوئے معلوم ہوتے ہو۔"

"نہیں میں تھکا ہوا نہیں ہوں۔ میں نے کافی پی رکھی ہے" اس نے جھنجھلا کر اسی طرح اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"پھر؟" اس نے ڈوبتی ہوئی سانس کے ساتھ پوچھا۔ لہجے میں بڑی حیرانی اور سراسیمگی تھی۔

وہ چیل کی طرح جھپٹا اور اس پر چھا گیا۔ اس کے بال نوچ لئے اور اس کے ہونٹ اتنے زور سے چوم لئے کہ آواز سناٹے میں تالی کی طرح گونج گئی۔

"تم بہت بے ہودہ آدمی ہو۔ میں کوئی بازاری عورت نہیں ہوں۔ میں تمہارے دوست کی بیوی ہوں۔۔۔۔"

وہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے رحم بھری نظروں سے نیلوفر کو دیکھا۔ اس کی نظریں بچے کی تصویر پر سے ہوتی ہوئی آئینے پر جم گئیں۔ اس نے اپنے ہونٹ کو آستین سے رگڑنا شروع کر دیا۔ وہ پھر جھکا اور اس نے اپنی آستین سے اس کے ہونٹ بھی رگڑ ڈالے۔ وہ تڑپتی رہی' لیکن اس کی گرفت سے نکل نہ سکی۔ وہ پھر اس کے لب چومنے کے لئے جھکا۔ لیکن قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ یکایک اٹھا اور اپنے کمرے میں آکر بستر پر اوندھے منہ گر گیا اور زور زور سے سسکیاں بھر کر رونے لگا۔

باہر ہوا ابھی سسکیاں بھر رہی تھی اور کتا بھونک رہا تھا اور پچھواڑے سے ملازمین کے قہقہوں کی آواز آ رہی تھی۔

تین ساڑھے تین مہینے گزر چکے تھے۔ نومبر کے مہینے میں ہی وہاں سردی سانسوں میں برف کے بلیڈوں کی طرح دوڑنے لگی تھی۔ طفیل مزے میں تھا۔ وہ اب لکھنؤ کے بزنس کی باتیں کرنا بھی چھوڑ چکا تھا۔ سگریٹ پینے میں اس نے اتنی شدت اختیار کر لی تھی کہ اس کی انگلیاں کتھئی ہو گئی تھیں اور دو انگلیوں کے ناخن تو بالکل حنائی سے نظر آتے تھے۔ اس بیچ میں کئی بار ایاز کارخانے کا پورا بوجھ اس پر چھوڑ کر کلکتے' بمبئی اور دہلی کے چکر لگانے کے لئے چلا گیا۔ ہر بار وہ یہی کہہ کر جاتا تھا کہ وہ بزنس کے کام پر جا رہا ہے۔ لیکن طفیل کی آنکھیں اب ایاز کی زندگی کی گہرائیوں تک رسائی حاصل کر چکی تھیں۔ وہ جانتا تھا کہ وہ کلب میں محض تاش اور بلیرڈ کھیلنے نہیں جاتا۔ وہ وہاں اینگلو انڈین لڑکیوں اور سرکاری افسروں کی بیویوں سے فلرٹ کرنے جاتا ہے۔ وہ بلیک مارکیٹ سے حاصل کئے ہوئے روپے پانی کی طرح نت نئی عورتوں پر بہاتا ہے۔ وہ خطرات مول لے کر رات کے وقت ٹرکوں پر چیزوں کو ناجائز طریقے پر ایک جگہ سے دوسری جگہ بھجواتا ہے۔ اس نے اپنے بزنس کو کافی ٹھوس بنا لیا تھا۔ اس کا دردِ سر بس ناگر مل تھا جو اسی قسم کے بزنس میں ڈٹ کر اس کا مقابلہ کر رہا تھا اور اپنی چار سو بیسی سے اسے کبھی کبھی

زور دار دھکا لگا دیتا تھا۔ لیکن یہ پٹھا بھی میدان میں ڈٹا ہوا تھا۔ اب اسے طفیل کی وجہ سے ذاتی خطرات سے بھی چھٹکارا مل گیا تھا۔ ایسی ساری قیامتیں طفیل کے سر پر سے گزرتی تھیں۔ اب وہ اور بے فکری سے کلب اور دعوتوں کی دلدل میں دھنستا چلا جا رہا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ رات کے وقت بھی غائب رہتا۔ صبح کو آتا تو اس کے کپڑے ملے دلے ہوتے اور چہرے پر آوارگی کی پھٹکار برستی رہتی۔

آتے ہی وہ غسل کرتا اور کبھی کبھی طفیل اور نیلوفر کو ایک دوسرے سے قریب دیکھ کر کہتا۔ "یار طفیل تم تو میرے لئے ابرِ رحمت بن گئے ہو۔ جب سے تم نے آ کر میری ذمہ داری سنبھال لی ہے میں اپنے کاروبار میں زیادہ فائدہ دیکھ رہا ہوں۔"

"ہاں لیکن کب تک میں تمہارے کاروبار کی خاطر یہاں پڑا رہوں گا۔ مجھے اپنے لئے بھی تو کچھ کرنا ہے۔"

"کیوں مجھ میں اور تم میں فرق کیا ہے۔ میں تمہیں اپنا بھائی سمجھتا ہوں۔ کیوں نیلوفر؟"

"اور نہیں تو کیا" نیلوفر جزبز ہو کر کہتی۔

طفیل اکثر اس شام کے بارے میں سوچا کرتا جب وہ نیلوفر کے ساتھ ہنڈروفال دیکھنے کے لئے گیا تھا۔ سرسبز پہاڑیوں کی بلندی سے چشمے کا ٹھنڈا پانی گھن گرج کے ساتھ گر رہا تھا۔ نیچے ترائی میں جنگلوں کے درمیان چھوٹے چھوٹے آدیباسی گاؤں تھے۔ قریب ہی دوسری طرف ایک پتھر کے پاس آدیباسی عورت آنچل میں اپنے بچے کو پیٹھ پر لٹکائے لکڑی کا بوجھ سر پر رکھے ہوئے تیزی سے دامن کی طرف اترتی چلی جا رہی تھی جیسے کوئی چٹان لڑھک رہی ہو۔

سورج کی ڈوبتی ہوئی سرخ کرنوں میں ان کی جیپ نیچے ایک ماچس کی ڈبیہ نظر آ رہی تھی۔

نیلوفر نے بیٹھے بیٹھے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔ اسے ایسا معلوم ہوا ہنڈروفال اس کے سینے سے پھوٹ رہا ہے اور اس کی رگوں میں دوڑ رہا ہے، گرج رہا ہے۔

"نیلوفر تم میرے دوست کی بیوی ہو۔ تم کوئی بازاری عورت نہیں ہو۔"

"لیکن تم بھی کوئی بازاری آدمی نہیں ہو۔"

"میں تو ہوں۔۔۔۔۔"

"نہیں نہیں، تم نہیں ہو۔۔۔۔ تم نہیں ہو۔"

رات گئے جب دونوں پہاڑی سے اترے تو ڈرائیور جیپ میں بیٹھا انہیں گالیاں دے رہا تھا۔ وہ بیڑی پیئے جا رہا تھا اور اس کا دماغ بول رہا تھا۔۔۔۔ "یہ سب شریف بنتے ہیں۔ یہ کیسی شرافت ہے۔ ایک کی عورت دوسرے کی گود میں کھیلتی ہے۔ سب جانتے ہیں اور ایک دوسرے کو شراب پلاتے ہیں۔۔۔۔ ان کی عورتیں بھی شراب کا گلاس ہیں۔"

اب اس وقت بھی تین ساڑھے تین مہینے بعد گیارہ بجے رات کو طفیل، نیلوفر کے ساتھ اس کے سائن کے گدے پر لیٹا ہوا تھا۔ ہر طرف سناٹا تھا۔ نیلی روشنی میں ہر چیز دھندلی سرگوشی کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ اونچی کھڑکی سے اندھیرے آسمان میں چنگاریاں اڑتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ بنگلے کے پیچھے ملازم گپ کر رہے تھے۔

"یہ بہت برا ہوا" طفیل نے نیلوفر کے سینے میں اپنا منہ چھپاتے ہوئے بہت ہی غمگین آواز میں کہا۔ "یہ بہت برا ہوا۔ یہ حرام کاری ہے۔۔۔۔"

"نہیں یہ حرام کاری نہیں ہے۔ میں تمہیں مار دوں گی۔ طفیل بری باتیں منہ سے کیوں نکالتے ہو۔ ایاز خود غرض ہے۔ آوارہ ہے۔ میں اس کے بچے کی ماں بننا نہیں چاہتی۔۔۔۔ لیکن یہ بات دوسری ہے۔۔۔۔" اس نے طفیل کی گردن میں باہیں ڈال کر اس کی پیشانی چوم لی۔۔۔۔

کئی دن سے اس علاقے میں پولس نے بڑی سختی شروع کر دی تھی۔ پرسوں رات ہی ایک ٹرک چاول اور سیمنٹ سے لدا ہوا شہر سے باہر نکل کر جنگل میں داخل ہوا تو ایک پولس کی جیپ نے اس کا پیچھا کیا۔ ٹرک بہت تیز بھاگا۔ راستہ پہاڑی تھا۔ پیچ و خم بہت تنگ تھے۔ اس وقت طفیل بھی اسی ٹرک میں موجود تھا۔ ایک جگہ راستہ کاٹ کر ڈرائیور نے ٹرک کو روک دیا۔

"صاحب آپ یہاں اتر کر پچھلی طرف نکل جائیے، شہر کو جانے والی سڑک مل جائے گی۔"

طفیل نے کہا "اور تم؟"

"میری پروا نہ کیجئے۔ میں موت کو جل دے دوں۔ یہ سسری تو پولس ہی ہے۔۔۔۔ ہاہاہا" اس نے قہقہہ لگایا اور طفیل کو زبردستی ٹرک سے نیچے دھکیل دیا۔ طفیل اچک کر چٹان پر چڑھ گیا اور درختوں میں چھپ گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ ڈرائیور تیزی سے اپنے ٹرک کو پیچھے بھگا رہا تھا۔ اس نے ایک جھٹکے سے ٹرک کو پھر آگے گھمایا اور سانپ کی طرح بل کھاتی ہوئی سڑک

پر بھاگنے لگا۔ طفیل مڑ کر بھاگنے والا ہی تھا کہ جیپ تیزی سے ٹرک کے پیچھے جھپٹتی ہوئی نکل گئی۔ وہ دم بخود کھڑا ہو رہا۔ دوسرے ہی لمحہ ایک دھماکا ہوا۔ ٹرک چٹانوں سے ٹکراتا ہوا پہاڑی سے نیچے گرتا جا رہا تھا۔ اس میں آگ لگ گئی تھی اور وہ چیختے ہوئے شعلوں کے ساتھ بہت نیچے ایک لپکتے ہوئے سرخ آنچل کی طرح اڑتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

جیپ پندرہ بیس منٹ کے بعد تیزی سے مڑی اور واپس شہر کی طرف دوڑنے لگی۔

تھوڑی دیر کے بعد آنکھوں میں آنسو لئے ہوئے وہ پیدل الٹے راستے سے شہر کی طرف جا رہا تھا۔

"طفیل تم سنبھلو۔ تمہارا دوست ایاز تمہارا دشمن ہے۔ بڑا سمگلر م باز ہے۔ وہ تمہیں جال میں پھانس رہا ہے۔ اس کا کاروبار چلے گا نہیں۔ ناگر مل زیادہ دولت مند ہے۔ وہ اسے دبا دے گا۔ پولس اس کے ساتھ ہے۔۔۔۔"

"تو کیا ہوا؟" اس نے نیلوفر کے سینے میں اپنا منہ رگڑتے ہوئے اسی طرح کہا۔

"تو کیا ہوا۔۔۔؟"

"تم خطرے میں ہو۔ بری طرح پھنسو گے۔"

"میں کیوں پھنسوں گا۔۔۔۔"

"اسی لئے تو کہتی ہوں یہاں سے بھاگ چلو۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

"میرے ساتھ۔۔۔۔ تمہیں یہ بہت برا ہوگا۔" پھر اس نے اپنا سر اٹھا کر نیلوفر کی آنکھوں میں دیکھنا چاہا۔ لیکن ان میں کوئی وحشت نہ تھی۔ اس کے لب اس وقت بھینچے ہوئے تھے۔ اس لئے اس کی آنکھیں ہنس رہی تھیں۔ اس کے لب سرد اور سفید تھے۔ اس نے ٹالنے کے لئے پوچھا "نیلو تم اب لپ اسٹک کیوں نہیں لگاتیں؟"

"میں۔۔۔۔ میں اس لئے نہیں لگاتی کہ میں جانتی ہوں تم سنگترے کی پھانک کبوتر کے لہو میں ڈبو کر نہیں چوستے۔۔۔۔"

طفیل نے اپنے لب اس کے لب پر رکھ دیئے۔ اس وقت کھڑکی سے نومبر کی سرد ہوا کے جھونکے شن شن کرتے ہوئے اندر آ رہے تھے۔ نیلوفر نے اپنا ہاتھ بڑھا کر بڈ سوئچ دبا دیا۔

دیکھتے دیکھتے حالات بدل گئے تھے۔ کئی مقدمے ایک ساتھ ایاز پر چلنے لگے تھے۔ ان سارے مقدموں میں کسی نہ کسی طرح طفیل بھی پھنس گیا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔ ایاز کے وکیلوں کے اشارے پر وہ ناچ رہا تھا۔ کبھی کبھی جھنجھلا کر کہتا۔۔۔۔ "آخر میں یہ کیوں کہہ دوں۔ دوسرے کی لگائی ہوئی فصل میں کیوں کاٹوں۔"

"اس لئے کہ اس فصل سے تمہارا بھی پیٹ بھرتا رہا ہے۔" غصے سے طفیل کی آنکھیں نکل آتیں۔ لیکن وہ ایک بے بس فقیر کی طرح وکیل کے چہرے پر اپنی آنکھوں سے نفرت برسا کر خاموش ہو جاتا۔

وکیل اسے ابھی ابھی چھوڑ کر گیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ ناگرمل نے پولس کی مٹھی گرم کر کے ایاز کو بازار سے ختم کر دینے کی ساری چالیں مکمل کر لی تھیں۔ ایاز نے بزنس کے تقاضوں کو پورا نہیں کیا تھا۔ وہ بساط کا نیا مہرہ تھا۔ وہ بری طرح پٹ گیا تھا۔ اس کے بزنس کی چولیں جب ڈھیلی پڑنے لگیں اور اس پر مقدموں کا بار بہت پڑنے لگا تو وہ اور بے پروا ہو گیا۔ گھر سے غائب رہنے لگا' وہ اینگلو انڈین چھوکریوں میں زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کو اپنی تباہی کا یقین ہو گیا تھا اور وہ ان چند لمحات کا پورا پورا فائدہ اٹھا لینا چاہتا تھا جو اس کی زندگی میں باقی رہ گئے تھے۔ وہ کارخانے میں آتا' دو چار کاغذات دیکھتا۔ طفیل پر حکم جھاڑتا۔ مزدوروں کو گالیاں دیتا۔ دوبے کو کبھی ہاتھ سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیتا۔۔۔ "تم نے میرا معاملہ صاف کر دیا۔"
"کشتی جب ڈوبنے لگتی ہے تو مسافر ملاح سے اسی طرح بات کرتا ہے" دوبے اپنی گردن کو سہلاتے ہوئے اطمینان کے ساتھ کہتا۔

اسی دن ایاز نے طفیل سے بھی ذرا گرم ہو کر بات کی۔ "تم ہر وقت عیاشی میں لگے رہتے ہو' میری دوستی اور شرافت کا اچھا بدلہ دیا ہے تم نے۔"

"ایاز میں دوستی کی وجہ سے تمہاری عزت کرتا ہوں۔ کوئی شخص بھی مجھ سے اس زبان میں بات کرے اور اپنی گردن سلامت لے کر سامنے سے چلا جائے' ایسا کبھی نہیں ہو سکتا"۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہوا اور اس نے ایاز کی ٹائی پکڑ لی' اور اسے اتنے زور سے جھٹکا دیا کہ وہ تلملا گیا اور لپک کر لپٹ گیا۔ "پیارے طفیل ۔۔۔ میری جان ۔۔۔ میرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ تم میری مصیبت جانتے ہو۔ تم میری جگہ ہوتے تو۔۔۔" اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ وہ وہاں سے

نکلا اور زینے سے اپنی آنکھیں خشک کرتا اور اپنے لبوں پر ایک خباثت سے بھری مسکراہٹ ابھار کر مزدوروں کو ڈانٹ بتاتا ہوا وہاں سے باہر چلا گیا۔

ابھی اس کی موٹر سائیکل کی آواز طفیل کے کانوں میں اچھی طرح مری بھی نہیں تھی کہ فون چیخنے لگا۔ اس نے اپنے بالوں کو ایک ہاتھ سے سہلاتے ہوئے کہا "ہلو۔۔۔۔" اس کے کان میں باریک سی لوچدار آواز آئی۔ "ایاز اسپیکنگ۔۔۔۔؟"

"ہاں"

"تم آئے کیوں نہیں؟" انگریزی میں اسی نازک سی آواز نے پوچھا۔

"شٹ اپ یو بچ۔۔۔۔" اس کے کان میں ایک حیرت سے بھری ہوئی چیخ سنائی دی اور اس نے ریسیور رکھ دیا۔

اگلی صبح ایک مقدمے کا فیصلہ سنایا جانے والا تھا۔ طفیل کی آنکھوں میں زنجیریں ابھر رہی تھیں۔ ان کی آواز میں کتنی اذیت سے بھری ہوئی جھنکار تھی۔ وہ اپنے جسم سے سانپوں کو پکڑ پکڑ کر دور پھینک رہا تھا۔ وہ ایک سانپ کو دور پھینکتا تھا اور سو سانپ اس کے جسم سے اُس کی گردن سے اُس کی ٹانگوں سے لپٹ جاتے تھے۔

"کیا میں بھاگ جاؤں؟ بھاگ جاؤں تو ایاز میرا کیا کر سکتا ہے۔ وہ اپنے گناہوں کا زہریلا پھل مجھے کھلانا چاہتا ہے۔"

لیکن اس کے فوراً بعد اس کے خیالات کے شعلوں میں ایک پھول سا کھل اٹھا۔ وہ اب نیلوفر کے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ یہ دوسری عورت تھی جس نے اس کے جسم کو شانتی دی تھی۔ اور اس کی روح میں گداز پیدا کیا تھا۔۔۔۔'

تین چار سال پہلے دسمبر کی برفیلی رات میں وہ راجدھانی کے اسٹیشن پر تیسرے درجے کے مسافر خانے میں ایک آوارہ اور گنجے کتے کی طرح ایک کونے میں پڑا ہوا تھا۔ سردی میں اس کا دم گھٹ رہا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک بھکارن سوئی ہوئی تھی۔ وہ بغیر سوچے سمجھے اس کے کمبل میں گھس گیا تھا۔ اس بھکارن نے فوراً اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا تھا۔ پھر رات بھر وہ اس پھٹے ہوئے کمبل میں گرم ہوتا رہا تھا اور صبح ہونے سے پہلے جب کوؤں نے پہلی بار آواز نکالی

اور درختوں سے انجن کی سیٹی کے ساتھ چڑیاں پھڑ پھڑا کر اڑیں تو وہ چلتا بنا۔ اس نے بھکارن کا منہ بھی نہیں دیکھا۔ البتہ جب تھوڑی دیر کے بعد وہ ریلوے پل پر بیٹھا ہوا تھا تو اس کی گردن پر جوئیں رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس کے بعد خالی پیٹ ہونے کے باوجود اسے ایسی متلی ہوئی کہ وہ غاغا کرتا ہوا اپنے منہ سے کھارا پانی اگلنے لگا۔

لیکن اس وقت جب اسے اپنی زندگی میں داخل ہونے والی دوسری عورت نیلوفر کا خیال آیا تو وہ کانپ گیا۔ جس درخت کے سائے میں وہ زندگی کی چلچلاتی ہوئی دھوپ سے بچنے کے لئے بیٹھ گیا تھا اس میں آگ لگ گئی تھی۔۔۔۔ لیکن اب وہ اس درخت کو جلتا ہوا چھوڑ کر کیسے چلا جائے۔۔۔۔ کیسے چلا جائے۔۔۔۔ یہ تو بڑی بزدلی۔۔۔۔ بڑا کمینہ پن تھا۔۔۔۔ وہ بار بار ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔

"ستارہ گردش میں ہے۔" دوبے نے کمرے میں آتے ہوئے کہا۔

"کیوں کیا ہوا۔ ستارہ گردش میں ہے۔ کیوں گردش میں ہے۔ ٹوٹ کر گر کیوں نہیں جاتا۔"

دوبے نے انکھیوں سے اس کی طرف دیکھا اور تجوری کی کنجی اپنی جیب میں رکھتے ہوئے بولا "طفیل صاحب موج کیجئے اب ستارہ ٹوٹ کر گرنے والا ہے اور کل صبح ہاتھ میں ہتھکڑی ہوگی ۔۔۔۔ اور۔۔۔۔ اور۔"

"کس کے ہاتھ میں ہوگی ہتھکڑی؟"

"آپ کے۔۔۔۔ سارے کام آپ کے دستخط سے ہوئے ہیں نا؟ گواہوں نے بھی تو آپ کا ہی نام۔۔۔۔ اچھا خیر چھوڑیئے جناب، میں بنگلے پر گیا تھا" اس نے ایک کالی سی مسکراہٹ کو اپنے لبوں میں دفن کرتے ہوئے انتہائی کڑواہٹ کے ساتھ کہا۔

"وہ نیلوفر صاحبہ آپ کا انتظار کر رہی تھیں۔ انہوں نے کہا تھا آپ کو فوراً بھیج دوں۔ میرا خیال ہے آپ فوراً سے پیشتر چلے جایئے۔۔۔۔" اس نے چٹکی بجائی۔

کارخانے کے مزدوروں نے چھجے پر آکر زور زور سے دھمکیاں دینا شروع کیں۔

ہماری محنت کوئی نالے کا پانی نہیں ہے۔

خون بہتا ہے خون۔

ہماری محنت کا پھل ملنا چاہیے۔
ہمیں معلوم ہے اب یہ کارخانہ نہیں چل سکتا۔
یہ کارخانہ مرا ہوا گھوڑا ہے۔
مرے ہوئے گھوڑے پر سواری نہیں کی جاتی۔
ہمارے پیسے دے دو۔ ہماری محنت کا پھل۔

طفیل بھی جانتا تھا کہ اب کارخانہ بند ہو جائے گا۔ ایاز خان اب بھی اینگلو انڈین چھوکریوں اور شراب میں ڈوبا ہوا تھا۔ تجوری کی کنجی دوبے کے قبضے میں تھی۔ کل صبح مقدمے کا فیصلہ ہو گا۔ زنجیریں اسے پکار رہی ہیں۔ ان زنجیروں کا سلسلہ ماں کے پیٹ سے نیلوفر کی کٹی ہوئی بے نیاز زلفوں تک ہے۔ ان زنجیروں کا سلسلہ نیلوفر کی زلفوں سے قید خانے کی دیواروں تک ہے۔ یہ زنجیریں ہر جگہ ہیں۔ یہ زنجیریں پیٹ میں ہیں۔ یہ زنجیریں دماغ میں ہیں۔ یہ زنجیریں ہر جگہ ہیں۔ یہ زنجیریں دوستی میں ہیں' یہ زنجیریں جسم کی سپردگی میں ہیں اور یہ زنجیریں باہوں کے گداز میں ہیں اور آنکھوں کی بیزاری میں ہیں۔ ہاں یہ زنجیریں ہر جگہ ہیں' ہر طرف ہیں ـــــ کارخانے کے مزدوروں کی آوازیں اور تیز ہو گئیں۔ زنجیروں کی جھنکار اور تیز ہو گئی۔ دوبے اطمینان سے ٹہلتا رہا۔ ـــــ زندگی میں پہلی بار طفیل آدمیوں کی آواز سے' ان کی سانسوں سے' ان کی قربت کے احساس سے ڈرنے لگا۔ ـــــ ٹرک کے ڈرائیوروں کی آوازیں سب سے اونچی آ رہی تھیں۔

اسی طفیل کے بچے کی وجہ سے ہمارا دوست ٹرک میں جل کر مر گیا۔

بڑا لپاٹیا ہے الو کا پٹھا۔ چور ـــــ بے ایمان ـــــ کمینہ۔

طفیل ایک اندھے طوفان کی طرح اٹھا اور پچھلے زینوں سے نیچے اتر گیا۔ اور اسے محسوس بھی نہیں ہوا کہ وہ تیز تیز چلنے کی بجائے سڑک کے کنارے کنارے دوڑ رہا ہے اور راہ گیر اسے حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ سر ہلا رہے ہیں اور اشارے کر رہے ہیں۔

شہر سے باہر وہ تالاب کے کنارے دس گیارہ بجے رات تک بیٹھا رہا۔ اونچے آسیبی درختوں میں ہوائیں چیختیں اور اس کے سینے میں برف سی جما دیتیں۔ صبح آئے گی اور اس کے لئے

زنجیریں لائے گی۔۔۔۔اس کے سوا اس کے دماغ میں اور دوسرا خیال نہیں تھا۔

وہ آدھی رات کے بعد پٹا ہوا' لڑکھڑاتا ہوا' گھسٹا ہوا' بنگلے میں پہنچا تو ایاز خان کا ٹائیگر آکر اس کے پیروں سے لپٹ گیا۔ اس کتے کو اس کا انتظار تھا۔ وہ چپکے سے اپنے کمرے میں گیا۔ اس نے تحریر دار نیلگوں قمیص اور پاجامہ پہنا۔ اسے نیند نہ آئی۔ وہ لیچی اور آم کے درختوں کے سائے میں ہوا کے منہ زور طمانچوں کو جھیلتا ہوا ٹہلتا رہا۔ اس کا جسم لرز رہا تھا۔ لیکن اس کا جی کمرے میں جانے کے لئے تیار نہ تھا۔ غیر ارادی طور پر وہ کھڑکی کی نیلی روشنی کے پاس پہنچ گیا۔ وہ غسل خانے کے پاس چھوٹے سے اندھیرے برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔ اسے معلوم تھا دوسری طرف نیلوفر کی چارپائی رکھی ہوئی ہے۔ وہ اس میں اپنی نزاکتوں اور بیزاریوں کے ساتھ لیٹی ہوئی ہے۔ اس کا ایک ہاتھ پیشانی پر رکھا ہوا ہے اور دوسرا تکئے کے نیچے دبا ہوا ہے۔ اس کی آنکھیں دیوار پر ایک چھوٹے سے ننھے بچے کی تصویر پر جمی ہوئی ہیں۔

اس نے اپنے کان دیوار سے لگا دیئے۔ زور زور سے سانس لینے کی اور سسکیاں بھرنے کی آواز آرہی تھی۔

"نہیں ایاز یہ بہت بڑا ظلم ہو گا۔ میں مر جاؤں گی۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا" نیلوفر کی آواز میں پہلی بار اتنی حقیر قسم کی پسپائی اسے سنائی دی۔ وہ چونک گیا۔ اس کا جی چاہا کہ دوڑ کر وہ اندر پہنچ جائے ۔۔۔۔اور اسے اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھا کر فضا میں بلند کر دے ۔۔۔۔اور بلند' اور بلند ۔۔۔۔لیکن ۔۔۔۔'

"دیکھو نیلوفر ۔۔۔۔صاف بات! زندگی بھر تم مجھے اور میں تمہیں دھوکا دیتا رہا ہوں اور دونوں کو یہ معلوم ہے ۔۔۔۔تم ایک فلرٹ عورت ہو اور میں ایک آوارہ آدمی ہوں۔"

"تم آوارہ کتے ہو۔" نیلوفر کی آواز سسکیوں میں بھری ہوئی ابھری۔

"ہاں ٹھیک ہے۔ میں آوارہ کتا ہوں۔" ایاز کی آواز میں شراب بول رہی تھی۔

"لیکن تمہیں ان دونوں میں سے ایک کو چننا ہو گا ۔۔۔۔ایک طرف یہ دوا کی چھوٹی سی شیشی ہے اور دوسری طرف طفیل۔"

"نہیں ایاز یہ بہت بڑا ظلم ہو گا۔ مجھے ماں بننے دو ۔۔۔۔"

"تم پہلے بھی ماں بن سکتی تھیں۔ لیکن تم نہیں بنیں۔ تم چاہتی تھیں میں باپ نہ بنوں۔ ایس

۔۔۔۔یہ دوا کی شیشی تمہاری جگری سہیلی ہے۔ پہلے تم اسے لاتی تھیں' آج میں لایا ہوں"
۔۔۔۔ایاز کو ہچکی پر ہچکی آ رہی تھی۔ طفیل کا حلق خشک ہو رہا تھا۔۔۔۔ "نہیں نیلوفر تمہیں دونوں میں سے ایک کو چننا ہوگا۔ دونوں ہاتھ میں لڈو۔۔۔۔یہ انصاف نہیں۔"
"لیکن تم تو باپ بن چکے ہو۔ وہ تصویر۔۔۔۔"
"بد تمیز عورت۔۔۔۔" ایاز خان کے طمانچوں کی آواز سے خاموش فضا میں تالیاں بج اٹھیں۔ "میں تمہارے طفیل کا خون کر دوں گا۔ وہ کل جیل چلا جائے گا۔ دوستی کا اچھا پھل دیا ہے سوؤر نے۔۔۔۔ میں۔۔۔۔ میں" نشے میں بھرائی ہوئی ہانپنے کی آواز اس کے سینے میں برف کا تودہ بن کر جمتی جا رہی تھی۔
"تو میں ایک باپ۔۔۔۔" اس کے لب آہستہ آہستہ پھیلے جیسے زخم آہستہ آہستہ کھلتا ہے۔ دوسرے ہی لمحے اس کے لب بھنچ گئے۔ ایاز خان زور زور سے پکار رہا تھا۔ "طفیل۔۔۔۔ طفیل۔۔۔۔" ایاز کی آواز طفیل کے کمرے کی طرف جا رہی تھی۔ وہ اسی طرح دبکا کھڑا رہا۔ "طفیل۔۔۔۔ طفیل۔" وہ آہستہ سے دوسری طرف جھکا اور کھڑکی کے نیچے پردے کے کونے سے جھانک کر دیکھنے لگا۔ نیلوفر لیٹی ہوئی تھی۔ خاموش آنکھیں کھلی ہوئی۔ گالوں پر آنسو چمک رہے تھے۔ نگاہیں تصویر پر جمی ہوئی تھیں۔ "طفیل۔۔۔۔ طفیل۔۔۔۔" آواز ختم ہو گئی۔

نیلوفر اٹھی اور اس نے دوا کی شیشی اٹھائی اور پی گئی اور پھر لیٹ گئی اور بچے کی تصویر کو گھورنے لگی۔ اس کی مسکراہٹ اس جواری کی مسکراہٹ تھی جو بازی میں سب کچھ لٹا کر' اپنی ساری متاع ہار کر' اپنی شکست کو چھپانے کے لئے اپنے حریف پر مسکراہٹ کی ٹھنڈی آگ برساتا ہے۔

ایاز کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔ بڑی مچھلی چھوٹی مچھلی کو کھاتی ہے۔ مضبوط سانڈ کمزور سانڈ کو اپنے سینگوں پر اٹھا کر اس کا پیٹ چاک کر دیتا ہے۔ میں دو سانڈوں کے درمیان کچلا جا رہا ہوں۔ ناگرمل اور ایاز۔ لیکن میں کچلا کیوں جاؤں؟ اس لئے کہ میں ایک آوارہ انسان ہوں۔ میرا کوئی گھر نہیں ہے۔ میری کوئی ماں نہیں۔ کوئی بہن نہیں۔ میں دوسروں کی روٹی پر پلتا ہوں۔ دوسروں کی عورتوں کو حرام کاری سکھاتا ہوں۔ میری حرام کاری کے پھل کو مارنے کے لئے عورت دوا کی شیشی منہ سے لگا لیتی ہے' اور پھر بھی میں ذلیل اور کمینہ ہوں۔ ناگرمل اور ایاز اوپر اٹھتے رہتے ہیں۔ نیلوفر اوپر اٹھتی چلی جاتی ہے اور میں گرتا چلا جاتا ہوں گرتا چلا

جاتا ہوں۔۔۔۔ میں کیا ہوں۔ ہوا میں اڑتی ہوئی قمیض ہوں' شاخ سے گرا ہوا گرد آلود پھول ہوں۔ خزاں کا زرد پتہ ہوں۔ سگریٹ کا دھواں ہوں۔۔۔۔ میں کیا ہوں۔۔۔۔ اور میں گر رہا ہوں۔۔۔۔ لیکن کیوں گر رہا ہوں۔ میرے راستے میں' ناگر مل' ایاز اور نیلوفر کیوں آگئے ہیں ۔۔۔۔ دوبے اپنی بھینگی آنکھوں کے ساتھ مجھ پر اپنا رذیل زہر خند کیوں لنڈھا رہا ہے۔۔۔۔ کیوں۔۔۔۔'

اس کا سارا بدن بخار سے جلنے لگا تھا۔ گیٹ پر زور سے آواز ہوئی۔ ایک ٹرک اور جیپ کھڑی تھی۔ کتا بھونک رہا تھا۔ طفیل بے ارادہ احاطے کی پچھلی دیوار سے کود کر بے تحاشہ بھاگنے لگا۔

کوئی اسے پکار رہا تھا۔۔۔۔ "طفیل۔۔۔۔ طفیل۔۔۔۔" یہ ایاز کی آواز تھی۔ یہ ناگر مل کی آواز تھی۔ یہ نیلوفر کی آواز تھی۔ یہ آواز دوبے کا قہقہہ تھی اور اس قہقہے میں زنجیریں چیخ رہی تھیں۔ وہ اب کانسٹبل کی چوکی سے بھی آگے نکل گیا تھا۔ وہ شب خوابی کے لباس میں بھاگا جا رہا تھا۔۔۔۔ اس کے کانوں میں ہوائیں چیخ رہی تھیں۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ لیکن وہ اس چڑھتی ہوئی پہاڑی سڑک پر دوڑتا چلا جا رہا تھا۔ جو جنگل کی طرف مڑتی تھی۔

ایک بار اور اس کے کانوں میں مختلف قسم کی آوازیں گونجنے لگیں۔ یہ آوازیں اسے پکارتی رہیں۔ لیکن وہ اس وقت تک بھاگتا رہا جب تک کہ صبح کے دھندلکے میں سانس لیتے ہوئے جنگل تک نہ پہنچ گیا۔۔۔۔ اور اس وقت تک اسے برابر یہ محسوس ہوتا رہا کہ وہ چڑھائی پر نہیں دوڑ رہا ہے بلکہ ڈھلان پر پہیوں کی طرح پھسلتا رہا ہے۔۔۔۔'

وہ ایک شیشم کے درخت سے پیٹھ لگا کر کھڑا ہو گیا اور گھنے جنگل کے اوپر بکھرتے ہوئے اندھیرے میں اس نے ہانپتے ہوئے خود اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"نہ جانے اس ڈھلان کی کوئی وادی بھی ہے یا نہیں۔ میں اس طرح کب تک دوڑتا رہوں گا۔ کب تک پھسلتا رہوں گا۔۔۔۔" دور پہاڑیوں سے ٹکرا کر اس کی آواز ٹوٹ گئی۔۔۔۔'

"نہ جانے اس ڈھلان کی کوئی وادی بھی ہے یا نہیں۔۔۔۔"

یہ اس کی اپنی آواز نہیں تھی۔ یہ تو پورے ایک جلوس کی آواز معلوم ہوتی تھی۔ اس کے کارخانے کے لوگوں کی آواز' ڈرائیوروں اور سڑک پر مٹی ڈالنے والی آدیباسی عورتوں کی آواز۔

وہ گھبرا کر چاروں طرف جنگل میں ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

اس کے کانوں میں انجن کی گھنگھناہٹ سی آہستہ آہستہ ابھرنے لگی۔۔۔۔اس کے ساتھ ہی ایاز کی آواز آئی۔

"میری جان یہ نہ کہو۔ کاروبار میں ایسے آدمی کی تلاش تھی مجھے قسمت سے مل گیا ہے۔ کام کا آدمی ہے۔۔۔۔ میری نیلو۔۔۔۔ ہوں ہوں ہوں۔"

اور اس کے بعد دوسری طرف سے نیلوفر کی آواز آرہی تھی۔

"ہاں دوبے! انہیں کل کارخانے ضرور لے جانا۔ کام کے آدمی ہیں۔۔۔۔"

وہ ایک بار پھر جنگل کے درمیان کالی سڑک پر دوڑنے لگا۔ لیکن اب کے وہ واقعی ڈھلان میں اتر رہا تھا۔

○

رگِ سنگ

منصور نے بڑے گیٹ پر پہنچ کر اپنی سائیکل آہستہ کرلی۔ اندر کوٹھی میں نیلی اور لال روشنیاں ایک پراسرار خاموشی کے ساتھ کھڑکیوں اور دروازوں پر جلتے ہوئے پردوں سے جھانک رہی تھیں۔ دو تین کاریں بھی باہر کھڑی تھیں۔ اب بھی اسے کچھ یاد نہ آیا۔ اس نے دسمبر کی ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنے ڈبل برسٹ کوٹ کے کالر اوپر اٹھالئے اور سائیکل سے اتر کر گیٹ کے اندر داخل ہو گیا۔

ان کاروں کے ڈرائیور برساتی میں کھڑے سردی سے ٹھٹھر رہے تھے اور بیڑی اور سگریٹ کے دھوئیں میں جاڑے کا غم غلط کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

"آداب عرض ہے ماسٹر صاحب" ان میں سے ایک ڈرائیور نے اس کا خیر مقدم کیا۔
"آداب بھائی۔۔۔۔ کیا بات ہے۔ کیا جھمیلا ہے؟"
"اوہ ماسٹر صاحب آپ کس دنیا میں رہتے ہیں؟ وہ اپنی نجمی رانی کی سالگرہ ہے نا؟"

منصور خاموش سر جھکائے، اپنے کالروں کو دبوچے ہوئے سائیکل گھسیٹتا ہوا کوٹھی کے بائیں پہلو کی طرف بڑھتا چلا گیا۔ اس نے کالروں کو اور زور سے دبوچ لیا۔ جیسے اسے ان خرگوشوں کے بھاگ جانے کا خطرہ ہو۔

مالی اور ڈرائیور کے کمروں سے بھی ذرا آگے اس کا کمرہ تھا۔ وہاں اندھیرا تھا۔ البتہ خان ساماں اور بیروں کی کوٹھریوں کے پاس روشنی اور چہل پہل تھی۔ برتنوں کے بجنے اور دبے دبے قہقہوں کی آواز سے اسے اندازہ ہوا کہ سالگرہ میں آئے ہوئے مہمان کچھ کھانے پینے کے دور

چلا رہے تھے۔

اس نے اپنے کمرے کا سوئچ دبایا' مگر کمرے میں اندھیرا ہی رہا۔

"دل و دماغ سے لے کر بلب تک ہر چیز کا فیوز اڑا رہتا ہے۔" وہ آہستہ آہستہ بڑبڑایا۔

اس وقت اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بیٹھ کر کچھ ضروری کام کرے۔ لیکن اب روشنی غائب تھی۔ دوسری طرف کوٹھی سے لوگوں کے قہقہوں کے پٹاخوں کے پھٹنے کی آواز آ رہی تھی۔

وہ اندھیرے میں ویسے ہی لیٹ گیا۔ اندھیرے میں اس کے تکئے سے بو نکل کر اس کی ناک میں گھسنے لگی اور اسے محسوس ہوا کہ ٹھیک اس کے سرہانے کوئی مرا ہوا چوہا سڑا پڑا ہے۔ اس کی طبیعت متلائی اور اس نے اٹھ کر دوسری طرف کی کھڑکی کھول دی۔ اس طرف دھوبیوں کے خاندان الاؤ تاپ رہے تھے۔ اور ان کا اکلوتا گدھا اپنے دونوں کان سمیٹے ہوئے ان کی دکھ درد کی کہانی بڑے غور سے سن رہا تھا۔

"میں تو کہتا ہوں بابو جی ٹائپ کے لوگ تو کچھ دنوں میں ننگے ہی دپھتر جایا کریں گے۔" دھوبی نے اپنا حقہ گڑگڑاتے ہوئے کہا۔ اس کے گھر والے ہنسنے لگے۔ بوڑھا دھوبی سنجیدہ ہو گیا۔ "یہ کوئی مسکھری کی بات نہیں ہے اجرا۔ گاہک کے پاس جتنے کپڑے کم ہوں' اپنا اتنا ہی دیوالہ نکلتا ہے۔"

گدھے نے قہقہہ لگا کر داد دی۔ بوڑھے دھوبی نے اس کے قہقہے کا برا مانتے ہوئے اور اس کی گستاخی پر ایک ڈانٹ پلاتے ہوئے کہا۔ "سالے تجھے بھی مستی چڑھی ہے۔۔۔۔پت جھڑ میں جب پیڑ ننگا ہوتا ہے تو اس کے نیچے بیٹھے ہوئے لوگوں کے سر سے سایہ اٹھتا ہے۔۔۔۔"

منصور کے ہونٹ اندھیرے میں پھیل گئے۔ اس نے کھڑکی سے ہٹ کر ایک بار پھر روشنی کا بٹن دبایا۔ لیکن اسے لگا کہ بٹن دبانے سے اندھیرا اور بڑھ گیا ہے۔ اپنے خاندان میں بیٹھ کر اور مرغی کی طرح اپنے چوزوں کو اپنے پروں کے اندر چھپا کر گپ ہانکنے میں کتنا لطف آتا ہوگا۔

وہ پھر لیٹ گیا۔ کھڑکی میں کھڑے ہونے کی وجہ سے اس کے کان ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ لیکن اس کی پیشانی سے آنچ نکل رہی تھی۔ رفتہ رفتہ اسے اپنے سینے کے اندر درد کی کسک بڑھتی

ہوئی محسوس ہوئی۔ اس نے کروٹ بدلی اور ساکت ہو گیا۔ جب کبھی اس کے سینے میں درد کی ہلکی سی لہر اٹھتی تھی' اس کا خون جمنے لگتا تھا۔ اور اس کے دل کی دھڑکن گھونسوں میں بدل جاتی تھی۔ اس وقت بھی گھونسوں کی دھمک سے اس کا پورا وجود مٹی کی دیوار کی طرح دھنستا چلا جا رہا تھا۔ اس نے اسی بدبودار تکیے کو اپنے سینے کے نیچے دبا لیا۔ ان کے منھ سے انجانے میں ایک دو بار کراہ نکل گئی۔ اور اس کے بعد اس کے حلق سے ایک عجیب قسم کی خرخراہٹ کی آواز نکلنے لگی۔ اس پر غنودگی طاری ہو گئی اور تھوڑی دیر کو اس کے کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ قبر کا سناٹا۔

کوٹھی میں محفل کافی گرم ہو چکی تھی۔

مہمان کھانا کھا چکے تھے۔ اور اب کافی کا دور چل رہا تھا۔ سبھوں کے ہاتھوں میں نیلی پیالیاں تھیں۔ چھوٹی چھوٹی' کھلونوں کی طرح' جیسے گڑیوں کے ہونٹوں کو چھونے کے لئے بنائی گئی ہوں۔ صوفے کے تین سٹ اس طرح رکھے گئے تھے کہ کمرہ تکونا احاطہ سا بن گیا تھا۔ چوتھی طرف بڑا دروازہ تھا۔ جو پیچھے میں کھلتا تھا۔ دروازے پر پڑا ہوا نیلا مخملیں پردہ آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ جس پر دو رقاصائیں اجتنائی کولہوں کو ایک طرف پوری وحشت سے لچکاتی ہوئی اور اپنی باہوں کی پرواز میں ترنم کی پینگ پیدا کرتی ہوئی فضا میں آہستہ آہستہ بلند ہو رہی تھیں۔

پروفیسر قدوس نے اپنی اونٹ کی سی گردن ذرا اٹھائی۔ اپنی ٹائی کو دو تین بار سہلایا۔ آنکھوں میں للچاہٹ کی آگ پر پلکیں جھپکاتے ہوئے اپنے خاص معشوقانہ انداز میں نجمی رانی کو دیکھا جو ایک سیاہ ساڑی میں لپٹی ہوئی اپنے سڈول جسم کے پیچ و خم کا اشتہار بانٹتی ہوئی رانا صاحب کے پاس صوفے پر بیٹھی پوچھ رہی تھی۔ "کیوں رانا صاحب کافی کا دوسرا دور چلے گا یا نہیں؟"

رانا صاحب نے فوراً اپنے گنجے سر پر ہاتھ پھیرا جو کدو کی طرح بلب کے نیچے چمک رہا تھا۔

"بھئی تم کہو تو......رات بھر زہر کا دور چلتا رہے۔"

رانا صاحب اپنی ادھیڑ عمر کا غم اس قسم کے جملوں سے غلط کر کے "پبلک" کی نظر میں اپنا بھرم رکھنے کی کوشش موقع بے موقع ہمیشہ کیا کرتے تھے۔ نجمی رانا صاحب کی جوہر شناسی اور قدر دانی کی قدر کرتی تھی۔ اور اپنی ایک ہلکی مسکراہٹ سے ان کا دل رکھنے کی کوشش ہمیشہ کیا کرتی تھی۔ لیکن اس وقت پروفیسر قدوس' کپتان زیدی' ڈاکٹر کیلاش اور پروفیسر نجیب (جن کو لوگ

ان کے نسلی گنڈ منڈ پر طنز کرنے کے لئے نجیب الطرفین کے نام سے یاد کیا کرتے تھے) کی موجودگی میں رانا صاحب کا یہ جملہ نجمی کو برا لگا اور اس نے اپنا منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ رانا صاحب کو اپنے بے سرے ہونے کا احساس فوراً ہوا۔ اور انہوں نے تلافی کے لئے کہا۔

"بھئی قدوس تم پردے کی تصویروں کو کیوں کھائے جا رہے ہو۔ اور بھی دلکش چیزیں ہیں یہاں۔"

"رانا صاحب میں تو نجمی کو دیکھ رہا ہوں۔"

"تیر نشانے پر نہیں بیٹھا۔"

اوروں نے زوردار قہقہہ لگایا۔ نجمی بدمزہ ہو گئی۔ "یہ لوگ کتنے چھچھورے اور بے وقوف ہیں۔" اس نے اپنے گھنگھریالے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔

نجمی تمہارے بال تو آج خوب بنے ہیں۔ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ ان کے پیچ و خم مصنوعی ہیں۔"

ایک اور زخم لگا۔ نجمی ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے سوا محفل کی خدمت میں اور کچھ نہ پیش کر سکی۔

نجمی اٹھی اور رانا صاحب کی بہن سریتا کے پاس بیٹھ گئی۔ لوگوں نے اپنی ننھی پیالیوں میں دوبارہ نکل کے چمکدار پرکیولیٹر سے کافی انڈیلی اور اپنی اپنی نشستیں بدل کر اور نئے نئے حلقے بنا کر بیٹھ گئے۔

پروفیسر قدوس بھی سریتا اور نجمی کے پاس آبیٹھا۔

سریتا نے اپنی آنکھوں کے پٹ فی منٹ ایک ہزار بار کی رفتار سے کھولے اور بند کئے اور معنی خیز نظروں سے نجمی کے پریشان اور اداس چہرے کو دیکھتے ہوئے بولی۔

"کیوں قدوس صاحب ان دنوں آپ ہماری طرف نہیں آتے۔ لگتا ہے کہ آپ کی شاموں کا بھاؤ بہت بڑھ گیا ہے۔"

پروفیسر قدوس نے اپنا ہاتھ سریتا کے دپ دپ کرتے ہوئے شانے پر رکھ دیا۔ اور اس کی لمبی لمبی انگلیاں سیاہ بلاؤز کے گلے سے ذرا اوپر سنہری جلد پر آہستہ آہستہ تھرکنے لگیں۔ سریتا کا

جسم کانپ گیا اور اس کی آنکھیں نیچی ہو گئیں۔

نجمی کا نچلا ہونٹ اپنے پتلے پن کے باوجود لٹک آیا۔ اور لپ اسٹک کی لیپ چمکنے لگی "سریتا کا عشق ابھی ختم نہیں ہوا ہے۔ بے وقوف! پروفیسر قدوس کو نہیں پہچانتی۔"

"بھئی تم جانتی ہو" نجمی کی ذرا مدد ہو جائے تو وہ یونی ورسٹی میں ٹاپ کر سکتی ہے۔ میں تعلیم میں اس کی مدد کرنے چلا آتا ہوں۔"

"ٹاپ تو میں بھی کر سکتی ہوں" سریتا نے اپنی کافی کی پیالی منھ سے لگاتے ہوئے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔

"تو تمہیں پڑھایا نہیں میں نے گھر پر...... لیکن جب تمہاری ماتاجی......" رک کر سیٹی بجانے لگا اور نجمی کی گردن پر سنہری بالوں کے گچھے پر ایک جماہی بھری نظر ڈالتے ہوئے بولا "نجمی! یہ کیا تک ہے تم نے آج کوئی غزل نہیں سنائی۔"

نجمی نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اور بڑے کلاک کو گھورنے لگی جو گیارہ بجا رہا تھا۔ رانا صاحب نے نجمی کو کلاک کی طرف اس طرح گھورتے ہوئے دیکھ کر دل میں بڑی گدگدی محسوس کی۔ پچھلے سال اس نے سالگرہ کے موقع پر یہ تحفہ دیا تھا۔ اس رات سب کے آخر میں رانا صاحب رخصت ہوئے تھے۔ سریتا پروفیسر قدوس کے ساتھ جا چکی تھی۔ اور جب زینے کے پاس نجمی نے الوداع کہتے ہوئے اپنا نرم ہاتھ اس کے ہاتھ میں دے دیا تھا' تو وہ سردی کے باوجود ایک کبوتر کی طرح گرم محسوس ہوا تھا۔ وہ خلاف قاعدہ دیر تک اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لئے رہا تھا۔ اور وہ صرف یہ کہہ سکی تھی "رانا صاحب ذرا اجاڑ چاندنی دیکھئے۔ جاڑے میں چاندنی پر کیسی بیوگی چھا جاتی ہے۔"

اور اس رات گھر جا کر رانا صاحب نے وسکی کا گلاس خالی کرتے ہوئے تقریباً زور سے نعرہ لگایا تھا۔ "کاش میں ادھیڑ نہ ہوتا ورنہ چاندنی کی بیوگی لہکتے لہکتے سہاگ میں بدل جاتی۔ اب کے میرا تحفہ سب سے زوردار رہا۔ ہی ہی۔ اس کے پیٹ میں شراب اتر رہی تھی۔ اور اس کی خوشی کا پانی اس کے سر کے اوپر سے بہہ رہا تھا۔ آج کتنی دیر تک اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دئے کھڑی رہی۔ چاندنی کھلی ہو اور تحفہ قیمتی ہو۔ تو جنت اتر آتی ہے زمین پر۔ ہی ہی ہی۔"

اور اس وقت جب نجمی کو بار بار کلاک کی طرف گھورتے ہوئے دیکھا تو چہک کر بولے۔

"نجمی گھڑی وقت تو ٹھیک دیتی ہے نا۔"
"جی...... جبھی تو گیارہ بجا رہی ہے۔"

سب نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور اس اشارے کو صاف گول کر گئے۔ جب سریتا نے دیکھا کہ پروفیسر قدوس اپنی اونٹ کی سی گردن کو ہلا ہلا کر نجمی پر نچھاور ہوئے جا رہے ہیں' تو وہ اٹھ کر کپتان زیدی کے پاس چلی گئی۔ انہوں نے فوراً بندہ بے دام کے سے انداز میں اپنا سنہرا دانت جھلکاتے ہوئے اپنا سگریٹ کیس کھول کر اس کے سامنے پیش کیا۔ سریتا نے ایک سگریٹ نکالتے ہوئے سگریٹ کیس کے اندرونی پلیٹ پر ایک عورت کی ایسی ہیجانی تصویر دیکھی کہ اس کے رخساروں پر رنگ آ گیا۔ اور جاڑے کی رات میں بھی اس کی پیشانی نم ہو گئی۔

"آپ کی نئی کار ڈوج ہے نا؟" اس نے سگریٹ سلگاتے ہوئے اور دھوئیں کی تلخی سے ایک آنکھ بھینچتے ہوئے کپتان زیدی کی سنہری مونچھوں کی باریکی پر حیران نگاہیں دوڑائیں۔
"تم غضب کرتی ہو میں نے تو......" ٹھیک اسی وقت رانا صاحب کو ایک زوردار چھینک آئی۔ اور محفل میں جو مختلف ٹولیاں بن گئی تھیں' اپنے خول سے باہر نکل آئیں اور سب نے بڑھ کر ان کی چھینک کی داد دی۔

ایک دو بار بیرے آئے اور "اور کچھ چاہئے حضور" کی رٹ لگا کر جس پردے کے پیچھے سے طلوع ہوئے تھے' اسی کے پیچھے غروب ہو گئے۔

"نجمی کل کلاس آؤ گی؟"
"شاید...... شاید آؤں گی...... کچھ کہہ نہیں سکتی"۔ پروفیسر قدوس نجمی سے بہت قریب ہو گیا تھا۔ اور اس کے دل میں اترنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسے موقعے پر اس کا چہرہ کلاسیکل احمقوں کا سا ہو جاتا تھا۔ اور اس کے ہونٹوں پر جو ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے کی حد تک پتلے تھے' خزاں کی خشکی چھانے لگتی تھی۔ یہ خزاں ایسے وقت اس کے ہونٹوں پر' اس کی آنکھوں میں

اور اس کی باتوں میں ہوتی۔ جتنی یہ خزاں تیز ہوتی اس کی آنکھوں میں جرم کی لو تیز ہوتی جاتی۔ وہ بڑی مشکل سے اپنے خون کی آگ پر پانی ڈال پاتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی گندمی اور مریضانہ رنگت میں وہی جلن پیدا ہو گئی تھی۔

کپتان زیدی نے جماہی لی۔ اور ان کے ساتھ سریتا بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اپنا سبز مخملیں کوٹ پہنا اور اپنی ایک جھلک بائیں بازو کے قد آدم آئینے میں دیکھی۔ کپتان زیدی اپنی توند پر پل اور کو کھینچ کر برابر کر رہا تھا۔ اور سریتا کے پاس کھڑا وہ کتنا ٹھگنا سا لگ رہا تھا۔ اس کے نقوش کتنے بھدے تھے۔ اور وہ کتنا کند ذہن...... لیکن خیر اس کی احمقانہ باتیں' ٹھنڈی سانس اور عشقیہ شعر (وہ بھی غلط سلط) سننے میں بڑا مزا آئے گا۔ سریتا پہلے نکلی اور اس کے پیچھے...... آئے۔ میڈ ڈرائیور نجیب اس خیال سے لڑکھڑا گیا۔

کپتان زیدی کے جانے کے بعد اور لوگ بھی چلے گئے۔ صرف رانا صاحب اور پروفیسر قدوس بیٹھے سگریٹ کے کش اڑا رہے تھے۔ اور نجمی تقریباً اونگھ رہی تھی۔

"نجمی تمہیں ابھی سے نیند آنے لگی؟"

"ہاں بھئی چلنا چاہئے۔"

لیکن دونوں اسی طرح جمے رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد نجمی نے آنکھیں بند کر لیں۔ رانا صاحب کو ہی غیرت نے مجبور کیا اور دل میں پروفیسر قدوس کو کوستے ہوئے اٹھے "یہ کمبخت گوند کی طرح چپک جاتا ہے......" سریتا بے وقوف بھی خواہ مخواہ کپتان زیدی کے ساتھ چل دی۔

"پچھلے سال اُس نے اپنا چسٹر اٹھایا' اچھا بھئی نجمی میں چل دیا۔ تو کل آنا چاہئے پر......"
"نہیں بھئی کل نہیں پھر کبھی"۔ اس نے اپنی آنکھیں ذرا سی کھولیں اور مسکرائیں۔
"پھر کبھی تو اچھا پھر کبھی"۔
پردہ اٹھا اور وہ بھی غائب۔
کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ کلاک کی آواز کمرے کا دل بنی ہوئی تھی۔

"ارے اب تو ساڑھے گیارہ بج گئے"۔ نجمی نے آنکھیں پھیلاتے ہوئے کہا۔

"کیوں نجمی آج تم اتنی اداس کیوں رہیں۔ تم اتنی کھوئی کھوئی کیوں رہتی ہو؟ مجھ سے کہو میں تمہارا بے لوث دوست ہوں۔ استاد ہوں۔ میں تمہارے لئے سب کچھ کروں گا۔" اور اس نے نجمی کا ہاتھ اپنے لمبے بے ڈھنگے ہاتھوں میں لے لیا۔

نجمی پر گویا بے ہوشی طاری تھی۔ اس کی پلکوں پر آنسو چمک رہے تھے۔ اور ہونٹوں کے کونے تھرتھرا رہے تھے۔ پروفیسر قدوس کی ٹائی پھانسی کے پھندے کی طرح کسی ہوئی معلوم ہوئی۔ گلا سوکھ گیا۔ اور دل الٹنے لگا۔

"آخر تم بولتیں کیوں نہیں۔ تم رو کیوں رہی ہو؟ میں تمہارا استاد ہوں اور استاد سے زیادہ تمہارا دوست۔ بے غرض۔ بے لوث' صرف دوست"۔

وہ آہستہ آہستہ اس کے ہاتھ سہلانے لگا' جس کے ناخنوں کی سرخی لو دے رہی تھی۔

نجمی کی رگوں میں جیسے بجلی دوڑ گئی ہو۔ سگار' سگریٹ' کافی اور قسم قسم کے سنٹ کی خوشبو ایک بار پھر اس پر حملہ آور ہوئی۔ اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اور آنکھوں میں انتہائی حیرت' برہمی اور طنز بھر کر پروفیسر قدوس کو گھورنے لگی۔ وہ پھر مسکرایا...... ایک بار پھر حسب عادت نجمی کے ہاتھ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ "قدوس صاحب آپ کی دوستی تو بے لوث ہے نا؟"

"بھئی یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے"؟ وہ ایک بار پھر نجمی پر جھک گیا۔
"روز آپ یونیورسٹی کی کتنی لڑکیوں سے یہی بات کہتے ہیں۔"

وہ ہکلانے لگا۔ اسے بجلی لگ گئی تھی۔ نجمی...... نجمی...... ن ن۔ اچھا تو میں چلا۔ لیکن تم نہیں جانتیں تمہارے لئے میرے جذبات کیا ہیں۔ میں سمجھتا تھا تم جانتی ہو۔ اچھا...... "آخر تم کسی نہ کسی بے وقوف کا انتخاب کرو گی......"

"لیکن وہ بے وقوف آپ نہیں ہوں گے۔" وہ کھڑی ہو گئی اور دروازے کی طرف انگلی اٹھا کر اس کو باہر نکلنے کا اشارہ کرنے لگی۔

جب وہ دروازہ سے باہر نکل رہا تھا تو نجمی کو ایسا لگا کہ پروفیسر قدوس کی ٹانگیں بھاپ بن کر اڑ گئی ہیں۔ اور اس کی پتلون چل رہی ہے۔

ہر طرف خاموشی برس رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر اسی طرح کھڑی رہی۔ اندر کے حصے سے بھی کوئی آواز نہیں آرہی تھی۔ کمرے کا پردہ آہستہ آہستہ ہل رہا تھا اور اجنتائی رقاصائیں اسی طرح ناچ رہی تھیں۔ وہ بڑا سا ہاتھی کارنس پر...... اور اس کے سفید دانت جو دو بانہوں کی طرح کوئی بوجھ اٹھانے کے لئے نیچے جھکے ہوئے تھے۔ کتابیں' کشمیر کے مناظر کے فریم۔ بنگالی مصوروں کی تصویریں' ریڈیو کی میز...... یہ ساری چیزیں اسے گھور رہی تھیں...... اس کے بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی۔

جب وہ اندر گئی اور آہستہ آہستہ اپنی ماں کے کمرے میں پہنچی تو وہ جائے نماز پر سجدہ میں پڑی تھیں۔ کونے کے کشمیری لیمپ سے مدھم مدھم روشنی نکل رہی تھی۔

نجمی نے اپنی ماں کا سر چھوا' ان کے سن سفید بال کتنے نرم تھے۔ وہ بھی وہیں پاس بیٹھ گئی۔

"بیٹی یہ کیا کرتی ہو۔ یہاں نہ بیٹھو' کتنی کڑاکے کی سردی ہے۔"

اماں کی آنکھوں سے جھر جھر آنسو گر رہے تھے۔ جو ان کی جھریوں پر سے تیرتے ہوئے ٹھڈی سے ٹپک رہے تھے۔

"گھبرایئے نہیں اماں۔"

"میری بیٹی...... مجھے کیوں بہلاتی ہے"۔ وہ پھر اپنی ناک صاف کر کے تسبیح کے دانے کھنکھٹانے لگیں۔ وہ کچھ پڑھتی جا رہی تھیں اور نجمی کے بھینچے ہوئے ہونٹوں کو دیکھتی جاتی تھیں۔

نجمی وہاں سے اٹھی اور اپنی بہن منیرہ کے کمرے میں دبے پاؤں گھسی۔ اس کی آہٹ پاتے ہی وہ چپکی سوتی سی بن گئی۔

"شریر!...... تو سو رہی ہے۔ تو پھر یہ روشنی کیوں ہو رہی ہے؟"

منیرہ نے منہ بنا کر کروٹ بدل لی۔ اس کی دونوں چوٹیاں اس کی گردن میں لپٹ گئی تھیں۔

"باجی مجھے تنگ نہ کرو۔"

"نہیں میں تنگ نہیں کروں گی۔ پر بتا آج باہر کیوں نہیں آئی تو۔ میری سالگرہ کی پارٹی میں؟"

"پارٹی میں جاتی میری بلا۔"

"کیوں بتا...... میری پیاری منیرہ......"

"وہاں میرا کون تھا۔ میں بیگانوں میں کیوں بیٹھ کر الو بنوں۔ ہونہہ۔ تم تو اپنے دوستوں کو بلاتی ہو۔"

"لیکن تیری سالگرہ پر بھی تو......"

ہونہہ "اس میں تمہارے پروفیسر قدوس دھنس مرے تھے' یاد ہے؟"

نجمی خاموش ہوگئی۔ منیرہ نے ساٹن کے لحاف میں اپنا منہ گھسالیا۔ اس کے سرہانے ایک کتاب رکھی تھی۔ "ٹرو رومانس"۔ اس نے دوسری طرف کونے میں دیکھا۔ کالی موٹی بلی پلیٹ سے دودھ پی چکی تھی۔ اور اب پلیٹ کو آہستہ آہستہ چاٹ رہی تھی۔ اسے لگا کہ پروفیسر قدوس بھی اسی طرح اس کے جسم کو چاٹ رہا ہے۔ اس کا خون سرد پڑ گیا۔ بڑی تھکی ہوئی سی اٹھی اور آہستہ آہستہ پچھلے حصے میں اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

اس نے تھوڑی دیر تک بٹن نہیں دبایا۔ اسے اپنے کمرے میں گھٹن محسوس ہوئی۔ اور اس نے کمرے کی کھڑکی کھول دی۔ باہر چاندنی درختوں مکانوں' پھولوں اور دور سڑک پر سوئی ہوئی تھی۔ اس نے دیکھا کہ خلاف معمول منصور کا کمرہ تاریک اور خاموش ہے۔ نہ وہ کھانس رہا ہے' نہ غالب کی غزل گا رہا ہے۔ نہ کوئی اخبار زور زور سے تقریر کے انداز میں پڑھ رہا ہے۔ دھوبی کی کوٹھری بھی خاموش تھی اور دوسری طرف بیرے کھاپی کر خاموش ہو چکے تھے۔

یہ منصور بھی عجیب آدمی ہے' اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلتا۔ آخر وہ اتنا اکڑا اکڑا کیوں رہتا ہے۔ آج وہ میری سالگرہ میں بھی شریک نہیں ہوا۔ اپنی شاگرد منیرہ کی طرح' صبح منیرہ کو پڑھاتا ہے اور پھر اسکول چلا جاتا ہے۔ رات کو آتا ہے۔ دھوبی سے' بیروں سے' ادھر ادھر کے لوگوں سے گپیں کرتا ہے' اخبار پڑھتا ہے' کچھ لکھتا ہے' غزلیں گاتا ہے یا پھر سو رہتا ہے۔ اسے تین مہینے سے منیرہ کو پڑھانے کی تنخواہ نہیں ملی تھی۔ لیکن اس نے کچھ کہا نہیں۔ کبھی میں ہی بات کرلوں تو چھوٹے منہ بات کرلیتا ہے ورنہ سمجھتا ہے جیسے میں کوئی ہوں ہی نہیں۔ جیسے میں اگزسٹ ہی نہیں کرتی۔ منیرہ کے دماغ میں عجیب عجیب اوٹ پٹانگ باتیں ٹھونستا رہتا ہے۔ ابھی اس دن کہنے لگی۔

"میک اپ تو وہ لوگ کرتے ہیں جن کو اپنے حسن پر بھروسہ نہیں ہوتا۔" یہ بات منیرہ کے دماغ میں آ ہی نہیں سکتی۔ ہو نہ ہو اسی منصور نے اس کے دل میں یہ بات بٹھائی ہے۔ وہ ہمیشہ اس کا مذاق اڑانا چاہتا ہے۔ بڑا افلاطون سمجھتا ہے خود کو۔ دنیا میں یہ ہو رہا ہے' دنیا میں یہ نہیں ہو رہا ہے' دنیا میں یہ ہونا چاہئے۔ گویا دنیا کا سارا کارخانہ آپ کے حکم سے چلنا چاہئے۔ پچھلے سال سالگرہ پر کیا سین کریئٹ کیا تھا اس آدمی نے۔ اچھی خاصی سالگرہ کی محفل جمی ہوئی تھی۔ رانا صاحب نے کہیں پوچھ لیا ماسٹر صاحب آپ کا تحفہ کہاں ہے"۔

"آپ بجائے خود ایک تحفہ ہیں" پروفیسر قدوس نے پھبتی کسی تھی "کیوں نجمی؟"...... وہ خاموشی سے اٹھا تھا۔ نظر بھر کر سب کو دیکھا تھا۔

"آپ کے ان تحفوں کے پیچھے جو جذبات کام کر رہے ہیں' ان سے میرا دل میری جیب کی طرح خالی ہے"...... اس نے کتنی نفرت اور حقارت سے یہ بات کہی تھی۔ معلوم ہوتا ہے منصور ابھی تک لوٹا نہیں ہے۔ آؤ ذرا دیکھیں اس کے کمرے میں......

وہ آہستہ آہستہ پچھلے زینے سے اتری اور منصور کے کمرے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ کوئی سانس لے رہا تھا۔ وہ دبے پاؤں پھر واپس چلی آئی۔ سانس کی خرخراہٹ سے اس کا دل ڈر گیا۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر اس نے بٹن دبایا۔ الماری کے قد آدم آئینے میں اس نے اپنے چہرے پر برستی ہوئی وحشت کا اندازہ لگایا۔ اس کے لپ اسٹک کا رنگ اوپر اور نیچے لبوں کی سرحد سے باہر پھیل رہا تھا۔ اور آنکھوں کا کاجل آنسوؤں سے ڈھل کر ناک کی دیوار تک چلا آیا تھا۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے۔ اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔

جب اس نے اپنے کپڑے اتارے تو اسے بڑی ٹھنڈ محسوس ہوئی۔ وہ جلدی سے شب خوابی کا لباس پہن کر اپنے لحاف میں گھس گئی۔ اس نے سونے کی بہت کوشش کی مگر آنکھیں بند ہی نہ ہوتی تھیں۔ آنکھیں بند کرتے ہی کمرے کا اندھیرا دور ہو جاتا تھا۔ اور اس کی ماں کی جھریاں آنسوؤں سے تر نظر آتیں۔ منیرہ کا روٹھا ہوا چہرہ ٹرو رومانس کے پاس' اور پلیٹ چاٹتی ہوئی بلی اور اس کے بدن کو چاٹتا ہوا پروفیسر قدوس۔ وہ اٹھ بیٹھتی۔ اور پھر لیٹ جاتی۔ تھوڑی دیر تک لیٹی رہتی اور پھر اٹھ بیٹھتی۔

منصور کی آنکھ کھلی تو وہ مارے سردی کے کانپ رہا تھا۔ اس کی گردن جل رہی تھی اور منھ میں کوئی تلخ اور جلی ہوئی چیز پگھل رہی تھی۔ وہ اٹھا اور اس نے ادھر ادھر ٹٹول کر ماچس کی ڈبیا ڈھونڈ نکالی۔ ماچس جلا کر اس نے نہ جانے کب کی جلی ہوئی موم بتی کا ایک ٹکڑا بھی تلاش کر لیا۔ موم بتی کی مریل سی روشنی میں اس کے کمرے کی ہر چیز اپنا سایہ معلوم ہوتی تھی۔ دھندلی دھندلی۔ اس کا کھانا کوئی رکھ گیا تھا۔ چھوٹی سی میز پر۔ جس کے نیچے اس کے ٹوٹے ہوئے جوتے منھ کھولے پڑے تھے۔ اس کا کھانا جم چکا تھا۔ اور سالن کے پیالے میں ڈالڈا کے جمے ہوئے ٹکڑے برف کے تودوں کی مانند ایک ہی جھٹکے میں تیرنے لگے...... بحیرۂ منجمد قطب شمالی...... واہ!

"کھانا کھالوں؟" بخار لگ رہا ہے۔ سینے میں درد بھی ہے، لیکن بھوک بھی تو لگ رہی ہے۔ صبح ناشتے کے بعد شام کے ٹیوشن پر صرف ایک پیالی چائے ملی وہ بھی دھوئیں میں پکی ہوئی ٹھنڈی چائے۔" اس نے روٹی توڑی اور جمے ہوئے سالن کے ساتھ ایک لقمہ منھ میں رکھا، لیکن کھانا اسے اتنا بدمزہ معلوم ہوا کہ اس کا جی چاہا سب کچھ تھوک دے۔ لیکن اس سے پہلے ہی لقمہ اس کے پیٹ میں پہنچ چکا تھا۔

لحاف میں لیٹ کر اس نے وقت کا اندازہ لگانا چاہا۔ موم بتی تیزی سے پگھلتی جا رہی تھی۔ اس نے پھونک مار کر موم بتی کو بجھا دیا۔ دروازے سے تیز ہوا آ رہی تھی۔ اور کوٹھی کا وہ حصہ جہاں پر نجمی کا کمرہ تھا چاندنی میں اونگھتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

صبح اس کی آنکھ کھلی تو اس کے سینے کا درد کم محسوس ہوا۔

وہ سویرے سویرے اوپر پہنچ گیا۔ زینے پر کا جگر سویا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر اس نے بھی ایک جماہی لی اور پھر دراز ہو گیا۔ واقعی بڑی ٹھنڈ تھی۔ وہ جا کر مطالعہ کے کمرے میں بیٹھ گیا۔ گلدان میں باسی پھول سر جھکائے ہوئے تھے اور ٹیگور کی اداس آنکھیں ان پھولوں پر ترس کھا رہی تھیں۔

صبح کا اخبار الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد جب منیرہ کے آنے میں خلاف معمول دیر ہوئی تو اس نے دروازے پر دستک دی۔ بڑی بی آگئیں۔ ان کی آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔ اور ان

کے ہونٹوں پر پان پیک خشک ہو رہی تھی۔ بولیں...... "ذرا ٹھہریئے ماسٹر صاحب! منیرہ بی تیار ہو رہی ہیں۔"

منصور کرسی پر بیٹھ گیا۔ بڑی سی کھڑکی پر رات بھر کی اوس جمی ہوئی تھی۔ اور آگے ساری عمارتیں اور درخت کہرے میں چھپے ہوئے بہت دھندلے نظر آ رہے تھے۔

کتنی دھند ہے، کتنی ٹھنڈک ...... کیا میں اس دھند اور ٹھنڈک میں لپٹا کراہتا رہوں گا۔

منیرہ آ گئی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں اور پپوٹے سوج رہے تھے۔

"کیا تم رات بھر سوئی نہیں؟"

"ماسٹر صاحب آج پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔"

وہ اٹھی اور فوراً چل دی۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ وہ واپس جا رہا تھا کہ نجمی اپنے ڈریسنگ گاؤن میں ہی وہاں پہنچ گئی۔ اس نے دس دس کے نو نوٹ اس کے ہاتھ میں دیئے...... معاف کیجئے گا...... تین مہینے کی تاخیر ہو گئی۔ کہئے آپ کی اماں کا فالج کیسا ہے؟

"ادھر کوئی خط نہیں آیا۔ اچھی ہی ہوں گی۔"

وہ لوٹ گئی۔

وہ سوچنے لگا آخر بات کیا ہے، نجمی اتنی اداس کیوں ہے۔ اس کے چہرہ پر کسی قسم کا میک اپ نہیں تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے اور اس کی انگوٹھیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ اور اس کی آنکھوں سے بھی معلوم ہوتا تھا کہ سوئی نہیں ہے رات بھر۔

جب اسکول جانے کے لئے وہ سائیکل پر بیٹھ رہا تھا تو اس نے پیچھے میں نجمی کو کھڑے ہو کر تمام ملازمین کو ہدایات دیتے ہوئے دیکھا۔

وہ سب اس طرح کھڑے تھے جیسے عدالت میں کھڑے اپنے کسی مقدمے کا فیصلہ سن رہے ہوں۔ کالا پانی، عمر قید......

"یہ لڑکی نجمی! کبھی رنگ و نور کا طوفان بن جاتی اور کبھی ٹنڈ منڈ پیڑ۔"

وہ ایک زمانے سے اسی گھر میں تھا۔ وہ منیرہ کو پڑھاتا تھا۔ وہ جس اسکول میں ملازم تھا' وہاں سے کبھی تنخواہ ملتی بھی نہیں۔ کبھی کبھی تو اسے چھ چھ مہینے کے بعد قطرہ قطرہ کر کے تنخواہ وصول ہوتی تھی۔ وہ ایک اور ٹیوشن کرتا تھا۔ اور جو کچھ پیسے مہینے میں مل جاتے تھے۔ اس میں سے بڑا حصہ وہ گھر اپنی ماں کو بھیج دیتا تھا۔ اسکول کے ساتھ روپوں کا کوئی بھروسہ ہی نہیں تھا۔ اس وقت نوے روپے اس کی جیب میں تھے اور وہ اسکول جانے سے پہلے ڈاک خانے جا کر اپنی ماں کو منی آرڈر بھیجنا چاہتا تھا...... راستے میں بار بار اسے نجمی کا خیال آیا۔

کبھی تو وہ اتنی مغرور ہو جاتی کہ اس کے سلام کا کوئی نوٹس نہ لیتی اور جب جواباً وہ اسے سلام کرتا اور اس کا نوٹس لینا چھوڑ دیتا تو ایک دن اچانک اسے آ پکڑتی...... "ماسٹر صاحب! آپ تو بالکل اجنبی کی طرح آتے ہیں اور گذر جاتے ہیں۔ آیئے کیرم کھیلیں۔ کیرم نہیں تو شطرنج کی ایک بازی ہو جائے۔"

وہ دوسروں پر بہت بھروسہ کرتی تھی۔ اپنے دوستوں پر۔ اپنے ملنے جلنے والوں پر۔ اب یہ عجیب الطرفین صاحب...... اس کے گھر کے ہر کام میں مداخلت ضرور کرتے تھے۔ بزرگ بنتے تھے اور اپنی بزرگی کا اظہار نجمی کے گالوں کو چھو کر اور بات کرتے ہوئے اس کے کندھوں پر اپنا سارا بوجھ ڈال کر کرتے تھے۔ جیسے ان کے دونوں پاؤں کٹے ہوئے ہوں اور نجمی ان کی بیساکھی ہو۔

وہ جانتا تھا کہ بیرسٹر صاحب کی موت کے بعد گھر کا سارا دھندا زیورات کے بل بوتے پر اور اس کے بعد باغ بیچ کر اور آخر میں اس کوٹھی کو رہن رکھ کر چلتا رہا تھا۔ یونیورسٹی میں نجمی پروفیسر قدوس کی دوستی کی بدولت ہر طرح کے اسکنڈل کا شکار تھی۔ لیکن وہ ان باتوں کو نفرت اور غصے سے ٹال دیتی تھی۔ وہ جانتی تھی۔ پروفیسر قدوس اس کا مخلص دوست ہے۔ منصور یہ ساری باتیں جانتا تھا اور خاموش تماشائی کی طرح اپنا کام کرتا رہتا تھا۔ لیکن کبھی کبھی وہ اسے حد درجہ اداس دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا۔ اس دن وہ میک اپ نہ کرتی۔ اپنے یہاں آنے والوں سے ملنے سے انکار کر دیتی۔ یہاں تک کہ ایسے وقت پروفیسر قدوس بھی اپنی معشوقانہ شہادت کا پوز بناتے ہوئے واپس ہو جاتے۔

لیکن رات کی چہل پہل اور رنگا رنگی کے بعد صبح منصور نے جو کچھ دیکھا تھا وہ کچھ عجیب

معلوم ہوتا تھا۔ اس نے نجمی کو اتنا غم زدہ کبھی نہیں دیکھا تھا۔

شام کو جب منصور اپنی پنکچر سائیکل کو گھسیٹا ہوا اسکول سے واپس آرہا تھا تو اس کے دماغ میں صرف ایک خیال تھا۔

ہیڈ ماسٹر نے اس سے کہا تھا "ڈاکٹر کی رپورٹ کے بعد ضروری ہو گیا ہے کہ آپ اپنے علاج کے لئے ایک لمبی چھٹی لے لیجئے۔ لڑکوں کے لئے آپ کی موجودگی خطرناک ہے۔ خدا کے لئے اب سائیکل پر چڑھنا چھوڑ دیجئے۔"

"سائیکل چڑھنا چھوڑ دیجئے۔ میرے پاس بھی کوئی کار ہے کیا؟"

اس کے جسم پر پسینہ تیرنے لگ گیا تھا۔ اور اس دن پان کی دکان پر جب وہ سگریٹ خرید رہا تھا تو اس کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد نظر آیا تھا۔

کبھی کبھی کوئی اولہ اس کی سائیکل کی گھنٹی پر گرتا اور اس کی ٹکر سے ہلکی سی آواز پیدا ہوتی۔ جیسے خالی گلاس میں چمچہ ٹکرا رہا ہو۔ اس کا گرم کوٹ بھیگ گیا تھا۔ بال بھیگ کر آگے لٹک آئے تھے۔ اور اس کے کابلی سینڈل سے چھینٹیں اڑاڑ کر اس کی پتلون پر گل بوٹے بنا رہی تھیں۔

جب وہ گیٹ کے قریب پہنچا تو وہ ہانپ رہا تھا۔ اور اس کا چہرہ اتنا زرد معلوم ہو رہا تھا جیسے اس کے منھ پر ابٹن مل دیا گیا ہو۔ پھاٹک کھلا ہوا تھا۔ اور ایک بڑا سا ٹھیلا الماریوں، کرسیوں اور مختلف قسم کے سامان سے بھرا ہوا باہر نکل رہا تھا۔ وہ ٹھٹھرتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا۔ اس کے میلے گندے تکیئے پر ایک لفافہ تھا۔ لفافے کے اوپر ہی لکھا تھا۔

"ماسٹر صاحب اپنی پہلی فرصت میں مجھ سے مل جایئے۔"

آخر کیا بات ہے۔ نجمی مجھے کیوں بلا رہی ہے۔ ایک زمانے سے وہ ان لوگوں کے ساتھ رہتا آرہا تھا۔ لیکن کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ کبھی کوئی کام ہوا بھی تو ملازم سے بلوا لیا۔ ایک بار منصور کو یہ بات بری بھی معلوم ہوئی تھی اور اس نے اچھی خاصی جھاڑ بتا دی تھی۔

"نجمی صاحبہ! آخر آپ میرے جیسے لوگوں کو سمجھتی کیا ہیں۔ اب اس وقت میں صرف اس لئے شہر جاؤں کہ ممکن ہے کہ صبح تک بلاؤز کا وہ ٹکڑا بک جائے جو آپ کو دکان میں پسند نہ آیا۔ لیکن

جب آپ گھر پہنچیں تو۔۔۔۔ یہ بھی کوئی تک ہے؟ معاف کیجئے گا۔۔۔۔ میں اس وقت اپنا کام کر رہا ہوں۔"

وہ آنکھیں کھولے ہوئے اس کو دیکھتی رہ گئی تھی۔ اس کی انگلی لب پر چپک گئی تھی۔ اور بغیر کچھ کہے وہ گھر کے اندر چلی گئی تھی۔ وہ دن اور آج کا دن' اس نے کبھی کسی کام کے لئے اس سے نہیں کہا تھا۔ ایک بار وہ بیمار بھی پڑی اور اچھی بھی ہوئی' لیکن اس سے ایک بار کسی کام کے لئے نہیں کہا گیا۔ لیکن اس وقت بات دوسری تھی۔ پروفیسر قدوس اپنا دل ہتھیلی پر لئے ہر وقت کھڑا رہتا تھا۔

بارش تیز ہوگئی تھی اور اولوں کی پڑ پڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ اس نے زور سے سانس لے کر باہر کی طرف دیکھا' پھواروں کی چادر سے پرے نجمی کے کمرے کی کھڑکی کا قد آدم شیشہ جھلملا رہا تھا۔ شیشے پر ایک لڑکی کا سیاہ سایہ ابھرتا اور تیرتا ہوا نکل جاتا۔ زلفیں اڑی ہوئی اور منہ سے دھواں نکلتا ہوا۔۔۔۔ نجمی ٹہل رہی ہے۔ میں مل ہی آؤں۔ دیکھوں کیا گل کھلے ہیں؟

پانی میں قدموں کی چاپ سنائی دی۔

بوڑھا رمضان اندر آیا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا۔ کیوں ماسٹر صاحب! اندھیرے میں کیوں بیٹھے ہو؟"

منصور نے کل کی بچی ہوئی موم بتی جلائی اور کپکپاتے ہوئے ہونٹوں کے ساتھ رمضان کو دیکھنے لگا۔ اس کی وحشت زدہ سہمی ہوئی آنکھوں سے ظاہر تھا کہ وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ "کیا بات ہے رمضان۔ کوئی نئی بات؟"

"بہت بڑی بات ہے ماسٹر صاحب۔ دیکھتے دیکھتے پل بھر میں سب کچھ کیا سے کیا ہو گیا۔"

"کیا ہوا بتاتے کیوں نہیں؟"

"سب لوگ اس کوٹھی سے اٹھ رہے ہیں۔ کہتے ہیں یہ کوٹھی بک گئی ہے۔"

"اچھا" اس نے بغیر کسی حیرانی کے کہا۔

"سب نوکروں کی چھٹی ہوگئی ہے۔ میز' کرسی' برتن اور گملے وغیرہ بھی یہاں سے ڈھل گئے۔"

"بس؟"

رمضانی نے دو تین مرتبہ غور سے منصور کو دیکھا جو تولیہ سے اپنا سر پونچھ رہا تھا۔ اس کے دانت بج رہے تھے۔ اور آنکھیں کافی بڑی بڑی نکل آئی تھیں۔
رمضانی چائے کے لئے دوبارہ چلا اور غم زدہ آواز میں بولا۔

"ماسٹر صاحب! جاڑا غضب کا ہے۔ آپ لحاف اوڑھ کر فوراً سو جائیے۔ میں آپ کے لئے گرم چائے لے آؤں گا۔ کون جانے کل مجھے بھی چھٹی مل جائے"۔ وہ چلا گیا۔

منصور نے کپڑے تلاش کئے۔ لیکن اس کے پاس ایک جوڑا بھی دھلا ہوا نہ نکلا۔ اس نے چارپائی کے نیچے سے اپنا پاجامہ نکالا۔ ایک پرانی قمیض جسے پچھلے ہفتے سے برابر وہ سوتے وقت پہن لیتا تھا۔ جلدی جلدی گردن میں ڈالی۔ اور اپنا خاندانی شال اوڑھ کر پچھلے زینے سے اوپر چڑھ گیا۔

اس نے دستک دی۔ بارش کی سنسناہٹ میں دستک کی آواز اولوں کی پڑپڑ میں تبدیل ہو گئی۔

"آجایئے ماسٹر صاحب۔"

نجمی اسی ڈریسنگ گاؤن میں کھڑی تھی۔ اس کے بال کچھ اور الجھ گئے تھے۔ آنکھوں سے کاجل بالکل دھل گیا تھا۔ ہونٹ لپ اسٹک کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ اس وقت اپنی سادگی کی وجہ سے زرد اور بہت نازک لگ رہے تھے۔ وہ کتابوں' بوتلوں' جوتوں' کپڑوں' تصویروں اور دو تین مجسموں کے درمیان کھڑی تھی۔ اس نے منصور کو دیکھے بغیر کہا۔

"یہاں بیٹھ جایئے۔"

اس نے سگریٹ کی ڈبیا اٹھائی۔ "سگریٹ پیجئے۔" اس کی باتیں جتنی مشینی' تیز اور چست تھیں' اس کی آواز میں اتنی ہی تھکن اور بے اعتمادی بھری ہوئی تھی۔

"کہئے اس تماشے کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟"
"کس تماشے کے متعلق؟" پتہ نہیں کیوں منصور کو محسوس ہوا کہ کوئی اس کا گلا دبا رہا ہے۔
"یہی"۔

"یہی۔۔۔۔ لیکن میں سمجھا نہیں کچھ۔"

"آپ سب کچھ جانتے ہیں۔" وہ بڑے اطمینان سے اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔ "خیر چھوڑیئے۔۔۔۔ کل سے یہ کوٹھی ہماری نہیں ہوگی' یوں تو اس وقت بھی یہ کوٹھی ہماری نہیں' کسی اور کی ہو چکی ہے۔ یہاں سے بہت دور پرانے شہر میں ایک بہت گندہ مکان ہے اپنا۔ کل سے ہم وہاں ہوں گے۔ کتنی رونق ہو جائے گی۔" وہ مسکرانے کے لئے رکی۔ اس نے اپنی انگوٹھی کو دو تین بار اپنی انگلی میں گھمایا جس کے سرخ پتھر سے شعاع نکل رہی تھی۔ اس وقت منصور نے دیکھا کہ وہ بے خیالی میں اپنے ناخن پر جمے ہوئے کیوٹکس کو کھرچ رہی ہے۔ تیز تیز۔ جیسے گنجا کتا اپنے سر کو نوچتا ہے۔

"ایک بات پوچھوں آپ سے؟"

منصور نے صرف اپنا سر اٹھا دیا۔ اس کی آنکھیں کہہ رہی تھیں "کہیے"۔ نجمی نے اس کو اتنے غور سے دیکھا کہ اس کے پورے جسم پر برف کی طرح سرد لہر سی دوڑتی چلی گئی۔ وہ لرز اٹھا۔ حالانکہ یہ ٹھنڈک اس کے نم بنیان کی تھی جو وہ بدل نہ سکا تھا اور اس وقت پھر اس کے سینے میں درد کی کسک جاگنے لگی تھی۔

"آپ ٹھیک بتایئے' مجھے آپ کیا سمجھتے ہیں؟" نجمی نے ڈھیرے سے ایک بڑا سا فریم اٹھا لیا۔ یہ مریم کی تصویر تھی۔ مقدس پاک اور مامتا سے سرشار!

منصور تصویر کا پچھلا حصہ دیکھتا رہا اور چپ سادھے سوال کو سمجھنے کی کوشش کرتا رہا۔

"آپ کی کیا رائے ہے میرے متعلق؟" اس نے اسی طرح تصویر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے تیزی سے پوچھا۔ اس کی آواز میں زیادہ کپکپاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔

"میں سمجھا نہیں آپ کا مطلب۔"

نجمی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ آنکھیں چھوٹی ہو گئیں اور ہونٹ کانپنے لگے۔ "آپ نہیں سمجھے میرا مطلب۔۔۔۔ میں جانتی ہوں۔ آپ مجھے ایک بے ہودہ اور فضول لڑکی سمجھتے ہیں۔"

منصور نے کچھ کہنا چاہا' لیکن اب کے پھر کسی طاقت نے بڑھ کر اس کا گلا دبا دیا۔

اس نے ایک دوسری سگریٹ سلگائی۔

"میں آپ کی ہم خیال ہوں۔ میں وہی ہوں جو آپ سمجھتے ہیں۔"

"میں آپ کو بے ہودہ اور فضول لڑکی نہیں سمجھتا۔" اور خود اسے لگا کہ یہ آواز بہت دور سے آرہی ہے۔ اجنبی سی دبی دبی آواز جیسے کوئی چٹانوں کے نیچے دبے ہوئے کنوئیں کے اندر بول رہا ہو۔

"میں اپنے جاننے والوں میں صرف آپ کو ایک طاقتور اور ایمان دار آدمی سمجھتی تھی۔"

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور کمرے میں ٹہلنے لگی۔

"نجمی صاحبہ! میں طاقتور اور ایمان دار آدمی ہوں یا نہیں، لیکن آپ ایک کمزور اور بے وقوف لڑکی ضرور ہیں۔"۔۔۔۔یہ آواز اس کے ہونٹوں تک نہ آسکی۔

کیا میں اس مرتی ہوئی گھٹتی ہوئی لڑکی پر حملہ کر دوں؟ میں ہمیشہ اس لڑکی سے بیزار رہا ہوں اور اس وقت اس پر کتنا رحم آرہا ہے۔

نجمی اس کے سامنے آکر رک گئی۔

"اچھا بتائیے میرے ملنے جلنے والوں سے آپ کو نفرت کیوں ہے؟"

"نجمی صاحبہ! آپ کی طبیعت کافی خراب ہے۔ ان سوالوں سے کیا فائدہ؟"

"آپ جانتے ہیں اس کوٹھی کے ساتھ میرے ان دوستوں کی زنجیر بھی ٹوٹ جائے گی۔"

"کتنی جذباتی ہے یہ لڑکی" منصور نے پہلی بار مسکرا کر سوچا اور اٹھتے ہوئے بولا "آپ کے وہ دوست اب بھی آپ کے اس گھر میں آئیں گے اور کوئی آئے نہ آئے پروفیسر قدوس اور نجیب الطرفین ضرور آئیں گے۔ دونوں کو آپ کی ضرورت ہے۔"

"بکواس"۔

منصور نے تھوڑی دیر انتظار کیا۔ "تو میں اب جاؤں؟"

"منصور صاحب! کیا آپ ہمارا ساتھ چھوڑ دیں گے؟"

"آپ کا مطلب؟"

"انسان اپنی پرانی دنیا سے محبت کرتا ہے۔ آپ جانتے ہیں۔ میں چھوٹی سی تھی۔ یہیں اس کمرے میں ایک کھلونے کے پیچھے بھاگتی بھاگتی ٹھوکر کھا کر گر پڑی۔ بابا نے دوڑ کر مجھے اپنی گود میں اٹھالیا۔ اور اتنا پیار کیا۔۔۔۔ اتنا پیار کیا۔۔۔۔ اتنا پیار کیا۔۔۔۔"

پھر وہ چپ ہوگئی۔

"تو میں جاؤں؟"

"آپ ہمارے ساتھ چلیں گے نا؟"

وہ مسکرایا۔ نجمی کے بال اس کے شانوں پر جھک آئے تھے۔ اور اس کی آنکھیں منصور پر جمی ہوئی تھیں اور وہ کیونکس کا رنگ اپنے ناخن سے کھرچے جا رہی تھی۔ اس نے ایک بار نجمی اور کمرے کا جائزہ لیا اور خاموشی سے اپنا شال سمیٹتا ہوا پچھلے زینے سے نیچے اتر آیا۔

موم بتی کی لو شرابی کی طرح جھوم رہی تھی۔

اس نے اپنے بکھرے ہوئے کاغذات اکٹھے کئے اور ان کو ٹن کے بکس میں رکھنا شروع کیا۔ نجمی۔۔۔۔ واقعی رات کے اندھیرے میں پوری زندگی کاٹنے کے بعد اجالے سے کتنا ڈر لگتا ہے۔ اس نے اپنی دوا کی شیشی اٹھائی اور کونے میں پھینک دی۔

صبح سات بجے گاڑی چل دیتی ہے۔ اماں کی آنکھوں میں کتنی چمک پیدا ہو جائے گی۔۔۔۔ اگر انہیں فالج نہ ہوتا تو پتہ نہیں وہ کس طرح مجھے اپنے بازوؤں میں سمیٹ لیتیں۔۔۔۔ اف کتنی ٹھنڈ ہے۔۔۔۔

جب موم بتی بجھ گئی تو وہ اپنے لحاف میں گھس گیا۔ نجمی کا سایہ کھڑکی کے شیشے پر ابھرتا تھا۔ اور غائب ہو جاتا تھا۔۔۔۔ "بے وقوف لڑکی تنکے نے آج تک کسے کنارے تک پہنچایا ہے۔" اس کی آنکھیں بند ہو گئیں اور کھانسی تیز ہوگئی۔ باہر بارش اور اولوں کا شور بڑھ رہا تھا۔ جیسے ہزاروں دروازوں کی زنجیریں ایک ساتھ بج رہی ہوں۔

○

ہانپتے کانپتے لوگ

اس گلی میں شام ہونے سے دو ڈھائی گھنٹے پہلے ہی شام کی گھٹن بڑھنے لگتی تھی۔ خاص طور سے گرمیوں میں۔ گلی کے پیٹ میں سیکڑوں چولہوں کا دھواں آہستہ آہستہ تیر رہا تھا۔ دودھ اور ربڑی کی مشہور دہلی والی دکان میں تیز بلب چمک رہا تھا اور بھنگے مکڑی کے جالے کے پاس چکر لگانے کے بعد دہی اور دودھ پر ہوائیاں بن کر گر رہے تھے۔ بوڑھی کباب فروش عورت کے لکڑی کے جلتے کوئلوں سے چنگاریاں اڑ اڑ کر بڑھتے اور رینگتے ہوئے اندھیرے میں جگنوؤں کی طرح چمکنے لگی تھیں۔ جتنی تیزی سے وہ پنکھا ہلاتی تھی' اتنا ہی زیادہ جگنو اڑتے تھے۔ وہ مسجد کے بوسیدہ میناروں کو دیکھ رہی تھی' جہاں نماز مغرب ختم ہو رہی تھی اور بچوں کا شور طوفان میل کی طرح بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک ٹپک کر اس کے میلے چکیلے دوپٹے میں جذب ہو رہے تھے۔

ہر وقت اس گلی سے بیسیوں مرد عورتیں گزرتے رہتے تھے۔ اس وقت بھی راہ گیروں کی ریل پیل تھی۔ اچانک ایک برقعہ پوش عورت کے چیخنے اور گرجنے کی آواز نے کوہان سی اٹھتی ہوئی گلی کے تمام لوگوں کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ سب نے اپنے اپنے ڈربے سے مرغیوں کی طرح گردن نکال کر دیکھا۔

برقعہ پوش عورت کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کا مرد تھا۔ اس نے اپنی آستین چڑھا لیں۔ فرہاد بھی تن کر اپنی دکان سے گلی میں آ گیا۔ "مارے جوتوں کے حلیہ ٹائٹ کر دوں گا۔ میں کیوں چھیڑتا اس ادھیڑ عورت کو۔ قسم خدا کی۔۔۔۔ ذرا دیکھنا اس سور کے بچے کو' یارو ذرا دیکھنا۔۔۔۔ میں چھیڑوں گا اس عورت۔۔۔۔ افوہ بڑی آئیں کہیں کی ملکہ نور جہاں۔۔۔۔ قسم خدا کی۔"

فرہاد کو لوگوں نے پکڑنے دھکڑنے کی کوشش کی لیکن اس نے دو تین ہاتھ کرارے جڑ دیئے بے چارے کے' اور عورت گالیاں بکتی' روتی' منہ بسورتی' اپنا برقعہ سنبھالتی بھیڑ میں غائب ہوگئی۔ مرد بھی اپنے بچے کو گود میں اٹھا کر اپنے پھٹے پاجامے کو اوپر گھسیٹتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

فرہاد اچھل کر اپنی دکان میں گھس گیا اور چائے پیالیوں میں انڈیل کر اپنے حیران گاہکوں کو بڑھانے لگا۔

سکندر خاموشی سے چائے پی رہا تھا۔ اس کے میلے چکٹ بال خودرو جنگلی گھاس کی طرح موٹے اور میلے نظر آرہے ہیں۔ وہ تازہ بہ تازہ پولس والوں کے ڈنڈے کھا کر آرہا تھا۔ اس کی رکشا بھی ٹوٹ گئی تھی موٹر سے ٹکرا کر اور اوپر سے پولس والوں نے اس کی خاطر تواضع بھی کر دی تھی۔ اس نے جھنجھلاتی ہوئی نظروں سے فرہاد کو دیکھا جو اب اپنی داڑھی میں انگلیوں سے کنگھی کرتے ہوئے بڑے مزے میں بیڑی کے کش اڑا رہا تھا اور زیر لب مسکرا رہا تھا۔

"قسم خدا کی کیا توپ عورت تھی۔"

"اور تم بھی کیا توپ خانہ مرد ہو۔"

فرہاد نے بیڑی گلی میں پھینک دی "سکندر بیٹا حساب کا کیا ہوگا۔ بتا جیب میں کتنا مال ہے۔" اس کی آواز میں انتہائی قہر پیدا ہو گیا تھا۔

سکندر خاموش اپنی گاڑھی چائے پینے میں مست ہو گیا۔ دوسرے گاہکوں نے قہقہہ لگایا۔ "جاؤ مٹی کے شیر' باندھو بلی کے گلے میں گھنٹی۔"

فرہاد فوراً گر جا۔ "یارو چائے پیو۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔ دوسرے کے گلے کا ہار اتار کر اپنے گلے میں ڈالنے کا کیا فائدہ!"

سب نے کھسیانی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور اپنی اپنی پیالیوں پر جھک گئے' صرف سکندر اپنی زہر آلود اور بپھری نگاہیں اس پر گاڑے رہا۔ فرہاد گلی کے اندھیرے میں گھور رہا تھا' لیکن یکایک اس نے پلٹ کر دیکھا جیسے سکندر کے زہر میں بجھے ہوئے تیر اس کی پیٹھ کو چیر کر اس کے سینے سے باہر نکل گئے ہوں "میں تجھے کچا چبا جاؤں گا۔" سکندر نے آنکھوں ہی آنکھوں میں غرا کر کہا اور پھر گلی کے اندھیرے میں گھورنے لگا۔ چولھے پر چائے کی کیتلی بھاپ اگل

رہی تھی اور پکتے ہوئے کوئلے کی سرخ چمک فرہاد کے چہرے کو اور بھی ڈراؤنا اور اس کی آنکھوں کو اور بھی پیاسا بنا رہی تھی۔ فرہاد نے زور سے تھوکا اور گنگنانے لگا۔ دیکھنے والے صاف دیکھ سکتے تھے کہ وہ اپنے جبڑوں کو چبا رہا ہے۔

"زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی۔"

ایک نے چائے پیتے ہوئے اپنی گردن اٹھائی "بھیا کاہے کو غالب فلم کا خون کر رہا ہے۔" پھر اپنے ساتھی کو ٹھوکا دیتے ہوئے بولا۔ "ہاں دمڑی ذرا لہک کے گاؤ تو ستارے بھی ناچ اٹھیں۔"

"ہو ہو ہو' اپنی گلی میں ستارے کہاں! ہو ہو ہو!"

دمڑی آہستہ آہستہ اپنی گردن کھجا رہا تھا۔ اس نے عجیب طرح سے اپنا منہ بگاڑا جیسے دانت تلے نیم کے پتے پڑ گئے ہوں "بات یہ ہے رمضان استاد اپنا گلا خراب ہو رہا ہے۔" دو تین بار کھانسا۔ "چائے پیوں تو شاید بات بنے اور اپنی جھولی میں روٹی دال سے زیادہ کا مال نہیں۔" پھر نیچی نگاہوں سے فرہاد کی طرف دیکھتے ہوئے رازدارانہ انداز میں مگر اتنے زور سے کہ وہ سن لے' منہ پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"ادھار کی ہمت نہیں' فرہاد کاٹ کھائے گا...... جان ہے تو جہان ہے بھیا!"

"ابے بک بک بند کر۔ سیدھے منہ غالب فلم کا گانا سنا دے اور تجھ سے تقاضا کس نے کیا ہے بے؟ تر تر کیے جا رہا ہے...... یتیم کہیں کا۔"

یتیم کہیں کا بھی گالی کی ایک قسم تھی جو وہ انتہائی اضطراب کے عالم میں اپنے دوستوں کی خدمت میں پیش کیا کرتا تھا۔

بات یہ تھی کہ دمڑی کی سانس دوپہر سے بہت پھول رہی تھی۔ دوپہر کے بعد اس نے اپنا ٹھیلہ بھی نہیں چلایا تھا۔ اور اس وقت اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ اس کے سینے میں ایک دھونکنی سی چل رہی ہے۔

"ابے نہ گا' جہنم میں جا' ود اوٹ ٹکٹ!" یہ بھی اس کی گالی تھی۔ جب بالکل بے بس ہو جاتا تو اپنے معتوب کو سیدھے جہنم میں دھکیل دیتا اور وہ بھی بغیر ٹکٹ۔ فرہاد نے یہ بات کہہ کے اس

طرح سانس لیا جیسے اس کے دل سے پھانس نکل گئی۔ ایک زوردار قہقہہ لگانے کے بعد اس نے زور سے کہا۔ "اپن تو خوشامد کسی کی نہیں کرتے۔ نرگس بھی پاؤں دبائے آکر تو اپنی تو بادشاہت بنی رہے گی۔"

پھر گنگنانے لگا "زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی"۔

دمڑی نے اسے چھیڑا "غالب کی چودھویں بیگم نظر بھر کے دیکھ لے تو بڑے بڑے فرہاد یوں یوں لوٹن قبوتر بن جائیں۔"

"دمڑی!"

دمڑی بڑے اطمینان سے گانے لگا اور ٹن کی میز پر طبلہ ٹھوکنے لگا۔

"کمر لچک دار سجن رہیو کی جیو"۔

دوسرے نے بھی طبلے ٹھونکنا شروع کر دیئے۔ اچانک دمڑی کی آواز بند ہو گئی اور اس کا سر میز پر آ رہا جس پر گندے میل کا ایک کمبل سا بچھا ہوا تھا۔ سب اس پر جھک گئے۔ فرہاد سب سے پہلے آیا۔ "منع کرتا ہوں یتیم کے بچے کو۔ نہ گانہ گا۔ دن بھر ٹھیلہ چلائے گا۔ گرد پھانکے گا۔ کلیجہ سکھائے گا اور رات کو گانا گائے گا، یتیم کا بچہ۔"

یتیم کے بچے نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھولیں اور مسکرایا! "قسم خدا کی لگتا ہے فرہاد بھائی اپنا سینہ بھی ایک پنجرا ہے اور اس میں کوئی چڑیا پھڑ پھڑا رہی ہے۔"

"بیٹا دھیان رکھتا نہیں پھر سے اڑ نہ جائے" دمڑی کا منہ زرد پڑ گیا، لیکن دوسرے ہی لمحے مسکرایا۔۔۔۔ ایک زرد اور میلی سی سہمی سہمی مسکراہٹ۔

"اڑ جائے سالی! پنجرے میں بند بند دم گھٹنے لگتا ہے فرہاد بھائی۔"

فرہاد نے ٹیڑھے میڑھے سے المونیم کے گلاس میں پانی لا کر دیا۔ پانی پینے کے بعد اس نے پھر اسی زوردار مریل مسکراہٹ سے فرہاد کو دیکھا۔ "کون کہتا ہے کہ فرہاد بھائی آدمی نہیں پتھر ہے۔"

فرہاد نے چائے کی گرم پیالی بڑھاتے ہوئے کہا "ابے خوشامد مت کر۔ چائے پی۔ کل شام ہی کھڑے کر لوں گا"۔ لیکن جب دمڑی چائے سڑ کنے لگا اور مارے درد کے اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپک کر چائے کی پیالی میں گرنے لگے تو وہ اچھل کر اس کے پاس آیا: "ابے دمڑی کے

بچے میں تو مذاق کر رہا تھا کل تھیلہ نہ نکالنا۔ پیسے کی جلدی نہیں' جا ابھی بڈھے پیش امام کے باہر والے برآمدے میں سو رہ۔ بڈھے کے کتے کے سوا اور کوئی نہیں سوتا وہاں' اور کتا شریف ہے وہ بھونکتا نہیں بڈھے کی طرح۔"

کسی نے چونک کر پوچھا "کیا بڈھا کتا پالتا ہے۔ سنا ہے جہاں کتا ہو وہاں فرشتے کا گزر نہیں ہوتا۔"

"بڈھا جانتا ہے کتے کا کیا۔ جہاں وہ ہوگا وہاں فرشتے پر نہیں مار سکتے۔"

سب نے مل کر ایک زوردار قہقہہ لگایا اور اپنی چائے کے آخری گھونٹ کے ساتھ قہقہہ بھی گھول کر پی گئے۔

اس پورے وقت میں' سکندر کونے میں بیٹھا اطمینان سے ایک بیڑی کے بعد دوسری بیڑی سلگا کر پیتا رہا جیسے وہاں پر کوئی خاص بات ہو ہی نہ رہی ہو۔

گلی میں لوگ لپک لپک کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ بجلی چمکی تو پوری گلی میں اجالا ہو گیا۔ بدنما پرانی دیواروں پر پان کی پیک تک چمک اٹھی۔ پڑپڑ کی آواز کو بادل کی گرج نے اپنے اندر سمو لیا۔

سکندر نے بڑی غم زدہ آواز میں کہا "تو آخر برسات بھی شروع ہو گئی"۔ اتنا کہہ کر اس نے ٹھنڈی سانس لی اور ایک تازہ بیڑی سلگانے لگا۔

سب گاہک فرہاد کی دکان سے اٹھ کر بھاگے "بھیا بھاگ چلو کون جانے برسات کی جھڑی لگ گئی تو۔۔۔۔"

ہوٹل میں سناٹا ہو گیا۔ قہقہے' آہیں' طعنے' گالیاں سب گاہکوں کے ساتھ چلی گئیں۔ پانی بڑے زور سے برسنے لگا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خزاں کے سوکھے پتوں پر سیکڑوں گدھے ایک ساتھ لوٹ لگا رہے ہیں۔

فرہاد نے جھانک کر دیکھا۔ اس کی ماں ٹن کا چولہا اور کباب کے برتن اور سیخیں سنبھالتی ہوئی گرتی پڑتی اندر گلی کی طرف جا رہی تھی۔ لوگوں نے اپنی دکانیں بند کر لی تھیں اور نوجوان

پنواڑی کی بند دکان سے اس کی دوسری بیوی کی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ آ رہی تھی اور پنواڑی کے ہنسنے کی، جیسے کوئی اسے گدگدا رہا ہو۔

سکندر کی بیڑی بجھ گئی تھی اور فرہاد اسے پلٹ کر دیکھ رہا تھا اور اب کچھ کہنا چاہ رہا تھا کہ محلے کے چند تیز و طرار غیر جانب دار جنس کے لوگ اس کی دکان میں گھس آئے۔ موٹے بھدے کانوں میں بالیاں، آنکھوں میں سرمہ، ہونٹوں پہ لپ اسٹک اور رنگین ساڑیوں اور لہنگوں میں مٹکتے اور بل کھاتے ہوئے۔

فرہاد تھوک گھونٹ کر رہ گیا۔
"تم یہاں کیوں گھس آئے؟"
"ہائے جانی، لال پیلے کاہے کو ہوتے ہو۔ ہم تمہاری گود میں تھوڑی گھس رہے ہیں"۔ بہت فحش انداز سے ان میں سے ایک نے اپنا ہاتھ چلایا اور سب کھل کھلا کر ہنس پڑے۔
"فرہاد غصے میں کھڑا ہو گیا۔ "میری دکان میں صرف مرد آتے ہیں۔ تمہارے لئے وہی دندان ساز کی دکان ہے۔
"یہودی کا بچہ اپنے آپ کو ڈاکٹر بنائے پھرتا ہے۔"
"دیکھنا بہن موئے کو، چڑھا آ رہا ہے۔" ایک نے تنک کر کہا۔

فرہاد نے بے بسی سے سکندر کی طرف دیکھا۔ وہ مزے لے لے کر مسکرا رہا تھا۔ فرہاد نے آؤ دیکھا نہ تاؤ مٹکتے ہوئے سرخ ساڑی والے کو باہر دھکیل دیا۔ اس نے گالیاں بکنا شروع کیں۔ اس کے پیچھے اس کے ساتھی بھی اتر گئے۔

"جاؤ دندان ساز کے ہوٹل میں، وہاں تم کو افیم بھی ملے گی۔"

سکندر نے اپنی بجھی ہوئی بیڑی کو دوبارہ جلایا اور اپنی پھٹی ہوئی قمیص سے تاگا نوچتے ہوئے گنگنانے لگا! "تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو"۔

گلی میں بارش کی رم جھم کے سوا اور کسی چیز کی آواز نہیں ابھر رہی تھی۔ البتہ دور نکڑ پر سے بھیگتے ہوئے پاگل کے چیخنے، کتے کے غرانے اور پیر صاحب کے وعظ کی آواز آ جاتی تھی۔

فرہاد کو پوری گلی ایک کالی بھیگی ہوئی سرنگ کی طرح نظر آئی جس میں کہیں کہیں روشنی کے داغ ابھر ابھر کر چھپ جاتے تھے۔ اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی دوڑ گئی۔

"برسات آگئی۔ دس برس بیت گئے۔ میں تین مہینے میں چالیس برس کا ہو جاؤں گا۔ رابعہ بھی تیس برس کی ہوگئی ہوگی! وقت کس طرح گزر جاتا ہے۔ یہی ایک ایسی چڑیا ہے جسے بڑے سے بڑا شکاری نہ مار سکتا ہے اور نہ پنجرے میں بند کر سکتا ہے۔"

فرہاد نے سکندر کی طرف گھبرا کر دیکھا۔ سکندر فرہاد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اس طرح مسکرایا جیسے اس نے اس کے دل کے چور کو پکڑ لیا ہو۔ فرہاد کا دل دھک سے ہو گیا' جیسے اندھیری رات میں آندھی نے یکایک اس کی کوٹھری کے دونوں پٹ کھول دئے ہوں اور دنیا والوں نے ٹارچ کی تیز روشنی میں اسے مادرزاد ننگا دیکھ لیا ہو۔ اس وقت سکندر کی آنکھوں سے ٹارچ سے بھی زیادہ تیز روشنی نکلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ سکندر نے اپنے سینے پر ہاتھ مارتے ہوئے زور سے قہقہہ لگایا اور یکایک خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

"ابے سکندر کے بچے' میں کوئی ہنسنے کی چیز ہوں۔"

سکندر نے کوئی جواب نہیں دیا البتہ اس کی بھویں سکڑ گئیں۔ بارش پھر تیز ہو گئی تھی اور بنواڑی کی دکان کی درازوں سے جو روشنی تلوار کی دھار کی طرح جھانک رہی تھی وہ بھی بجھ گئی تھی۔

"میں کہتا ہوں تو آج کھانا بھی کھائے گا یا بیڑی سے اپنا کلیجہ پھونکتا رہے گا۔"

"کوئی کھانے کی چیز بھی ہو۔" سکندر نے اپنی دونوں ٹانگیں بنچ پر پھیلاتے ہوئے بڑے ٹھسے سے کہا۔

"کیا کھائے گا؟" پھواریں تیزی سے چولھے کے کوئلے بجھا رہی تھیں اور وہ اپنے دانت پیس رہا تھا۔

"میں خورمہ کھاؤں گا"۔ اس نے اپنے خاص حیدر آبادی انداز میں کہا۔

"خورمہ"

"میں خلیہ کھاؤں گا"۔

"اور"

"اور میں خیمہ کھاؤں گا"۔

"خیمہ کھاؤں گا" فرہاد نے اس کی نقل اتارتے ہوئے کہا "پہلے بتا آج تیرا منہ اتنا لٹکا ہوا کیوں ہے۔ رکشا کہاں چھوڑ دی۔ بھیگ رہی ہو گی پانی میں۔"

"بھیگنے دو۔"

فرہاد نے چولھے سے کوئلہ گرا دیا اور برتن اتار کر ایک طرف رکھ دیے۔

گلی خاموش تھی۔ پیر صاحب کا وعظ جاری تھا' ایسا لگتا تھا جیسے کوئی اندھے کنوئیں میں منہ لٹکائے رو رہا ہے۔ فرہاد اور سکندر بھی چپ چاپ اپنے اپنے خیال میں گم تھے۔ بادل گرج رہے تھے اور بجلی گلی میں سڑتی ہوئی گندگیوں پر ٹھہر ٹھہر کر سونا برسا رہی تھی۔

عام طور پر دوسرے لوگ سکندر اور فرہاد کی باتیں سن کر نہیں سمجھ سکتے تھے کہ دونوں بہت گہرے دوست ہیں۔ ان کا رشتہ صرف گاہک اور دکاندار کا نہیں ہے۔ گلی کے آخر میں جہاں بھنگی محلے بھر کی گندگی کا ڈھیر لگاتے تھے اور گندگیوں کے ڈھیر میں سے ان کے ننگے بچے ٹوٹی پھوٹی چیزیں چنتے تھے' شیشیاں' کاغذ' کٹوریاں' ٹن اور شیشے کے ٹکڑے' کبھی کبھار کوئی پھٹا پرانا کپڑا۔۔۔ وہیں پر ایک اندھیری سی کوٹھری تھی۔ اس کے آگے ایک ٹوٹی ہوئی سی چھت جھول رہی تھی جس کے نیچے ایک برآمدہ تھا۔ اس میں بکریوں کی مینگنیاں' محلے کے بچوں کا لایا ہوا کباڑ جمع رہتا تھا۔ یہی کوٹھری اور یہی برآمدہ ملا کر فرہاد کا محل تھا۔ اسی میں اس کی ماں رہتی تھی جو شام کو روزانہ مسجد کے سامنے ملبوں کے پرانے ڈھیر پر ٹن کا چولہا جلا کر اور اپنے سامنے کباب کے گوشت کی رکابی رکھ کر کباب بیچا کرتی تھی۔ وہیں فرہاد کا اپاہج ماموں رہتا تھا۔ ابھی وہ بوڑھا نہیں ہوا تھا۔ وہ اس کی ماں سے چھوٹا تھا' لیکن جب سے اس پر فالج کا حملہ ہوا اس کے منہ سے رال اور جھاگ ٹپکتے رہتے تھے اور نالی سے نکلی ہوئی گاد کے رنگ کا تکیہ اس میں بھیگا رہتا تھا۔ سکندر اپنی سائیکل رکشا اسی برآمدے میں کھڑی کر کے اس چارپائی پر ٹانگیں پھیلا کر سوتا تھا جس کی ایک ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی اور اس کی بیساکھی کا کام تین اینٹیں کرتی تھیں۔ کبھی کبھی سوتے میں کوئی اسے پکار کر چونکا دیتا۔ "اس جوانی میں یوں موت کا سامان کرتا ہے بھائی۔ چھت گر گئی تو پیارے تیری تو چپاتی بن جائے گی۔"

"واہ!" وہ واقعی ڈر جاتا۔ "جب تک تاج محل کا گنبد سلامت ہے' یہ چھت باقی رہے گی۔"
ایک بیڑی نکالتا۔ تین چار کش لگا کر پھینک دیتا۔ پھر اسے رات بھر نیند نہ آتی تو وہ پو پھٹنے سے پہلے ہی اپنا رکشا کا بھونپو بجاتے ہوئے وہاں سے نکل جاتا "یہ نہ تھی ہماری خسمت کہ وصال یار ہوتا"۔ اس کی آواز خاموش گلی میں دونوں طرف کی سالہاسال پرانی' سلسلاتی دیواروں کے درمیان دور تک تیرتی چلی جاتی اور گلی کی نگہبانی کرنے والا سپاہی اپنا ڈنڈا پٹک کر کہتا "ابے او سانڈ کی اولاد' شریفوں کی نیند کیوں خراب کرتا ہے" اور کروٹ بدل کر نیند کو خراب ہونے سے بچالیتا۔ البتہ اس شور و غل سے فرہاد کی آنکھ کھلتی تو پھر بند نہ ہوتی۔ وہ نیند کا بہت ہی کچا تھا۔ وہ خود کہتا "میں سوتا نہیں' بے ہوش ہو جاتا ہوں اور جب ہوش میں آجاتا ہوں تو پھر بے ہوش نہیں ہوتا۔ اور جب تک جاگتا رہتا ہوں بڑے ڈراونے خواب دیکھتا رہتا ہوں۔"

ایک دن اس نے اپنی سرخ آنکھوں کو بڑے کرب سے نچاتے ہوئے کہا تھا "یار گیت گاتے ہوئے گلی سے نہ جایا کر۔" وہ اپنے ہوٹل میں سوتا تھا۔ اس کا گھر سے کوئی رشتہ نہیں تھا' کبھی کبھی تین تین چار چار دن تک وہ گھر نہ جاتا اور اس کی ماں چپکے سے شام کو آتی اور چولھے پر کباب کی سیخیں رکھنے سے پہلے 'ایک نظر اسے جھانک کر دیکھ جاتی۔

سکندر کی سمجھ میں فرہاد کی یہ باتیں بالکل نہ آتی تھیں۔ وہ اندر ہی اندر اپنی عقل کے جال پھینکتا اور دور کی کوڑیاں لاتا' لیکن ان کوڑیوں سے' فرہاد کی ان حرکتوں کا ذرا بھید نہ کھلتا۔ وہ جب اس کی ماں کی جھریوں کو آنسوؤں سے تر دیکھتا تو غصے میں کانپ جاتا"۔ یہ سب اس بھیڑیے فرہاد کا خصور ہے"۔ لیکن کبھی رات گئے وہ فرہاد کو اپنی دکان کی چھت پر نظریں گاڑے ہوا کو انگلیوں سے کرید کرید کر بڑبڑاتے ہوئے دیکھتا تو اس کے ہاتھ پاؤں سن ہو جاتے اور وہ دبے پاؤں واپس آکر اسی آسمان کے نیچے سو رہتا جو لوگوں کے کہنے کے مطابق اس کو پچکا کر چپاتی بنا دینے کی تاک میں تھا۔ اس وقت وہ سوچا کرتا کتنا اچھا ہوتا اگر حیدر آباد سے بھاگنے کے بعد یہاں اس کی ملاقات اس پاگل فرہاد سے نہ ہوتی۔ "شاید میں رکشا نہ چلاتا۔ کسی ہوٹل میں یا کسی وزیر کے یہاں بیرا بحال ہو جاتا۔"

لیکن جب بھیانک خواب دیکھتے ہوئے اس کی آنکھ کھل جاتی تو وہ پسینے پسینے اٹھتا اور اپنی رکشا لے

کر وہاں سے ریلوے اسٹیشن کی طرف بھاگتا۔ ایسے خواب کے بعد وہ خاموش گلی سے گزر جاتا۔ سپاہی کے کان پر جوں تک نہ رینگتی اور فرہاد کو اس سے کوئی شکایت نہ پیدا ہوتی۔ اگرچہ وہ اس سے یہ ضرور پوچھ لیتا "کیوں۔۔۔۔ رات تم سوئے نہیں کیا؟" وہ کچھ نہ کہتا۔ صرف شرمندہ نظروں سے اسے دیکھتا "کتنا اچھا ہوا تم مجھے مل گئے۔" وہ یکایک گھبرا کر فرہاد کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیتا: "اس نے میرے دل کی گہرائی میں گونجی ہوئی آواز سن نہ لی ہو۔۔۔۔ اف میں کتنا کمزور ہوں۔ دوستی اور محبت کے بغیر لوگ کیسے زندہ رہ لیتے ہیں۔۔۔۔ ایں؟"

ایک دن اس نے فرہاد کو مسکراتے ہوئے دیکھا تو پوچھا "تم ماں سے کبھی جھوٹے منہ بات بھی نہیں کرتے۔ غصہ کیا ہے؟"

فرہاد اس وقت صبح صبح کشتی کے اکھاڑے سے آ رہا تھا اور اس کی گردن پر سرخ مٹی چپکی ہوئی تھی۔ اس نے مٹی جھاڑتے ہوئے بڑی خوفناک نظروں سے فرہاد کو دیکھا اور اپنا منہ پھیر لیا۔ اس کے بعد سکندر نے دوبارہ اس دکھتی رگ پر انگلی نہیں رکھی۔

لیکن اس رات جب بارش دوبارہ تیز ہوگئی اور کہیں سے کسی مکان کے دھم سے گرنے اور لوگوں کے چیخنے اور رونے کی آواز آئی اور سکندر دوڑتا ہوا گلی میں غائب ہو گیا تو اس کو سکندر کا سوال یاد آیا۔ کانٹا چبھا۔

"غصہ کیا ہے؟"

دس برس بیت گئے، وہ اس گلی میں رہتا تھا جو کوہان کی طرح اٹھی ہوئی تھی۔ جنگ ختم ہو چکی تھی اور وہ برما کے جنگلوں سے واپس آگیا تھا۔ اب وہ فوجی باورچی نہیں تھا۔ اسے کاروبار کا کوئی راستہ نہ سوجھتا تھا۔ اس وقت اس نے اپنے گرتے ہوئے گھر کا ایک حصہ بیچ کر ایک ہوٹل کھول لیا۔

"کچھ روپیہ کما لوں تو جامع مسجد کے سائے میں ایک بڑا چائے خانہ کھولوں گا۔ پھر رنگ جمے گا!" اس نے اپنی بیوی رابعہ کی چاندی کی پازیب کو گدگداتے ہوئے کہا تھا۔

رابعہ لمبی اور تیز طرار عورت تھی۔ اس نے کچھ پڑھنا بھی سیکھ لیا تھا۔ فرہاد کی ماں کو رابعہ ذرا

پسند نہ تھی اس لئے کہ وہ من مانی کرتی تھی۔

دونوں کا جھگڑا بڑھنے لگا۔

"رات دن کتاب میں ناک ڈالے پڑی رہتی ہے۔ جنے اس میں کون سا خزانہ دفن ہے۔"
"باپ سے زیور' کپڑا تو نہ ہوا' جہیز میں ایک روگ دے دیا! ہوں۔ بے شرم!"
"اور جو میں کتاب میں دفن رہتی ہوں تو گھر کے کام کاج کون کرتا ہے۔ کوئی آتا ہوگا۔ خدائی خدمت گار۔ کمرہ کون صاف کرتا ہے' کپڑے کون دھوتا ہے' چولھے میں منہ جلا کر کھانا کون پکاتا ہے' میری خالہ اماں؟" غصے میں وہ اپنی ساس کو خالہ اماں ہی کہتی تھی۔

فرہاد کو سب معلوم تھا۔ وہ چپ تھا۔ سوچتا تھا ذرا ہاتھ میں پیسے آئیں تو جھگڑا ہی مٹ جائے۔ الگ ایک مکان لے لے گا قریب ہی اور ماں کو خرچ کے لئے کچھ رقم مقرر کر دے گا۔ پھر چین چکال ہو جائے گا' جیسے برما کے جنگل پر جنگ کے بعد سکون چھا گیا تھا۔ لیکن اس کے گھر میں بم پھٹتے رہے اور اس کے ساتھ ساتھ اس کا دماغ بھی پھٹتا رہا۔ ہوٹل کی چادر بہت چھوٹی تھی۔ اس کا سر چھپتا تھا اور نہ پاؤں۔ رابعہ کی مسکراہٹ بھی مرجھا گئی اور اس کی پازیب بھی گونگی ہو گئی۔ اس کے کرتے اور شلوار سے پسینے کی بو کا بھبکا آنے لگا۔ اور جب فرہاد رات کو تھکا ہوا گھر آتا تو رابعہ کے پاس لیٹ کر اسے لگتا کہ وہ اب بھی گلی میں مسجد کے پاس اپنے ہوٹل میں سڑ رہا ہے جہاں سڑی ہوئی ترکاری اور پھل اونے پونے بکتے رہتے تھے۔ جب رابعہ اپنی کھانسی روک کر اس کے بڑھے ہوئے بالوں میں انگلی سے گدگدی کرتے ہوئے کہتی "اس گھر میں اب تو گھٹ کر دم نکل جائے گا" ایک طرف سے دھوپ اور ہوا آتی تھی وہ بھی بند ہو گئی۔ کتنا اونچا گھر بنوایا ہے۔ اس چڑی کے غلام دنداں ساز نے۔" اس کی اس بات پر فرہاد بے ساختہ ہنستا اور اسے پیار کرنے لگتا اور اسے بھینچ لیتا۔ یکایک خشک پسینے کی کھٹاس پر تازہ پسینے کی خوشبو چھا جاتی اور تھوڑی دیر کے لئے وہ نشے میں جھوم اٹھتا۔

"اب کے مہینے میں حالت کچھ سنبھلتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ تم جانتی ہو سورج ہمیشہ تو گہن میں رہتا نہیں۔"

سورج گہن سے کیا چھوٹتا۔ رابعہ فرہاد سے ضرور چھٹ گئی۔ ایسی ہی برسات کی بھیگی ہوئی

رات تھی۔ فرہاد گھر نہیں لوٹا تھا۔ دن سے رابعہ اور ساس کا جو جھگڑا چل رہا تھا اچانک رات کے وقت اس کا شعلہ زوروں پر بھڑک اٹھا۔

"میں جانتی ہوں تیرے دل میں چور ہے اور پڑھنا لکھنا تو بہانہ ہے۔ آنے دے آج اپنے میاں کو۔ یہ بات ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ تو نداں ساز کو چھپ چھپ کر خط لکھتی ہے۔ چھت پر پہروں کیا ہوتا رہتا ہے' کہہ دو میری رانی۔۔۔۔ تارے گنتی رہتی ہوں۔ ہائے میرا معصوم فرہاد ہائے اس کی قسمت!"

جب فرہاد رات گئے گھر پہنچا تو بارش ختم چکی تھی۔ ہلکی ہلکی پھوہاریں پڑ رہی تھیں۔ اس کی ماں نے سسکتے ہوئے اور خود کو کلموئی کہتے ہوئے سارا ماجرا کہہ سنایا۔ تھوڑی دیر تک فرہاد زمین میں گڑا رہا۔ اس کے بعد تیزی سے باہر نکل گیا۔ اس نے سارے شہر کی خاک چھان ماری' لیکن رابعہ کو تو زمین نگل گئی تھی۔ وہ دس گیارہ دن خاموش رہا۔ نہ ہوٹل کا چولہا جلایا اور نہ کوئی اور دھندا کیا۔

اس کی داڑھی بڑھ آئی اور ہر وقت اس کے ہونٹ اور انگلیاں کانپتی رہتیں۔

آخر ایک دن جب وہ بہت اداس اور دکھی بیٹھا تھا اور آہستہ آہستہ بیڑی کا دھواں اگل رہا تھا اس کو ایک خط ملا۔

میلے سے کاغذ پر' پنسل سے گھسیٹی ہوئی تحریر میں رابعہ کی بھیگی ہوئی آنکھوں کی پرچھائیں صاف دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے یہ خط کسی بہت دور کے شہر سے بھیجا تھا۔ "میں کیچڑ میں لت پت ہو چکی ہوں۔ اب میں تمہارے لائق نہیں رہی۔"

رابعہ نے بہت سی باتیں لکھی تھیں جو آنسوؤں اور سسکیوں میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ اس میں کسی کی شکایت نہیں تھی۔ وہ سمندر میں بہتی ہوئی برف کی چٹان پر کھڑا تھا جو پگھل چکی تھی۔

"کیا میں اسی طرح ڈوبتا چلا جاؤں گا۔ یا اس کی کوئی تہ بھی ہے۔ کیا رابعہ اب واقعی واپس نہیں آئے گی۔ ہاں وہ اب نہیں آئے گی۔"

جب وہ اکیلا ہوتا اور اس کے پاس کوئی نہ ہوتا تو رابعہ اس کے سامنے آجاتی۔ وہ لیمپ پوسٹ

کے پاس خاموش کھڑی تھی۔ بارش میں اس کا لباس اس کے بدن سے چپک گیا تھا' رات گہری اور خاموش تھی اور وہ اپنی سانس سے لڑکر بس کا انتظار کر رہی تھی۔ وہ کہاں جائے گی؟ اس کے ماں باپ تو کب کے مر چکے تھے۔ شاید وہ اپنے رشتے کے ماموں کے پاس چلی جائے گی۔ پھر جب فرہاد کو اس کا پتہ چلے گا' بھاگتا ہوا آئے گا۔ شرمایا ہوا مجرم کی طرح۔ سر کھجاتے ہوئے وہ اپنی ماں کی زیادتیوں کی معافی مانگے گا۔ وہ ڈانٹ ڈپٹ کر اس کے ساتھ واپس چلی جائے گی۔ آخر وہ اتنی محبت کرتا ہے۔ اس کی ایک ایک سانس اسے پکارتی اور پیار کرتی ہے۔ یکا یک ایک کار آکر رکتی ہے اور اس میں سے غنڈے نکلتے ہیں اور اسے زبردستی کار میں بٹھا کر شہر سے باہر دور جنگلی سناٹے میں نکل جاتے ہیں۔

''میں کیچڑ میں لت پت ہو چکی ہوں۔ اب میں تمہارے لائق نہیں رہی۔''

ایک بھیانک چیخ اس کے خون کے ایک ایک قطرے میں گونج جاتی اور وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ اس کی نسیں تن جاتیں اور اس کے بعد وہ ہر راہ چلتے آدمی پر پھبتی کستا۔ برقع پوش عورتوں کو بھی نہ چھوڑتا۔

اس گلی میں عورتیں چلتے ہوئے ڈرتی تھیں۔ وہ انتہائی لڑاکو ہو گیا تھا۔ وہ کسی کی بھی پگڑی اچھال سکتا تھا۔ اس نے ایک کشتی اکھاڑہ جما رکھا تھا۔ روز صبح اس کے نوجوان شاگرد سرسوں کا تیل مل کر اکھاڑے میں نئے داؤ پیچ سیکھتے اور اس کی گردن پر بھوری مٹی سے گھسے پر گھسے دیتے۔ اس کی کنپٹیاں ابھر آئیں۔ لیکن وہ اف نہ کرتا...... ''اور زور سے میرے شیر اور زور سے۔''

اس نے اپنی ماں سے بولنا بالکل بند کر دیا تھا۔ اس کی ماں روئی۔ خوشامدیں کیں' منت سماجت کی' لیکن وہ ایک آتش فشاں پہاڑ کی طرح خاموش زہر سے بھرا ہوا لاوا اپنے سینے میں چھپائے رہا۔ اسے شاید خود بھی معلوم نہیں تھا کہ ابل پڑنے کے لئے اسے وقت کا انتظار ہے۔ کبھی کبھی وہ خود اپنے آپ سے کہتا ''میں انتقام لوں گا'' لیکن کس سے؟ اگر اسے یہ معلوم ہو جاتا تو وہ اپنے دشمن کا صفایا کب کا کر چکا تھا۔ اسی لئے وہ جھلا اٹھتا' گاہکوں سے لڑ پڑتا' راہ گیروں پر کھانس کر آوازے کستا' اور کبھی کبھی تو دنداں ساز کو بھی زور زور سے گلا پھاڑ کر گالیاں سنا آتا۔ لوگ جمع ہو جاتے۔ سب کے دل کی آواز اس کی آواز سے مل جاتی۔ ''جی ہاں! آپ خود کو لارڈ

ماؤنٹ بیٹن سمجھتے ہیں' بے ایمانی شیطانی سے لوگوں کے گھروں اور دکانوں پر قبضہ جمالیا ہے حرام خور نے اور اب خود کو محلے کا چودھری بتاتا پھرتا ہے۔ کرلو جو جی چاہے۔ میں تو پچیس روپے کرایہ نہیں دوں گا۔ میونسپلٹی سے بارہ روپے مقرر ہے۔"

دنداں ساز سانس بھی نہ لیتا۔ اس کی بیوی اور بیٹیاں آنکھیں جھپکا جھپکا کر گلی سے ابھرتی ہوئی گالیاں سنتیں اور دنداں ساز اپنے دانت پیس کر کہتا "ان کوفیوں کو عدالت ہی مزا چکھائے گی' میں کیچڑ میں ڈھیلا کیوں پھینکوں۔ وہ بنیان اور پاجامے میں بڑے بے ہنگم پن سے نماز پڑھنے کے لئے کھڑا ہو جاتا"۔ فرہاد کے بچے کو جب تک گلی سے نہیں نکالا جائے گا یہاں کے لوگ قابو میں نہیں آئیں گے۔ یہی سور لوگوں کو میرے چائے خانے میں بھی جانے نہیں دیتا۔ سب سے کہتا پھرتا ہے وہاں ہجڑوں کو افیم ملتی ہے۔ اور لوگ بھی کتنے حرامی ہیں' کس شان سے کہتے ہیں۔ ارے یار ہجڑوں کی دکان میں چائے پیتے متلی آتی ہے۔ اچھا ایسی متلی آئے گی کوفیو کہ تم بھی کیا یاد کروگے ـــــ کس دنداں ساز سے پالا پڑا تھا جس نے سارے دانت جھاڑ کے رکھ دئے"۔ جب تک اس کی نماز ختم ہوتی گلی کا شور بھی سو جاتا۔

اس گلی میں دنداں ساز سب سے زیادہ چلتا پرزہ تھا۔ اس نے ہندوستان کی تقسیم کے بعد دیکھتے دیکھتے اپنی حیثیت بنالی تھی۔ ایک ایک پائی کو دانت سے پکڑتا اور کوئی مکان' کوئی بیٹھک اونے پونے بکتے دیکھتا' جھٹ اپنی گرہ سے دام نکال کر سودا کھرا کر لیتا۔ اس طرح گلی میں زیادہ تر لوگ اسی کے کرایہ دار تھے۔ چاپلوسی میں بڑا ماہر تھا۔ دودھ شہد بن کر باتیں کرتا۔ لیکن کرایہ لیتے وقت وہ قصاب کی طرح اپنا کام کرتا جو پانی پلانے کے بعد بکری کو ذبح کرتے ہیں۔ میونسپلٹی کے افسروں کو ملا رکھا تھا اور عدالت کا ذکر باتوں باتوں میں اپنے نئے کرایہ داروں سے اس طرح کر دیتا تھا جیسے بتا رہا ہو اس کو صبح شام پھول باغ میں ٹہلنے اور تازہ ہوا کھانے کا اتنا شوق ہے کہ اس طرف سے وہ کبھی غافل نہیں ہوا۔

اس کے کرایہ دار اس سے ڈرتے تھے۔ جو کوئی ہمت کر کے یا جھنجلا کر غصے میں اس سے ٹکرایا' دنداں ساز نے اس کے دانت توڑ دئے اور اس کو آخر میں بے گھر کر کے رکھ دیا۔ اس کے کرایہ داروں میں فرہاد ہی ایک ایسا تھا جو اس سے ڈٹ کر ٹکر لیتا تھا۔ جب کبھی دونوں میں ٹکر

ہوتی گلی کے لوگ سانپ اور نیولے کی لڑائی کا تماشا دیکھنے کے لئے ہر طرف سے دوڑ پڑتے اور اس وقت کا انتظار کرتے رہتے جب نیولا سانپ کی گردن کو آ دبوچے گا۔ جب فرہاد تہبند اور کرتا پھینک کر آنکھوں سے آگ برساتا ہوا گلی میں کودنے لگتا تو دنداں ساز کے پاؤں تلے سے زمین نکل جاتی۔ اور وہ اپنی اچکن اور کالی ٹوپی کے ساتھ اندھیرے راستوں پر غائب ہو جاتا۔

لوگ خوب قہقہے لگاتے اور فرہاد کو شاباشی دیتے۔

ایک دن دنداں ساز نے اس کو دس سال سے بھاگی ہوئی بیوی کا طعنہ دے دیا۔ اس دن وہ آپے سے باہر ہو گیا۔ اس نے ڈاکٹر کی گردن پکڑ لی "بھائیو! گواہ رہنا اس نے میری عزت پر کیچڑ اچھالی ہے۔ میں اس کی بیٹی سے شادی کروں گا۔" مسجد کے پیش امام' پیر صاحب اور دو چار اور نیک بختوں نے مل کر دنداں ساز کی گردن چھڑائی اور فرہاد کو قابو میں کیا۔ فرہاد غصے میں بھرا ہوا اپنے گھر میں گیا اور ٹوٹی ہوئی چارپائی پر اوندھے منہ گر کر رات بھر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتا رہا۔ پو پھٹنے سے پہلے جب اس کی آنکھ لگ گئی تو اس کی ماں چپکے چپکے روتی ہوئی اور اپنی آواز کو روکنے کے لئے منہ میں بساند سے بھرا ہوا دوپٹہ ٹھوسے ہوئے' اس کے پاس آئی اور اس کے سر کو سہلانے لگی۔ "میرے کلیجے کے ٹکڑے میں ابھاگن ہی تیری دشمن بنی۔ میری بہو چاند تھی۔ ہائے میں نے کیا کیا۔۔۔۔" فرہاد نے آنکھ کھول کر دیکھا اور ماں کا ٹھنڈا کانپتا ہوا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ ماں کا ہاتھ ماں کا ہاتھ ہے۔ اس کے تنکے میں جو سہارا ہے' بڑے بڑے درختوں میں نہیں۔ لیکن جب وہ دوبارہ صبح اٹھا اور کشتی لڑنے کے لئے اکھاڑے کی طرف چلا تو اس نے ماں کو اسی ٹھنڈی اور ملامت بھری نظروں سے دیکھا جن کے سامنے اس کی ماں کا دل ڈوبنے لگتا تھا اور جس کے بعد وہ پہروں اپنے آپ کو کوستی رہتی تھی۔

سکندر سے دوستی کے بعد' اس نے ایک سیکنڈ ہینڈ رکشا خریدی اور اس کے حوالے کر دی۔ وہ اس کو اپنے آپ سے بہت قریب محسوس کرتا' لیکن اس کی دوستی اپنے رچاؤ اور بے تکلفی کے باوجود سکندر کے دل سے اجنبیت کو نہ دھو سکی۔ "آخر یہ آدمی اتنا چپ چاپ کیوں رہتا ہے۔ اس کی آواز آپ سے آپ کیوں بھرا جاتی ہے۔ آخر یہ عورتوں کو چھیڑتا کیوں ہے اور پھر اس

طرح کیوں بیٹھ جاتا ہے جیسے اندر ہی اندر وہ خود اپنا دل چبا رہا ہو۔ مجھے اس سے ڈر لگتا ہے۔"

اس رات بہت دیر تک فرہاد جاگتا رہا اور سکندر کا انتظار کرتا رہا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی اور اس کو سکندر پر غصہ آ رہا تھا جس کی ضد میں وہ کھانا کھائے بغیر بنچ پر لیٹ گیا تھا۔

لیٹے لیٹے اسے اپنی زندگی پر، اس گلی میں رہنے والوں پر، اس کی گندگی اور گھٹن پر بڑا رحم آیا۔ سب ناخوش تھے۔ اندر ہی اندر ایک دھواں تھا کہ سب کے سینے میں گھٹ رہا تھا، سوائے دنداں ساز کے سب ناخوش ہیں۔ پیر صاحب بھی اور پیش امام صاحب بھی، سب اپنی عزت اور دال روٹی کے لئے ڈھونگ رچائے پھرتے ہیں۔ وعظ کرتے ہیں اور گزری ہوئی شان وشوکت کے قصے سناتے ہیں۔ اس کی آنکھوں میں گلی کے پچاسوں بچے ابھرنے لگے جو ننگے ادھر ادھر مارے پھرتے ہیں۔ ان کی چھوٹی چھوٹی شرارتیں اور پاگل کی چیخ جو نل کے پاس کھڑا ہو کر ہر گزرنے والے پر ڈھیلا اٹھاتا ہے، کوئی محفوظ نہیں۔ صرف دنداں ساز کی اچکن اور کالی ٹوپی محفوظ ہے جو اس گلی کا بادشاہ ہے اور جس کو لوگ جھک کر سلام کرتے ہیں اور پیٹھ پیچھے گالیاں دیتے ہیں اور قسمیں کھاتے ہیں۔

"اس خبیث کی موت میرے ہاتھوں لکھی ہے!"

اچانک دس برس پہلے کی رابعہ اس کی آنکھوں میں ابھر آئی۔ وہی مسکراہٹ کے پھول، وہی گالوں کا پسیجتا ہوا نمک، وہی آنکھوں کی چمک اور لمبے لمبے بالوں کی رات اور وہی چاندی کی پازیب کی چھنکی۔۔۔۔۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھیں نم تھیں۔

سکندر نے آتے ہی خبر سنائی کہ بفاتی کی بیوی اپنے دونوں بچوں سمیت دیوار کے نیچے دب کر مر گئی۔ "مٹی کھودتے کھودتے دم نکل گیا پر۔۔۔۔" سکندر کے ناخن سے خون ٹپک رہا تھا۔ فرہاد نے اٹھ کر کیتلی کا پانی اس کی انگلیوں پر ٹپکایا اور آہستہ سے بولا "اوہ ان کے کفن دفن کا کیا ہوگا؟"

سکندر چپکے سے آکر بنچ پر بیٹھ گیا۔ دونوں پھر خاموش ہو گئے۔ فرہاد نے بہت دیر کے بعد کہا "میں نے کچھ پیسہ رکھ چھوڑا ہے، وہی کیوں نہ دے دوں اس نیک کام کے لئے"۔ تھوڑی دیر

رکا اور پھر آہستہ سے سانس لے کر بولا "اب وہ نہیں آئے گی۔ اس کا انتظار بے کار ہے۔"

اس رات فرہاد نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ جب فرہاد خاموش ہوا تو سکندر اسے ایک ایسے بچے کی طرح گھور رہا تھا جو جادوگر کے دل دہلا دینے والے کرتب دیکھ کر حیران رہ گیا ہو۔ تھوڑی دیر کے بعد اس کے ہونٹ ایک دوسرے سے مل سکے۔

"فرہاد بھائی عشق بری بلا ہے۔ اسی لئے تو میں سالے عشق کو لات مار کر چلا آیا۔" فرہاد بڑے زور سے ہنسا "اچھا؟"

صبح ہی صبح گلی میں دو حادثوں نے ایک سنسنی سی دوڑا دی۔ ابھی صبح کا جھٹپٹا باقی تھا۔ نل پر بالٹیوں کی جھنکار گونجنے والی تھی۔ فرہاد سے رات بھر جاگنے کے بعد اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ پیش امام کے برآمدے میں دمڑی کی لاش پڑی ہوئی ہے تو وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن اس کے دکان سے باہر نکلنے سے پہلے ہی پولس والوں کا ایک دستہ اس کی دکان پر ٹوٹ پڑا۔ سکندر کی آنکھیں بار بار جھپک رہی تھیں اور وہ معاملے کو سمجھنے کی کوشش ہی کر رہا تھا کہ پولس والوں نے فرہاد کو گرفتار کر لیا۔ اس کی دکان میں افیم کی ایک پوٹلی ملی تھی اور یہ کافی تھا۔ ان کا چھاپا کتنا کامیاب رہا۔

فرہاد نے جاتے جاتے چیخ کر کہا "پولس والے بھی حرام خور ہیں۔ دنداں ساز ان کا باپ ہے۔ وہ افیم بیچتا ہے۔ لوگوں کا گلا کاٹتا ہے۔ اس کو گرفتار نہیں کرتے۔ اور مجھے بے قصور۔۔۔۔" ایک گھونسے میں اس کا منہ بھر گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ "میں لوٹ کر بدلہ لوں گا۔ میرا نام فرہاد ہے" دوسرے گھونسے کے بعد اس کے منہ سے خون نکلنے لگا۔

سکندر نے فرہاد کے نکالے ہوئے روپے دمڑی کے کفن دفن کے لئے دے دئے۔ جب فرہاد کی ماں اس کو خاموش گھورنے لگی تو وہ اس سے لپٹ گیا۔ "گھبراؤ نہیں ماں۔ آج سے تم کباب مت بیچنا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

دمڑی کے کفن دفن کے بعد سکندر نے فرہاد کی دکان میں چولہا جلایا اور گاہکوں کو چائے بڑھاتے ہوئے بولا۔

''آج سے میں بھی فرہاد بھائی کے اکھاڑے میں کشتی لڑنے کے لئے جاؤں گا۔''

سب کی نگاہیں اس کی پسلی کی ہڈیوں کی طرف اٹھ گئیں جو پتنگ کی کانپ کی طرح کپکپا رہی تھیں۔

سکندر کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ ''خسم خدا کی!''

O

لڑھکتی چٹان

رات بھر بادلوں کے گرجنے کی آواز آتی رہی۔ جیسے اونچی اونچی پہاڑی چوٹیوں سے مسلسل بڑی بڑی چٹانیں پھسل رہی ہوں۔

تنگ کمرہ بالکل تاریک تھا۔ اس اندھیرے میں تمام رات چمگادڑ پھڑ پھڑاتے اور دیواروں سے سر ٹکراتے رہے تھے۔ شاہد اپنی بیوی کے لچھے دار نرم بالوں میں منہ لپیٹے پڑا تھا۔ بالوں سے تل کے تیل کی ناگوار خوشبو نکل کر اس کے نتھنوں سے ہوتی ہوئی اس کی بے خواب کملائی ہوئی روح میں تیرتی، گھلتی اور رچتی چلی جارہی تھی۔ اس کی ناک سے چھوٹتی ہوئی زہریلی سانسیں بالوں کے گھونسلے میں گرمی بھر رہی تھیں۔ اور اس کا تمتمایا ہوا چہرہ اس گھونسلے میں ایک سہمی ہوئی چڑیا کی طرح چھپا ہوا تھا۔ اس نے آنکھیں کھولیں اور جب پہلی بار اس کی نظریں دریچے کے کھلے ہوئے حصے سے باہر گئیں تو اندھیرے کا رنگ پھیکا ہوتا ہوا نظر آیا۔ مدھم مدھم، جیسے ہر چیز دھواں دھواں ہو رہی ہو۔ کہرے نے وسعتوں میں اُمڈتی ہوئی بھاپ کا طوفان سا اٹھا رکھا تھا۔ اسے ہر چیز خواب میں کھوئی ہوئی، دبی دبی معلوم ہو رہی تھی۔ اس نے آنکھیں پھر بند کر لیں۔ اس کے حلق میں کھٹی کھٹی کوئی چیز رقیق سی پسیجتی ہوئی محسوس ہوئی۔ جیسے جلی ہوئی پیاز اور سرکہ چاٹ رہا ہو۔ اس کی طبیعت میں مالش سی ہوئی۔ اس نے اپنا ذہن دوسری طرف پھیرنا چاہا۔ لحاف کے اندر سر گھسیڑ کر اس نے ایک کرب کے سے عالم میں ثروت کے بالوں میں چھپے ہوئے چہرے کو اپنے چہرے سے قریب کیا اور اس کے ٹھنڈے لبوں کو چوم کر آہستہ سے بولا۔۔۔۔ جیسے اس کا تیزابی نشہ ٹوٹ رہا ہو۔

"میری جان، میری ثروت، صبح ہو رہی ہے، آخر صبح ہو ہی گئی۔ آخر صبح ہو ہی جاتی ہے۔ یار خاں

کا باپ بھی صبح کو نہیں روک سکتا...... میری ثروت' میری جان......"

ثروت کے ہونٹ شاہد کے تھوک سے گیلے ہو گئے تھے۔ اور وہ شبنم میں نہائے گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح ٹھنڈے تھے۔ زندگی اور سپردگی کی آگ سے خالی' شاہد کے لب...... جن سے سڑے ہوئے سرکے اور جلے ہوئے پیاز کی بو آ رہی تھی' بے حد جل رہے تھے۔ آنکھیں بند تھیں اور بند آنکھوں میں بجھتے ہوئے انگاروں کی راکھ کسمسا رہی تھی۔ ثروت کا جسم گرم تھا۔ پالتو بلی کے جسم کی طرح نرم۔ آنکھیں بند تھیں۔ ہونٹ پھر بھی شل تھے۔ شاہد کو محسوس ہوا کہ وہ شعلوں کے دریا میں بہتے بہتے ڈوبنے لگا ہے' شعلوں کا دریا جم کر برف بن گیا ہے۔ اور اس کے منہ میں برف کی دو قاشیں ایک دوسرے میں چپکی ہوئی چھبی ہوئی تھیں۔ کیا وہ ثروت ہی کے ہونٹ تھے۔ پھر ان میں وہ آگ کیوں نہ تھی۔ جس میں اس نے اپنی ساری زندگی کو' زندگی کے سارے رس کو' شعور کے تمام آدرشوں کو جھلس کر رکھ دیا تھا۔

منی جاگ پڑی۔ ثروت نے اس کی طرف کروٹ لے لی اور منی کے پوپلے منہ میں اپنی ٹھنڈی چھاتی ڈال کر اسے تھپکنے لگی۔

شاہد کو اپنی بیٹی کا یہ دخل در معقولات بہت برا معلوم ہوا۔ اس کو اپنی تنہائی اور محرومی کے احساس نے آدبوچھا۔ نیم غنودگی کے عالم میں وہ ایک خواب کے ریلے سے گزر گیا' ٹائپ رائٹروں کی آواز' سپرنٹنڈنٹ کی منحوس کھنکتی ہوئی ڈانٹیں۔ عینک کے شیشے کو توڑ کر جھپٹتی ہوئی آنکھیں۔ آنکھوں کی کمیں گاہ میں چھپے ہوئے کتنے گدھ' کتنی چیلیں' دوسری طرف ہیڈ اسسٹنٹ کا رعب' اس کے مڑے ہوئے دانت' سڑی ہوئی بدبودار مسکراہٹ' مسکراہٹ کی جھریوں میں کچلتا ہوا' رینگتا ہوا رحم' چھچھوراپن' زعم برتری۔۔۔۔ "تم اب تک دفتر کا کام نہیں سمجھ سکے۔ ان فائلوں کو دیکھ کر ریکارڈ ٹھیک کرلو' ہاں' مسٹر! معشوق کے دوپٹے اور سرکاری کام میں بڑا فرق ہے۔ نوکری نوکری ہے' دعوت کی میز پر رکھا ہوا کیک' مکھن کیک نہیں ہے۔ ملائی' ملائی' اوں' اوں۔۔۔۔ ہو ہو ہو۔۔۔۔" سپرنٹنڈنٹ اسے اسی طرح دھمکایا کرتا تھا۔ اور وہ اپنی سانس پھیپھڑوں میں لے کر زینے پر سے اترتے ہوئے اپنے آفس کے کمرے میں پہنچتے پہنچتے دانت پیس کر کہتا "معشوق کا بچہ' دوپٹے کی اولاد' کیک کا سالا"۔۔۔۔

اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آتے۔ وہ بے بسی سے اپنے چاروں طرف بکھری ہوئی فائلوں کو دیکھتا۔ ان پر رینگتے ہوئے اعداد کے کچھوؤں کو دیکھتا جو خرگوش سے بازی لگا کر تیرتے چلے جا رہے تھے۔ ٹائپ رائٹروں کے مقبروں سے کھٹ کھٹا کھٹ کا نغمہ چھنتا رہتا اور اس کی روح کے پرخچے اڑتے رہتے۔

گزشتہ شام کو ہی سپرنٹنڈنٹ نے اس سے کہا تھا۔ ''مسٹر تم دیکھنے میں آدمی انٹیلی جنٹ معلوم ہوتے ہو۔ لیکن تمہارے کام سے ایسا معلوم نہیں ہوتا۔ تم ٹمپریری کلرک ہو۔ اگر تم نے کام اچھا نہیں کیا تو تم ہی بتاؤ۔''

وہ پوری بات سنے بغیر بھناتا ہوا نکل آیا تھا۔ فائلوں کو میز پر پٹک کر اور صراحی سے ایک گلاس پانی انڈیل کر کھڑا کھڑا چڑھا گیا تھا۔ روز روز کی دھمکی، روز روز کی دھونس، نوکری کی ایسی تیسی۔ چپراسی اسے گھور رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ وہ اس کے قریب آیا۔ ''بابو جی، یہ کالا صاحب بڑا کائیاں ہے۔ نذرانہ مانگتا ہے۔ مچھلی، کھلونے، مٹھائیاں۔''

شاہد نے بڈھے چپراسی کا منہ دیکھا۔ دو تین بار اپنے پھٹے ہوئے گرم کوٹ اور دیمک کھائے ہوئے مفلر کو مٹھیوں میں بھینچا اور سکریٹریٹ کی اژدہا نما زرد عمارت سے نکل کر باہر چلا آیا۔

ابھی سڑک پر ہی پہنچا تھا اور بڑے پھاٹک سے باہر نکلنے والا تھا کہ ایک وزیر کی فالسئی کار دندناتی ہوئی نکل گئی۔ یکہ رکا اور اس میں سے قربان ہوٹل کا مالک نکل پڑا۔

''کہئے صاحب! آپ نے تو نہ ملنے کی قسم کھا رکھی ہے۔''
شاہد کا دم گھٹنے لگا۔ یہ بجلی کہاں سے گر پڑی۔ ''آخر آپ کا ارادہ کیا ہے۔ کب تک میں یکے کا کرایہ بھرتا رہوں گا؟''
''بس اب کے ضرور دے دوں گا۔ میں تو خود ہی آپ کے یہاں آنے والا تھا۔ اور کہئے سب خیریت ہے نا؟''
''آپ کی دعا ہے۔ مگر دیکھئے اب کے وعدہ خلافی۔''
''توبہ کیجئے۔'' اس نے مصافحہ کے لئے ہاتھ بڑھا دیا اور دوسرے ہاتھ سے اپنے مفلر کو مسلتا رہا۔ اسے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ اپنی موت سے ہاتھ ملا رہا ہے۔

اس سے جان چھوٹی تو اس کے ماتھے پر پسینہ تھا۔ وہ کئی مہینے سے اس ہوٹل والے کو جل دے رہا تھا۔ اس نے اس سڑک پر چلنا چھوڑ دیا تھا۔ جس پر وہ ہوٹل تھا۔ اسی لئے وہ بس سے نہیں جاتا تھا۔ بس ہوٹل کے سامنے رکتی تھی اور روز خطرے کے منہ میں سے گزرنا اس جیسے مرد میداں کا کام نہ تھا۔ وہ پرانے شہر سے پینجرے روانہ ہوتا اور وقت سے کافی پہلے روانہ ہوتا اور یہاں آکر ادھر ادھر ٹہلتا رہتا۔ اس کی اس مصیبت کی وجہ سے اس کی بیوی کو سویرے سویرے اس کا کھانا پکانا پڑتا۔ وہ اس سے بار بار کہتی تم بس سے کیوں نہیں جاتے۔ لیکن وہ اس کے مشورے کی اہمیت کو حسب معمول بہت سی مرعوب کرنے والی باتیں کر کے دبا دیتا تھا۔ "بس کا کیا بھروسہ ہے۔ اکثر پٹرول ختم ہو جاتا ہے اور بس راستے میں بچہ جننے لگتی ہے۔ اب ایسے میں۔۔۔۔ خیر چھوڑو۔ بات یہ ہے کہ آفس میں میری دھاک بیٹھی ہوئی ہے۔ میں کام بڑا پختہ کرتا ہوں اور اب کے چانس ہے سپرنٹنڈنٹ ہونے کا۔ میں کسی طرح آفس دیر سے پہنچ کر بدنام ہونا نہیں چاہتا۔ اچھا ذرا کبھی کبھار پودینے کی چٹنی تو بنالیا کرو۔ بڑا روکھا کھلاتی ہو۔۔۔" ثروت کا ذہن بس سے ہٹ کر روکھے اور پودینے کی چٹنی کی طرف چل دیتا۔

ہوٹل کا قرض تو اس پر اخبار کی نوکری کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ اخبار کی نوکری بھی خوب تھی۔ ایڈیٹر نے ایک وزیر کے اشتہار کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ وہ روپے دیتا تھا۔ زیادہ بڑا حصہ تو خود ایڈیٹر کے پیٹ میں چلا جاتا تھا۔ تھوڑے سے حصے میں کاتب' چپراسی' کلرک اور شاہد جیسے مترجموں کی روٹی کا انتظام ہوتا تھا۔ ایک کا پیٹ بھرتا تو دوسرے کا خالی رہتا تھا اور پھر شاہد پر احسان ہی تھا۔ وہ تو کہتا تھا محض مروت میں اس سے اس جیسے ہونہار نوجوان کی فاقہ کشی دیکھی نہ جاتی تھی۔ اور اسی لئے ترجمہ اور اداریہ سے لے کر کاپی جوڑنے کا کام تک اس کے سپرد کر رکھا تھا۔ وہ اپنی میلی قمیص اور بوسیدہ پاجامے میں اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے کام کرتا۔ ریڈیو سے خبریں اڑاتا' ترجمے کرتا' دو کالمی' تین کالمی سرخیاں لگاتا جاتا۔ ناراض کاتبوں کی خوشامدیں کرتا جاتا اور جب رات کے دو بجے آخری کاپی جوڑ کر پریس بھیجتا تو اسے محسوس ہوتا کہ اس کا دماغ چھچھوندر کی طرح شرارے اگلتا ہوا ناچ رہا ہے۔ وہ چکرا کر دری پر گر جاتا۔ جس پر مسطر' اخبار' گوند اور دواتیں بکھری ہوتیں۔ وہ کئی کئی دن نہ نہا پاتا تھا۔ اس کے جسم پر میل کی پھٹی پھٹی سی تہیں جمی رہتی تھیں۔ جب لوگ اس سے نہانے کا مطالبہ کرتے تو وہ جھلا کر کہتا "سالے نہانے

کو سب کہتے ہیں۔ مگر یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ نہانے کا مطلب ہوتا ہے کپڑا، صابن، تیل۔"

اسے جو کچھ بھی پیسہ چھین جھپٹ کر ہاتھ لگ جاتا، ثروت کو بھیج دیتا۔ اس نے اپنی بیوی کو اپنے ڈاکٹر ہم زلف کے یہاں بھیج دیا تھا۔ وہ ان دنوں پاکستان میں تھی۔ وہ اسے پیسے بھجوانے کے لئے بے قرار رہتا تھا۔ کلکتہ میں اپنے ایک دوست کے ذریعے پاکستانی سکوں میں ہندوستانی سکے تبدیل کرواتا۔ اور اس طرح اس کی بیوی کا ہر ماہ ایک شکریے کا خط آجاتا اور اس کی جان میں جان آجاتی۔ ثروت اس کی قربانیوں کو سمجھتی ہے۔ اس کی مصیبت کو سمجھتی ہے۔ ثروت اس سے بے حد محبت کرتی ہے۔

وہ لکھتا۔۔۔ میری پیاری ثروت، زندگی کا یہ اندھیرا دور ہونے والا ہے۔ بہت جلد میں ایڈیٹر ہو جاؤں گا۔ میرا ایڈیٹر ہندوستانی سفارت خانے کے ساتھ ایران جانے والا ہے۔ اس کے بعد میں بھی کہیں باہر چلا جاؤں گا۔ تم میرے ساتھ ہو گی۔ پھر سمندر ہو گا۔ سمندر سے نکلتا ہوا نیا نیا سورج ہو گا۔ سروں پر گاتے ہوئے پرندے ہوں گے۔۔۔۔ گھبراؤ نہیں گھبراؤ نہیں۔۔۔۔ یہ دن ہمیشہ ہی ایسے نہیں رہیں گے۔۔۔۔ کبھی کے دن بڑے ہوتے ہیں۔ کبھی کی راتیں۔ نہیں سمجھیں۔۔۔ جاڑے کی راتیں بڑی ہوتی ہیں اور گرمی کے دن۔ یہی حال زندگی کا ہے۔۔۔

جاڑے کی راتیں بھی آئیں اور گرمی کے دن بھی۔ لیکن اس کے دن جیسے تھے ویسے ہی رہے۔ اس کی زندگی سکڑتی گئی۔ گھٹتی گئی۔ اس کے کپڑے میلے ہوتے گئے۔ ہوٹل کا قرض چڑھتا گیا۔ ہوٹل والے نے تو انتظار سے گھبرا کر اب سکریٹریٹ کا پھیرا لگانا شروع کر دیا تھا۔ دو مہینے وہ ٹال گیا تھا۔ لیکن اب کے ٹالنا مشکل تھا۔ اب کے تو اس نے انگلی ڈال کر تقے کروا ڈالنے کا عہد کر رکھا تھا۔

سبزی منڈی کے پاس ہی پہنچا تھا کہ زوروں کی بارش ہونے لگی۔ سامنے پٹرولیم میں موبل آئیل کے کنستروں پر اولے برسنے لگے۔ اور چھوٹے سے بنگلے کے سبز پارک میں برف روئی کی طرح بچھ گئی۔ معلوم ہوتا تھا کہ ہر طرف روئی دھن دھن کر اڑ رہی ہے۔ اس کی جیب میں پیسے بہت کم تھے۔ مشکل سے وہ واپسی کا ٹکٹ خرید سکتا تھا۔ اگر وہ تھوڑی دیر اور وہاں پر کھڑا رہتا تو یقیناً بھیگ جاتا۔ اس نے دوڑ کر سامنے کے پیراڈائز بار میں پناہ لی۔ وہاں یار خاں اس کے

مکان کا مالک کھڑا تھا۔ اس کی پتلی پتلی مونچھیں پھڑک رہی تھیں۔ اور وہ سگریٹ کے کش لگا رہا تھا۔ شاہد وہاں سے بچ کر نکل جانا چاہتا تھا۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں مکان کے کرائے کا تقاضا نہ کردے۔ کہیں کیا یہ تو یقین تھا۔

"کہاں شاہد صاحب' دفتر سے آرہے ہیں کیا؟" اس کے ہاتھ میں ایک بنڈل تھا جس میں ایک ریشمی ساڑی چمک رہی تھی۔

"آداب عرض ہے۔ جی ہاں! اف کتنی خوفناک بارش ہو رہی ہے۔ میں تو پانی سے بچنے کے لئے یہاں چلا آیا۔"

"آیئے اندر آجایئے۔ باہر کب تک کھڑے رہیں گے؟"

وہ دروازہ کھول کر اندر چلا گیا۔ دروازہ خود بخود اسپرنگ سے بند ہو گیا۔ اندر جتنے چہرے تھے۔ اس کے چہرے سے مختلف تھے۔ اس کے چہرے کی سی تھکن' اضمحلال' شکست اور گھبراہٹ کسی کے چہرے پر نہ تھی۔

ایک طرف کونے میں ایک سرخ میز خالی تھی۔ باہر بجلی چمکتی تھی تو شیشے کا رنگین دریچہ جھلک اٹھتا تھا۔ سگار' سگریٹ اور پائپ کے دھوئیں سے اندر کی نم آلود فضا بسی ہوئی تھی۔

میز پر بیٹھتے ہی یار خاں کا لہجہ بہت دوستانہ ہو گیا۔ وہ ایک ہی جست میں آپ سے تم پر اتر آیا۔
"کہو تو کیا پسند کرو گے؟"
"جی؟"
"کیا پیو گے؟" اور اس کی آنکھوں میں ایسی عیاش اور مکار چمک پیدا ہوئی کہ اس کی آنکھیں لومڑی کی آنکھوں کی طرح چمک اٹھیں۔

"میں نہیں پیتا۔" شاہد نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔
"بکواس" جب بیرا اس کے سامنے آکر جھکا تو اس نے کہا۔ "سولن وہسکی' ایک بوتل۔"

بیرا نے پہلے سولن کی بوتل کھولی' پھر دو گلاس لا کر رکھے۔ اور دو پلیٹ میں کباب۔ سوڈے کی بوتلیں پھک سے کھلیں اور بیرے دوسری طرف چلے گئے۔

یار خاں نے ہنستے ہوئے کہا "تم بہت تکلف کرتے ہو۔ بھئی پینے کے لئے ایک ساتھ بیٹھے ہیں تو فرق کیا ہے۔ پینے والوں کی ایک ذات ہوتی ہے۔"

ٹھیک اسی وقت دروازہ کھلا' ہوا کا ایک ٹھنڈا جھونکا اندر چلا آیا۔ شاہد کا پورا بدن کانپ گیا۔ کار کا دروازہ بند ہونے کی آواز آئی۔ بجلی چمکی اور اولے برسے۔ ایک کھدر پوش تنومند بابو جی اندر داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک اینگلو انڈین عورت تھی۔ اور پیچھے پیچھے ایک بڑا سا بھورے رنگ کا کتا تھا۔ جسے وہ عورت "ہلو ٹائیگر' ٹائیگر۔۔۔۔" کہتی ہوئی چمکارتی رہی۔ وہ کھدر پوش بابو جی کے ساتھ کیبن میں داخل ہو گئی اور کتا اپنی دم پر بیٹھ کر کاؤنٹر کی طرف دیکھنے لگا۔ جہاں آئینے کے پس منظر میں ایک بلند شوکیس میں طرح طرح کی شراب کی بوتلیں چمک رہی تھیں۔۔۔۔ فیشن پریڈ کی لڑکیوں کی طرح۔

یار خاں نے سنہری شراب گلاسوں میں انڈیلی۔ ماچس سے دونوں کی مقدار کا اندازہ لگایا۔ اپنی نیلی ٹائی کی گانٹھ کو چھو کر دیکھا۔ دور بیٹھی ہوئی چھوکریوں کے پاس بیٹھے ہوئے دو تین کالج کے لڑکوں کو دیکھا جو بڑے لوگوں کے سپوت تھے اور فضا کی رنگینی کا لطف اٹھا رہے تھے۔ اس نے شاہد کو گلاس اٹھانے کا اشارہ کیا۔ شاہد نے گلاس اٹھالیا۔ اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ شراب لرز رہی تھی۔ سوڈے کی وجہ سے اس کا رنگ ہلکا ہو گیا تھا۔ یار خاں نے اپنا گلاس اس کے گلاس سے ٹکرالیا۔۔۔۔ "سرما کی اس حسین شام کے نام" شاہد نے شراب کا گھونٹ پیٹ میں انڈیل لیا۔ اس کے جسم میں ایک تلخ سی حدت دوڑ گئی۔ وہ اپنے لب چوستے ہوئے یار خاں کو دیکھنے لگا جو اپنے سگریٹ کیس سے سگریٹ نکال رہا تھا۔

شاہد نے اس کے بارے میں بہت کچھ سن رکھا تھا۔ اس کی میخواری کا بڑا چرچا تھا۔ وہ روز شام کے بعد کسی نہ کسی بار میں پہنچ جاتا تھا اور کسی نہ کسی نئے آدمی کو پھانس لیتا تھا۔ اور اسے اپنی جیب سے شراب پلاتا تھا۔ جب سیر ہو جاتا تھا تو نشے میں اسے چھوڑ کر روانہ ہو جاتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ نئے آدمی کو نشے میں گالیاں دینے اور اس کی زندگی کا حال سننے اور سنانے میں بڑا مزا آتا ہے۔ پرانے لوگوں کے ساتھ شراب پینے سے شراب بھی بے مزا ہو جاتی ہے۔

دو تین گھونٹ حلق میں اترنے کے بعد شاہد کی سراسیمگی مٹنے لگی۔ اس نے آہستہ سے ہتھیلیاں

ملیں۔ آنکھیں جلدی جلدی جھپکائیں۔ جیسے اب کسی پرندے پر بندوق سے نشانہ باندھنے کا ارادہ کر رہا ہو۔ "لاؤ آج اس خناس مالک مکان کو بھی جھیل لوں اور اس طرح جھیلوں کہ یہ سالا بھی کیا یاد کرے گا۔"

"مجھے معلوم ہے کہ تم ایک شریف آدمی ہو۔ کئی بار میرے منشی نے تمہاری شکایت کی کہ تم وقت پر کرایہ نہیں دیتے۔ خیر یہ تو ایسی بات ہے جسے بار میں چھیڑنا غلط ہے۔ کیوں؟"

"آپ کا خیال درست ہے۔" شاہد نے جھلا کر اور ایک حد تک بیزار ہو کر کہا۔

"ہاہاہا۔ تمہاری بچی بہت شور مچاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اسے دودھ نہیں ملتا۔ تم ماما کیوں نہیں رکھ لیتے۔ لیکن جب تم کرایہ وقت پر نہیں دے سکتے تو پھر ۔۔۔۔ خیر چھوڑو۔"

شاہد کے کان جل اٹھے اور اس نے اپنے مفلر کو اتنی سختی سے مروڑنا شروع کیا کہ وہ اس کے لئے پھانسی کا پھندا بن گیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ سور مجھے چھیڑنا چاہتا ہے۔ ستانا چاہتا ہے۔ سمجھتا ہے اس طرح کچوکے لگا کر اپنا کرایہ وصول کرلے گا۔ بڑا خبیث ہے۔ ذلیل کرتا ہے۔ حالانکہ اب میں جس منزل پر ہوں وہاں ذلت اور عزت ایک ہی انڈے کے چھلکے میں زردی اور سفیدی کی طرح جذب ہو جاتی ہے۔ اس نے مسکراتے ہوئے گلاس اٹھایا اور ایک بڑا سا جلتا ہوا شراب کا گھونٹ مزا لے کر حلق کے پار اتار دیا۔ گلاس کو ہاتھ میں پکڑے گھورتا رہا۔ پھر مسکرایا اور پھر ایک گھونٹ حلق میں انڈیل لیا۔ یہاں تک کہ گلاس خالی ہو گیا۔ اس نے جھٹکے سے گلاس کو میز پر رکھ دیا۔ اتنے زور سے کہ یار خاں چونک گیا۔ اور قریب کی میزوں پر بیٹھے ہوئے کچھ لوگ بھی متوجہ ہو گئے۔

"شاہد تم آدمی سمجھ دار معلوم ہوتے ہو۔"

"یہ تو واقعہ ہے۔"

"بہت خوب۔"

شاہد نے چرچ مینس کے ٹین سے ایک سگریٹ نکالی' سلگائی اور رئیسانہ ٹھاٹ سے دھواں پھینکنے لگا۔ اور پھر خود پرست نظر سے اس نے یار خاں کو دیکھا کہ وہ بھی گھبرا گیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ خود یار خاں اس کی میز پر بیٹھا اس کی عطا کی ہوئی شراب پی رہا ہو۔

"اچھا بتاؤ تم کتنے اسٹیشن تک چلتے ہو۔"

"میں یہاں سے دہلی تک جا سکتا ہوں۔ یہاں سے لندن تک کتنے اسٹیشن ہیں۔ تم ہی بتاؤ' بتاؤ' ہاں بتاؤ' بڑے آدمی بنتے ہو' بنگلے میں رہتے ہو۔۔۔۔ ہو ہو یا' بس؟" وہ پورا گلاس پی گیا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوگئی تھیں اور ان میں نشاط انگیز چمک پیدا ہو گئی تھی۔

"میرا مطلب ہے تم کتنے پیگ پی سکتے ہو؟" یار خاں نے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں پوچھا۔

"تو پھر سیدھی طرح کیوں نہیں پوچھتے؟ کتنے اسٹیشن' کتنے اسٹیشن۔۔۔۔ تم پیگ کو اسٹیشن کہتے ہو۔ کچھ لوگ ایک پیگ کو ایک زینہ کہتے ہیں۔ اب پوچھو گے تم کتنے زینے چڑھ سکتے ہو۔ میں قطب مینار پر چڑھ سکتا ہوں۔۔۔۔ تمہارے سر پر چڑھ سکتا ہوں۔" وہ ایک پیگ اور چڑھا گیا۔ اب وہ خود ہی پٹیالہ پیگ بنا رہا تھا اور یار خاں کو پیچھے چھوڑتا ہوا پیتا چلا جا رہا تھا۔

یار خاں کا منہ لال ہو گیا۔ اس نے اپنے ہونٹ چبائے اور اردگرد نظر دوڑائی۔ بہت سے لوگ ان کی میز کی طرف متوجہ ہونے لگے تھے۔ مجمع میں ایک میز پر ایک حسین سی سکھ عورت فر کا لانگ کوٹ پہنے بیٹھی بیئر سپ کر رہی تھی اور سردار جی موج میں آکر قہقہہ لگاتے اور ایک آدھ دھول بڑے پیار سے اس کے کندھے پر جماتے۔ اس کا موٹا ہاتھ بلی کے روئیں کی طرح نرم کوٹ میں چھپ جاتا۔ پھر دونوں قہقہہ لگاتے۔

شاہد کو زور سے ہچکی آئی۔

"تم بہت پی گئے ہو۔ اب تم گھر چلے جاؤ۔"

"تم گھر جاؤ۔ میں تو ابھی اور پیوں گا۔ میں دہلی اسٹیشن تک جاؤں گا۔" شاہد نے میز پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

"بیکار بات ہے۔ اب مت پیو۔ میں سمجھتا تھا تم ڈھنگ کے آدمی ہو۔ تم شراب بھی ہضم نہیں کر سکتے۔"

"کیا کہا۔۔۔۔؟" اس نے اپنے کان پکڑ لئے "لو معافی مانگتا ہوں۔ اب گستاخی نہیں کروں گا۔ بس پینے دو مجھے۔۔۔۔ بس جینے دو مجھے۔" اس نے گانے کی سی آواز میں ایک ایک لفظ کو کھینچ کر ادا کیا۔

تھوڑی دیر شاہد بڑی متانت سے بیٹھا رہا۔ وہ خرگوش کی آنکھوں کی طرح اپنی سرخ آنکھوں کو

ادھر ادھر گھماتا رہا۔ دھوئیں سے بھرا ہوا ہال ٹھنڈا تھا۔ برف کے سے قہقہے' برف کے سے گلاس' برس کے سے سفید بیروں کے سائے۔ کھدر پوش بابو کا برف کی طرح خاموش ناٹیگر۔ سب کچھ برف تھا۔ شراب برف' بوتلیں برف' تمنائیں برف۔ برف حیات' برف موت ۔۔۔۔ صرف اسے اپنا وجود آتشیں معلوم ہو رہا تھا۔ وہ ہنسا اور گویا اس کی روح کا منہ توڑ کر لاوے پھوٹ رہے تھے۔ لیکن برف ہال کے باہر برس رہی تھی۔ اور برف ہال کے اندر جم رہی تھی۔

اب یار خاں سرور میں آ گیا تھا۔ یکایک اس کی گنگناہٹ ختم ہو گئی۔ اس کی آنکھیں مونچھوں کے اوپر سلگ اٹھی تھیں' اور باہر نکل آئی تھیں' اس نے بھی پورا گلاس حلق میں انڈیلتے ہوئے کہا۔

''اب کلپ کا وقت آ گیا ہے۔ رات پر اسرار ہو گئی ہے۔ خون چیخ رہا ہے۔ کیا چیخ رہا ہے۔۔۔۔ بتاؤ۔۔۔۔ بتاؤں۔۔۔۔ بتاؤں۔۔۔۔ عورت' عورت''۔۔۔۔ اس نے بوتل کی تہہ میں چمکتی ہوئی زیتون کے رنگ کی شراب اپنے گلاس میں انڈیل لی اور بغیر سوڈا ملائے اسے اپنے منہ سے لگا لیا۔

''شاہد تم سے ملاقات ہو گئی' اچھا ہوا۔ میں اکیلا نہیں پیتا۔ یہ میری شان کے خلاف ہے۔ لیکن عام طور پر مجھے اونچے درجے کے لوگ مل جاتے ہیں۔ تم ذلیل آدمی ہو۔ تمہارا لباس بھی ذلیل ہے۔ تم میرے مکان میں رہتے ہو۔ تمہاری تنخواہ کے میرے ملازم ہیں۔ تمہاری بیوی عشق لڑاتی ہے تو تمہاری روٹی چلتی ہے۔''

''چپ سور کے بچے۔ چپ' چپ'' شاہد کے منہ سے جھاگ نکلنے لگا۔ اس نے گلاس کو دبوچ لیا۔ یار خاں چپ ہو گیا۔ ''تم نے مجھے شراب پلائی ہے تو کیا تم گالیاں بکو گے؟''

یار خاں نے بیرے کو بلا کر دو گلاس رم کے منگائے اور شاہد سے کہا ''پی لو'' شاہد پی گیا۔ شاہد کی آنکھیں جھک گئیں۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''جانتے ہو شاہد' میرا بھتیجا ہی میرا منشی ہے۔ میں اس کی پرورش کر رہا ہوں۔ جاہل ہے' آوارہ ہے۔ خاندان کا شریف ہے۔ جیسے تم خاندان کے شریف ہو۔ پہلے تمہاری شکایت کرتا تھا۔ اب وہ شکایت نہیں کرتا۔ اور یہ بری بات ہے۔ سوال کرائے کا ہے۔''

"یار خاں تمہارا کرایہ تمہیں مل جائے گا۔ مگر مجھے گالی نہ دو۔ میری ثروت بہت پیاری عورت ہے۔ وہ گائے ہے' وہ شہد ہے۔۔۔۔اور اب میں جاتا ہوں۔ تم اپنے بھائی کو امریکہ بھیجنا چاہتے ہو بھیجو۔ تم تیسری جنگ کا انتظار کر رہے ہو کرو' تم نفع کمانا چاہتے ہو کماؤ۔ مجھے گالی نہ دو۔"

"بیٹھو بیٹھو۔۔۔۔یہ سب میرے بھتیجے نے بتایا ہو گا۔ الو کا پٹھا بہت حرامی ہے۔ لیکن اس میں حرج بھی کیا ہے۔ پچھلی لڑائی میں کتنے رئیس بن گئے۔ میں بھی۔۔۔۔"

"میں اب جاتا ہوں۔" شاہد کھڑا ہو گیا۔

جب وہ بھیگتا ہوا بس سے اتر کر گھر پہنچا تو اس کے گھر کا دروازہ بند تھا۔ اس نے آواز دے کر دروازہ کھلوایا۔ ثروت کی آنکھیں خواب سے بھری ہوئی تھیں۔ اس نے کھانا نہیں کھایا تھا۔ شاہد نے اپنی نشے سے بھری ہوئی آنکھوں سے اسے گھور کر دیکھا۔ ثروت یار خاں بہت برا آدمی ہے۔ وہ خبیث ہے۔ اس نے مجھے شراب پلائی ہے۔ میرا کوئی قصور نہیں۔ مجھے معاف کر دو۔" اس نے اپنا منہ ثروت کی گود میں ڈال دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

دیر تک چارپائی میں ثروت کے پاس لیٹا ہوا وہ اپنی زندگی کے بارے میں سوچتا رہا۔ وہ ثروت کے لئے ہی اپنی زندگی کی بلندی سے کود پڑا تھا۔ اس کے دوست' اس کے ساتھی' اس کی عملی سیاسی زندگی اس سے چھوٹ گئی تھی۔ وہ بڑا خطرناک زمانہ تھا۔ اس کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ تھا۔ وہ ایک اندھیری کوٹھری میں بند تھا۔ اسے مچھر کاٹے کھا رہے تھے۔ وہ بار بار موم بتی جلاتا تھا۔ اور کوئی ہوا کا تیز جھونکا آتا تھا اور موم بتی بجھ جاتی تھی۔ پولس مزدوروں کے علاقے میں دورے لگا رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے اور اس وقت اسے اپنی بیوی کے خیال نے آن دبوچا تھا۔ ثروت کی بڑی بڑی بیتاب پلکیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں۔ ابھی چند دن پہلے ہی جب وہ اس سے ملا تھا تو اس نے اس کے کان میں کہا تھا "آپ کچھ نہیں سمجھتے۔ آپ کچھ تو سمجھئے۔"

"کیا؟ کچھ کہو بھی تو۔ تم کہتیں تو کچھ نہیں اور مجھے کند ذہن کہتی ہو۔"

"کچھ پیسے جمع کر رکھئے۔ ہم تین ہونے والے ہیں۔"

شاہد کی سانسیں رک گئیں۔ اس نے ثروت کے گھنے بالوں کو اس کے چہرے پر بکھیر دیا تھا اور

بڑی سرگوشی کے سے انداز میں بولا تھا۔ "ہو جائے گا۔ سب ہو جائے گا۔"

شاہد کی زندگی کا سب سے بڑا حادثہ اس کا وہ جھوٹ تھا جو ثروت کے سامنے ایک خوبصورت زندگی کا عینی نقشہ کھینچتا چلا جاتا تھا۔ اس میں اس کی کبھی ہمت ہی نہ ہوئی کہ وہ اسے ان تمام تلخ حقیقتوں سے آگاہ کردے۔ بتادے کہ اس کے گھر کی چھتوں کی کبھی مرمت نہیں ہو گی۔ یہ چھتیں گر جائیں گی۔ کمرے برسات میں مٹی کے گھڑے کی طرح پگھل کر بہہ جائیں گے۔ چھتوں کی مرمت اس وقت تک نہیں ہو گی، جب تک کہ ایک نئی زندگی، کھیتوں میں، گاؤں میں، شہروں میں جنم نہ لے اور ابھی اس میں دیر تھی۔ ابھی ہزاروں چھتیں اور بیٹھنا تھیں۔ ابھی ہزاروں دل اور خون ہونا تھے۔ یہ سب اس کی زبان سے کبھی نہ نکلا۔ وہ ثروت کے گھر کے کھوکھلے، روایتی اور بے رنگ جاگیردارانہ ماحول میں اپنے آپ کو بے بس پاتا تھا۔ اس کا سارا شعور باہر کے لئے وقف تھا۔ وہ ثروت کے پاس پہنچ کر تیزی سے جھکتا تھا اور جھکتا چلا جاتا تھا۔

"آپ جب بڑی تنخواہ پانے لگیں گے تو بڑا اچھا رہے گا۔ ایک چھوٹا سا سفید مکان بنوائیں گے۔ باورچی خانے کا حصہ الگ ہو گا۔ جس کی چمنی سفید رنگ کی ہو گی۔ باغ میں جوہی، بیلا اور موتیا لگائیں گے۔"

"ضرور لگائیں گے اور میں پھول توڑ کر تمہارے بالوں میں لگاؤں گا۔ ایں؟" وہ چاندنی میں چمکتے، اونگھتے کسانوں کے جھونپڑوں کو دیکھتے ہوئے کہتا۔ الاؤ کی چمک اس کی سسرال کی پچھلی دیوار تک پہنچتی تھی۔

"ریڈیو کتنے داموں آتا ہے؟"

"ریڈیو۔۔۔۔ لاحول ولا۔۔۔۔ ریڈیو کی فکر نہ کرو۔ وہ آج کے ہر شریف گھر میں ہو گا۔ میں کوئی معمولی آدمی ہوں۔ میں بڑا انٹیلیکچوئل ہوں۔ لیکن تم انٹیلیکچوئل کے معنی نہیں جانتیں۔"

ثروت بمشکل خط لکھ سکتی تھی۔ وہ البتہ سو تک گنتی ضرور جانتی تھی۔ اس کا سارا جادو اس کی آنکھوں میں تھا۔ اس کے ہونٹوں کی خواب آور مسکراہٹوں میں تھا۔ جیسے کسی شاخ گل پر کوئی روپہلی چڑیا پر تول رہی ہو۔ جیسے بہار کی صبح گا رہی ہو۔ اس کی بے خودی نے شاہد کو ایسی تمناؤں کا شکار بنا دیا تھا جو اس کی موجودہ زندگی کبھی پوری نہیں کر سکتی تھی۔

شاہد اس جھونپڑی میں بیٹھا اپنے تمام وعدوں کو یاد کر رہا تھا جو اس نے شہد کے بلبلوں کی طرح ثروت کے کانوں میں ' اس کے خون میں اتار دئے تھے۔ جب دوبارہ موم بتی جلی تو اسے گپتا کی تیز تیر کی طرح آنکھوں سے بڑا ڈر معلوم ہوا۔ یہ کامریڈ اس طرح کیوں گھور رہا ہے۔

"کامریڈ! تم بہت گھبرا گئے ہو۔ روپوشی کا پہلا تجربہ ہے نا؟"

"ہاں!"

"ڈٹے رہو۔ سب خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی ہتھکڑی اور پھانسی کی بہت منزلیں آئیں گی۔ اس موڑ سے گزرنا مشکل ہے۔ لیکن گزر جاؤ گے تم۔ مجھے یقین ہے۔"

"آخر تم مجھے اتنی نصیحت کیوں کر رہے ہو؟"

"یونہی۔ اس لئے کہ میں اس کی ضرورت محسوس کر رہا ہوں۔"

وہ رات بھر نہیں سویا تھا۔ کروٹیں بدلتا رہا تھا۔ ثروت کی آنکھیں اسے پکار رہی تھیں۔ وہ اس کا گاؤں کا مکان جو اس کے سسر نے اپنے آقا کو زہر دے کر حاصل کیا تھا اور خود اس کی بیوی کو بیاہ لیا تھا۔ پھر بڑی خاصی زمینداری اس کی ہوگئی تھی۔ اس کے زمیندار سسر کے چہرے پر ہمیشہ محرم کی دسویں تاریخ لکھی رہتی تھی اور یہ کیلنڈر کبھی نہیں بدلتا تھا۔ وہ ثروت کو اپنی قہر بھری نظروں سے دیکھ رہا ہوگا۔ ثروت اس پر بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتی تھی اور وہ اس کٹیا میں بند تھا۔ اس کے پرانے مکان کی چھت پر ثروت بال کھولے کھڑی تھی۔ چاند بادلوں میں تیر رہا تھا۔ اور اس کے پیٹ میں خون ایک زندگی کی گردش کھا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور وہ اسے پکار رہی تھی۔ اور وہ اس اندھیری کٹیا میں بند تھا۔ جہاں موم بتی جلتی تھی اور بجھ جاتی تھی۔ جہاں گپتا اسے نصیحت کر رہا تھا اور اس کی ہمت بڑھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا کیوں کہ وہ جانتا تھا کہ اس کی ہمت تنکے کی طرح ثروت کے آنسوؤں میں بہتی چلی جا رہی تھی۔

شاہد صبح سویرے کٹیا سے غائب ہو گیا۔ گپتا گرفتار ہو گیا اور اس کے گھر پر جاسوسوں کی آمد و رفت بے تکلف شروع ہو گئی۔ اس کا رشتہ ' اس کے پیارے اصولوں سے ' قربانیوں سے ' ساتھیوں سے کٹ گیا اور وہ زندگی سے بھاگ کر ثروت کی آغوش میں چھپ گیا۔

اس رات کو جب یار خاں کے پاس سے شراب پی کر آیا اور ثروت کے پاس لیٹ گیا تو وہ دیر تک

نیند سے محروم رہا۔ زندگی کے واقعات اس کے سینے میں چبھتے رہے اور اسے ایسا لگا کہ اس کے سینے سے ثروت نہیں لگی تھی۔ بلکہ اس کی شکست کا کانٹا تھا جو اندر اور اندر چبھتا چلا جا رہا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ ثروت بھی اس کی وحشت سے ڈر رہی تھی۔ وہ بھی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"تم ڈر رہی ہو۔ آج یار خان نے مجھے گالی دی ہے۔ میں اس کی کھال ادھیڑ دوں گا۔"

"تم سو جاؤ، تم نے بہت پی لی ہے۔"

"ہاں میں سو جاؤں گا۔ تم بھی سو جاؤ۔ منی بھی سو رہی گی۔ ساری دنیا سو رہی گی۔ سالا یار خاں جاگتا رہے گا۔ اس نے مجھے شراب دی۔۔۔۔ اس نے مجھے گالی دی۔ اس کی ایسی تیسی۔۔۔۔ تمہاری ایسی تیسی۔" تھوڑی دیر تک وہ اسی طرح بکتا رہا اور پھر سو گیا۔

جب اس کی آنکھیں دوبارہ کھلیں تو پیپل کی پھننگ پر میلی دھوپ اپنے اجلے پر سکھاتی ہوئی نظر آئی۔ اس کے منہ میں ابھی تک جلی ہوئی پیاز اور سڑے ہوئے سرکے کا مزا باقی تھا۔ اس نے ذرا منہ بگاڑ کر ایک انگڑائی لی۔ کمرے کے باہر سے کسی کے بات کرنے کی آواز آ رہی تھی۔ ثروت کا قہقہہ آہستہ سے گونجا۔ اس نے آنکھیں کھولیں۔ سلاخوں سے گھری ہوئی چھت کی طرف دیکھا۔ چولھے سے ہلکا ہلکا دھواں نکل رہا تھا۔ کبھی آنچ لہرا کر نکلتی تھی۔ دھوئیں کے لچھوں میں سونا سا گھلتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

ثروت چولھے کے پاس سے اٹھی اور رات کا بھیگا ہوا شاہد کا پاجامہ نچوڑنے لگی۔ اس کی آستین اوپر چڑھی ہوئی تھی۔ اور اس کی پتلی کلائی میں چوڑیاں چھنک رہی تھیں۔ چوڑیاں دھانی رنگ کی تھیں اور نئی ہونے کی وجہ سے چمک رہی تھیں۔ جب دوبارہ کسی کے بولنے کی آواز آئی تو شاہد باہر نکل آیا۔ یار خاں کا منشی اسٹول پر بیٹھا کش لگا رہا تھا۔

"کیوں شاہد صاحب، کب تک کرائے کا انتظار کرائیں گے آپ؟"

"اب زیادہ انتظار نہیں کرنا ہوگا۔ اطمینان رکھئے۔"

"یار خاں نے آج صبح ہی صبح ٹوکا تو میں چلا آیا۔ مجھ سے آپ کی بیوی کی تکلیف نہیں دیکھی جاتی۔"

"تکلیف وکلیف چھوڑیے۔ آج ہی تنخواہ ملے گی اور آج ہی آپ کا حساب صاف ہو جائے گا۔

کہہ دیجئے گا یار خاں سے۔ ہاں۔۔۔۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔ بڑے زور پر ہے مزاج۔ اچھا بھائی یہی سہی۔" جاتے جاتے منشی نے ایک خاص نظر سے اپنے کالروں کو اوپر کھینچتے ہوئے اور پتلون کی کریز سیدھی کرتے ہوئے ثروت کی طرف دیکھا۔

جب منشی چلا گیا تو ثروت نے طیش میں آکر کہا۔ "آپ کرائے کے پیسے بھی ادا نہیں کرتے اور اوپر سے رعب گانٹھتے ہیں۔ آپ چاہتے ہیں کہ منی کو لے کر میں سڑک پر ماری ماری پھروں۔"
"کیا مطلب؟۔۔۔۔ اچھا تو یہ بات ہے؟"

اب جو اس نے اپنا حلیہ دیکھا تو شرما گیا۔ وہ اپنی بیوی کا پٹی کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ وہ جلدی سے کمرے میں گیا اور سوٹ کیس میں اپنے کپڑے تلاش کرنے لگا۔ اس کا پھٹا ہوا پاجامہ نکل آیا۔ ساتھ ہی اس کے ایک نیا دوپٹہ' ایک خوبصورت سی ریشمی شلوار اور جمپر بھی سلا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھ سے پاجامہ گر گیا۔ وہ ان اجنبی کپڑوں کو دیکھتا رہا۔ پھر اس نے دریچے سے باہر بھیگی ہوئی دیواروں کو دیکھا۔ چھوٹے چھوٹے غریب اور گھٹے ہوئے مکانوں کو' اور اس کے آگے یار خاں کے بڑے سے مکان کو جس کی کھڑکیوں پر نیلے دھاری دار پردے ہل رہے تھے اور اس کے باغ میں پھولوں کے نہ جانے کتنے کنول جل اٹھے تھے۔

وہ خاموشی سے اپنے کمرے سے نکلا۔ سر جھکائے ہوئے اس نے کھانا کھایا۔ جب جانے لگا تو ثروت نے کہا۔ "آج آلو اور چاول ختم ہے۔ تنخواہ کے روپے میں سے منی کا گرم کپڑا ضرور لیتے آیئے گا۔"
"کہاں سے آنا چاہئے گرم کپڑا؟"
"بازار سے اور کہاں سے؟"
"اور کرایہ کہاں سے دیا جائے گا؟"

وہ جب اپنی سڑک کے موڑ پر پہنچا تو اس کی ملاقات گپتا سے ہو گئی۔ وہ بہت دبلا اور کالا ہو گیا تھا' وہ اسی طرح مسکرا رہا تھا۔ وہ بیڑی پئے جا رہا تھا۔
"کیوں شاہد صاحب' اب تم کیسے ہو؟ تمہارے بارے میں میں نے بہت بری بری خبریں سنی

ہیں۔"

شاہد کی آنکھیں جھکی جا رہی تھیں اور صرف کھسیانی سی ہنسی ہنسے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد گپتا کسان سبھا کے دفتر میں چلا گیا۔ جاتے ہوئے اس نے شاہد کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور کہتا چلا گیا۔۔۔۔ "شاہد انسان کمزور ہو کر زندہ نہیں رہ سکتا۔ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ تم ہار گئے۔ میں جیل سے ہو آیا۔ زندہ ہوں۔ تم جیل سے باہر ہو۔۔۔۔ میں نہیں جانتا تم اپنے آپ کو زندہ محسوس کرتے ہو۔ کیا تمہارے مسئلے حل ہو گئے؟ تم خوش ہو؟ اچھے ہو؟"

شاہد ایک مجرم کی طرح سر جھکائے ہوئے آگے چلا گیا۔ اس دن بار بار اس کے ذہن میں گپتا کا کالا' طنز کرتا ہوا' بیڑی کا دھواں پھینکتا ہوا چہرہ ابھرتا ڈوبتا رہا۔

شام کے وقت اسے تنخواہ ملی۔ اس کے ساتھ ہی اسے سپرنٹنڈنٹ کا وارننگ لیٹر ملا۔ ایک مہینہ اور موقع دیا جاتا ہے۔ اگر کام میں ترقی نہیں ہو سکی تو تمہارا شمار ان لوگوں میں ہو گا جو چھٹنی کی فہرست میں ہیں۔

ہوٹل کا مالک بھوت کی طرح آ موجود ہوا۔ اس نے بہت جل دینا چاہا' لیکن وہ پیچھے لگا رہا۔ یہاں تک کہ وہ آخر پچھلے دروازے سے ہو کر نکل بھاگا۔ دوڑ کر رکشا پر بیٹھا اور اسٹیشن کی راہ لی۔ گاڑی چلنے ہی والی تھی کہ ہوٹل کا مالک ڈبے میں داخل ہو گیا اور اسے کھینچ کر باہر نکال لایا۔

"شرافت سے روپے دے دو' چکما دیتے ہو۔ شریف بنتے ہو۔ آج میں چھٹی کا دودھ اگلوا دوں گا۔"

اور جب شاہد نے اپنی جیب سے چالیس روپے نکال کر اس کی ہتھیلی پر رکھے تو واقعی اسے محسوس ہوا کہ اس نے چھٹی کا دودھ اگل دیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں تیزاب سا ابھر گیا تھا۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا اپنے ڈبے میں واپس آیا۔ تماشائیوں کی آنکھیں اسے ملامت کرتی ہوئی نظر آئیں۔ آنکھیں اس کے چاروں طرف ناچ رہی تھیں۔ لیکن ایک آنکھ سے بھی ہمدردی کا نور نہیں چھن رہا تھا۔ انسان انسان کی ذلتوں' غلاظتوں اور پسپائیوں سے اپنے لئے کتنی تسکین پیدا کر لیتا ہے۔ وہ گھبرا کر ڈبے سے اتر گیا۔ گاڑی چل دی۔ چھک چھک۔ اور اسے

معلوم ہوا کہ اس کے ہاتھوں سے دس دس کے نوٹ اڑے چلے جا رہے تھے۔ چھک چھک۔ اور مسافر جو چلے گئے تھے وہ بھی کمینے تھے۔ شام ہو گئی تھی۔ اس کے دل سے غم اور اداسی کے سیاہ سوتے پھوٹ رہے تھے۔ جیسے رات کا میل اس کی آنکھوں میں جل رہا ہو۔ اس کی روح میں ٹپک رہا ہو۔

جب اندھیرا ہو گیا تو پھر گزشتہ شام کی طرح اسی بار میں گھس گیا۔۔۔۔ پیراڈائز بار جس کے دروازے پر اردلی بیٹھا ہوا تھا۔ اور جس کے لمبے سفید کوٹ میں پیتل کے بٹن چمک رہے تھے۔

اس نے اپنی جیب سے روپے نکالے۔۔۔۔ تریسٹھ روپے۔ اس نے اردگرد نظریں نچائیں۔ بار بھرا ہوا تھا۔ کھچا کھچ۔ فضا صاف تھی۔ کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ اور آسمان ننگا نظر آ رہا تھا۔ ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ کاریں گزر رہی تھیں اور دور امپیریل بینک کی عالی شان عمارت کے پیچھے چاند سونے کی روٹی کی طرح تھرتھرا رہا تھا۔ اور ایروڈروم سے فلیش لائٹ کی شعاعیں گندگی جھاڑو کی طرح آسمان کا منہ جھاڑنے کے لئے اٹھتی تھیں۔ لپکتی تھیں اور ناچتی تھیں۔

"بیرا آج میں سب سے قیمتی شراب پیوں گا۔ اسکاچ ہے؟"

بیرا نے سر ہلاتے ہوئے اپنے دانت نکال دیئے۔

اس نے اسکاچ کو گلاس میں انڈیلا۔ سوڈا ملایا۔ چاروں طرف دیکھا۔ دل میں زور سے چیخا۔ "دیکھ یار خاں کے بچے 'عیش کرنے والے کس طرح عیش کرتے ہیں۔" اور جب شراب کا سونا طلوع ہوتے ہوئے سورج کے کرنوں کی طرح اس کے پیٹ میں اتر گیا تو اس نے بیرے کو قریب بلایا۔ "انڈے لاؤ۔ ہاف فرائیڈ۔۔۔۔"

جب بیرا انڈے لے کر آیا تو وہ اپنا گلاس خالی کر چکا تھا۔ اس نے دل میں کہا۔ "اسکاچ شراب صبح کی طرح سبک 'عورت کے سینے کی طرح گرم اور حسین ہوتی ہے۔"

"بھئی مجھے لوہے کا پرمٹ مل گیا ہے۔"

"تمہاری گیتا تو غضب کرتی ہے۔ ٹینس میں اس کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا۔"

"تم شادی کیوں نہیں کر لیتے؟"

"میں ایک کا ہو کر نہیں رہ سکتا۔"
"ڈارلنگ کشمیر کب چلیں گے۔ دہلی سے ایر لفٹ اچھا رہے گا۔"
"دیکھو وہ لونڈیا کی کمر ہے یا بید مجنوں۔"
"تم گھانس کھا گئے ہو۔ ارے یہ تو مصنوعی کمر ہے۔ اصلی کمر تو وہ گھر چھوڑ آئی ہے۔"
"اور تم اپنی عقل نیلام گھر میں چھوڑ آئے ہو بیٹا۔"
"دیکھو سالا کیا پھٹے حال میں ہے۔ چہرے پر پھٹکار ہے مگر اسکاچ سپ کر رہا ہے۔ ہو گا یار کوئی پاکٹ مار۔"
وہ ان جملوں کی آندھی میں تناور درخت کی طرح جھومتا رہا۔ گلاس پر گلاس خالی ہوتے رہے۔
"بیرا یار خاں آئے تو اسے دھکے دے کر نکال دو۔ اس سے کہو کہ اس کا باپ آج اسکاچ پی رہا ہے۔ کل اس نے مجھے گالی دی تھی۔ آج میں اسے ٹھیک کروں گا۔"

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور میز پر کھڑا ہو گیا۔ ڈر کر اور دوسرے لوگوں نے اپنے گلاسوں کو ہاتھ میں لے لیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔
"اے اس کو نکالو۔ اس کورو کو۔ بھگاؤ۔"
"مجھے کوئی نہیں بھگا سکتا۔ مو جھے کوئی نائی بھاگا سکتا۔ سیاں بھئے کوتوال" وہ گانے لگا۔

ایک لڑکی نے اپنے عاشق کے کان میں کہا۔۔۔۔ "سینک"

بیروں نے اسے آکر سمجھایا۔ لیکن وہ مگن تھا۔ اس کی بکواس جاری تھی۔ "میں یار خاں سے انتقام لوں گا۔ میں سپرنٹنڈنٹ کو زینوں پر سے دھکیل دوں گا۔ میں کرایہ نہیں دوں گا۔ میں ثروت کو۔۔۔۔۔ میں ثاروت" اس کی زبان لڑکھڑا گئی اور منہ سے کف نکلنے لگا۔

بیروں نے اسے بار سے باہر دھکیل دیا۔ اس کی جیب سے پیسے نکال کر اپنے بل کا حساب چکایا۔ اور اسے رکشا پر بیٹھا کر چلتا کیا۔ شاہد کی ہچکیاں جاری تھیں اور وہ بکے جا رہا تھا۔

"لے لو سب لے لو۔ میری ساری دولت لے لو۔ ہوٹل والے کی ایسی تیسی' یار خاں کی ایسی تیسی۔ اس کے منشی کی ایسی تیسی۔۔۔۔۔"

جب وہ نشے کے عالم میں گرتا پڑتا، کیچڑ میں لتھڑتا اپنی گلی کے موڑ پر پہنچا تو اس کی ٹکر ایک سائیکل سے ہوگئی اور وہ گر گیا۔ کسان سبھا کے آفس سے نکل کر گپتا نے اسے اٹھایا۔۔۔

اس نے لیمپ کی روشنی میں ایک آنکھ مشکل سے کھول کر گپتا کو دیکھا۔۔۔ اس کے دماغ میں بم سے پھٹنے لگے اور اس سے اپنے آپ کو چھڑا کر وہ اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ "گپتا تم زندہ ہو۔ میں مر گیا ہوں۔ میں مر گیا ہوں۔ مجھے اب کوئی نہیں بچا سکتا۔۔۔"

وہ اندھیری گلی میں گرتا پڑتا لڑکھڑاتا ڈگمگاتا اپنے مکان سے قریب ہو رہا تھا۔ گپتا کا دبلا پتلا چہرہ اس کی آنکھوں میں انگارے کی طرح جل رہا تھا۔ "میں نے تمہیں جیل بھجوا دیا۔ میں نے اپنے ضمیر کو مار ڈالا۔ میں۔ میں۔"

"ارے شاہد میاں۔۔۔ یہ کیا حال ہے۔ میں تو کرایہ لینے آیا تھا اور تمہارا منہ تو بھٹی کی طرح مہک رہا ہے۔۔۔ جاؤ جاؤ ثروت تمہارا انتظار کر رہی ہے۔" منشی جلدی جلدی ناک پر رومال ملتا ہوا یار خاں کے مکان کی طرف چلا گیا۔

وہ ہانپتا ہوا زینے پر چڑھا۔ اور کمرے کے دروازے پر کھڑا رہا۔ پھر اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ہوائی اڈے کی طرح فلیش لائٹ چمک رہی تھی۔ ستارے جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ چاند سونے کی روٹی معلوم ہوتا تھا۔

ثروت لیمپ کی دھیمی روشنی میں آنکھیں بند کئے پڑی تھی۔ لیمپ کی ٹوٹی ہوئی چمنی سے دھوئیں کا ایک تار اوپر اٹھ رہا تھا۔ کروسن تیل کی بو کمرے میں بسی ہوئی تھی۔

"کتنا بھیانک کمرہ ہے یہ"۔ شاہد زور سے گرجا۔ کونے کے پاس تھر تھراتے ہوئے جالے والی دیوار سے چمگادڑ سے ٹکرایا۔ شاہد نے زور سے ہاتھ بڑھایا۔ لحاف کھینچ لیا۔ منی صرف بنیان پہنے سوئی ہوئی تھی۔ ثروت صرف پیٹی کوٹ پہنے پڑی ہوئی تھی۔ اس نے پھر بھی آہستہ سے آنکھیں کھولیں۔ شاہد کو اس کے گھلتے ہوئے جسم پر بہت رحم آیا۔ اس کا جسم کبھی کتنا تندرست تھا۔ اس کے ہونٹ کیسے صحت مند تھے۔ سنترے کی پھانک کی طرح۔ اور آج۔۔۔ اسی کے لئے اس نے کیا نہیں کیا تھا۔ اسے اچانک یار خاں یاد آیا۔ منشی اور پھر گپتا کا

مسکراتا ہوا چہرہ رحم اور طنز سے بھرا ہوا۔

"ثروت۔۔۔۔" وہ اتنے زور سے چیخا کہ کمرہ گونج اٹھا۔

ثروت اٹھ کر بیٹھ گئی۔ "آج پھر شراب پی لی ہے کیا؟"

"ہاں پی ہے۔ اپنی پی ہے۔ تمہارے باپ کی نہیں پی ہے۔" ثروت سہم گئی۔ ڈرو نہیں میں آج بے حد خوش ہوں۔ آج پہلی بار میں تمہیں سچ بتاؤں گا۔ دیکھو میں تمہیں ریڈیو نہیں دے سکتا۔ میں تمہیں سلکن سوٹ نہیں دے سکتا۔۔۔۔!!! میں تو تمہیں اس ماہ کی تنخواہ بھی نہیں دے سکتا۔" ہچکی لیتے ہوئے اس نے چند آنے پیسے اس کی گود میں پھینک دیے۔

"آپ نے کیا کیا؟ اب ہمارا کیا ہو گا؟"

"روؤ نہیں۔ میں وحشی نہیں ہوں۔ میں تمہاری گردن نہیں دباؤں گا۔ اسی گردن کے لئے تو ۔۔۔۔" اس نے اپنی انگلی سے اس کی گردن کو چھوا۔ اور ایک خباثت سے بھری ہوئی ہنسی ہنسا۔

"خدا کے لئے۔۔۔۔" ثروت گڑگڑائی۔

"خدا تمہارا دیکھو اس بڑے مکان میں رہتا ہے نا؟ وہ اس وقت کسی رنڈی کے ساتھ سویا ہوا ہو گا۔ ہے نا؟"

اسے زور سے ہچکی آئی اور ایک زبردست ابکائی کے ساتھ اس نے سب کچھ ثروت کی گود میں اگلنا شروع کر دیا۔ ثروت بت بنی بیٹھی رہی۔ اس کا تو جیسے دم ہی نکل گیا تھا۔

"تم سمجھتی ہو میں نشے میں ہوں۔ بالکل نہیں۔" وہ چارپائی پر پڑی ہوئی منی کو دیکھتے ہوئے بولا۔ "میں اب کچھ نہیں کہوں گا۔ اب میں شراب پیوں گا' تم اپنے راستے پر چلتی رہو' منشی سالا کبھی کرایہ نہیں مانگے گا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب۔۔۔۔ تم پرسوں صبح کے شو میں ریشمی سوٹ پہن کر گئی تھیں یا نہیں۔ وہاں سے تم دریا کی سیر کو گئی تھیں۔۔۔۔ غلط؟ ڈرو نہیں۔ میں تم سے سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں۔۔۔۔"

وہ چپ ہو گیا۔ اور جھومتا رہا۔ "گپتا نے ٹھیک کہا تھا۔ چٹان جب ایک بار پہاڑ کی چوٹی سے پھسلتی ہے تو کوئی نہیں جانتا۔"

ثروت اٹھ کھڑی ہوئی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا وہ وہاں سے بھاگ نکلے گی۔ شاہد نے سوٹ کیس سے ریشمی شلوار اور جمپر نکال کر زمین پر پھینک دیا اور دوپٹہ خود اوڑھ کر ناچنے لگا۔ ناچتے ناچتے رکا۔ ثروت کو اپنے سینے سے چمٹایا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو نکل رہے تھے۔

"ثروت 'میری جان۔۔۔۔ چٹان کو لڑھکنے دو۔ مجھے سمجھوتہ پسند ہے۔"

اتنا کہہ کر وہ آندھی میں اکھڑے ہوئے درخت کی طرح چارپائی پر گر پڑا۔ منی جاگ گئی اور زور زور سے رونے لگی۔

○

اونگھتی ڈیوڑھی، جاگتے کھیت

"پریگوا۔۔۔اے پریگوا"

بوڑھے قاضی کے دانت سردی میں کٹکٹا رہے تھے۔ وہ جھریوں کے آبنوسی جال میں پھنسے ہوئے اپنے دونوں ہاتھوں کو جلدی جلدی رگڑ رہا تھا۔ اس پھرتی سے صرف حجام ہی اپنے استرے کو چمڑے کی پٹی پر پھیرتا ہے۔ اس کی ناک اور منہ سے بھاپ نکل رہی تھی۔ صبح ٹھٹھری ہوئی تھی اور آہستہ آہستہ کانپ رہی تھی۔ دور درختوں کے نقوش دھند میں لپٹے ہوئے سادھوؤں کی طرح دکھائی دے رہے تھے جو آہستہ آہستہ چرس کے کش لگا رہے ہوں۔ بوڑھا قاضی ان ساکت اور سکڑے ہوئے سادھوؤں کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ابھی ابھی اپنے دو موٹے موٹے کمبلوں کی نرم سرنگ سے باہر نکلا تھا اور اپنے سائیس پریاگ کو پکار رہا تھا۔ دھند سمندر کی جھاگ بن کر اٹھ رہی تھی اور اس کی بوڑھی کھنکھارتی ہوئی آواز کو جذب کر رہی تھی۔ سامنے کھلیان میں اب تک الاؤ کی بے جان چنگاریاں اڑتی ہوئی نظر آتی تھیں۔ چنگاریوں کے پیچھے دھواں لپکتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی جھٹکے سے الاؤ کو کرید رہا ہے۔ آہستہ آہستہ چنگاریاں دھند میں پگھلنے لگیں۔

"پریگوا۔۔۔ا۔۔۔اہو پریگوا۔۔۔ہواؤ۔۔۔او۔۔۔او۔۔۔" براہیل نے قاضی کی آواز سنی اور پیال میں اپنی ٹانگیں پھیلائے اور ایک ذرا سر کو اوپر اٹھاتے ہوئے (جیسے کوئی سہمی ہوئی چڑیا گھونسلے سے سر نکال کر جھانک رہی ہو اور آنکھیں ٹمٹاتی ہوئی ہوا کے زوردار وحشی تھپیڑوں کا اندازہ لگا رہی ہو) ایک زوردار ہانک لگائی۔ اس کی بھرائی ہوئی تیکھی اور گرجدار آواز سنسناتی ہوئی گولی کی طرح خاموش ہواؤں کو چیرتی ہوئی گگن سے جا ٹکرائی۔

پر یگوا کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ کوئی جواب نہ ملا۔ پکار کی آواز دور دور تک رینگتی چلی گئی۔ لیکن پر یگوا کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔

پر یگوا کا نام صرف پریاگ تھا۔ لیکن اس کے نام کو پر یگوا پکارا جاتا تھا۔ اس "وا" کا اضافہ اب اس کے نام کا ضروری جزو بن گیا تھا۔ وہ ایک کمیرا تھا۔ اس لئے زمیندار سے لے کر براہیل تک سب اپنے تحکم کا سکہ چلانے کے لئے اس کے نام کو مسخ کر کے پر یگوا کہا کرتے تھے۔ پر یگوا کو بھی کوئی خاص اعتراض نہیں تھا۔ وہ اتنا جانتا تھا کہ ماں بھی پر یگوا کہتی تھی اور قاضی بھی۔ فرق اتنا تھا کہ ایک طرف پیار کی کشش اور چاشنی تھی اور دوسری طرف ملکیت کا رعب اور دبدبہ۔

وہ اس وقت اصطبل کی چوکھٹ پر بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ اگر دھان کی اس پونچ سے دس بیس پیلی پیلی گانٹھیں اٹھا کر لے جائی جائیں تو اس کے گھر میں کچھ چاول تو ہو ہی جائے گا۔ شاید اس کے بعد اس کا باپ ایڑیاں رگڑنا چھوڑ دے اور اس کی سوتیلی ماں اسے نکھٹو کہنا کچھ دنوں کے لئے بھول جائے۔ وہ اپنے خیال میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ قاضی کی پکار اور براہیل کی گرج دار ہانک اسے بغیر چونکائے ہوئے گزر گئی۔ اس وقت گھوڑے کی لید کی بدبو اس کے نتھنوں میں گھس رہی تھی اور وہ چاول کی خوشبو سونگھنے کے لئے بے قرار تھا۔۔۔ وہ بار بار دھان کے کٹے ہوئے کھیتوں کو دیکھتا اور پھر دھان کے کھلیان کو' جہاں گاؤں بھر کے خون پسینے کے پھل پھول اسیر تھے۔ اسے پچھلی شام کو ہی معلوم ہو گیا تھا کہ سرکار ایک ضروری مقدمے کی پیروی کے لئے اگلی صبح شہر جانے والے تھے۔ سائیس کے فرائض انجام دینے کے علاوہ صبح سویرے جب پورب میں ابھی ہلکی ہلکی سرخی بھی ابھر نہیں پائی تھی کہ اسے روزانہ بوڑھے قاضی کے لئے دو منکوں میں کنوئیں سے پانی لانا پڑتا تھا۔ تازہ تازہ پانی سے نہا کر بوڑھا قاضی بہت خوش ہوتا تھا اور دن بھر خوش رہنے کی کوشش کرتا تھا۔ لیکن اس کا غصہ کیا اور اس کی خوشی کیا۔ اس کا رنج کیا اور اس کی سرخوشی کیا۔ دونوں کا درمیانی فاصلہ بس اتنا ہی تھا۔ جتنا فاصلہ ایک ہی چھکڑے میں جتے ہوئے دو بیلوں کے درمیان ہوتا ہے اور اس کا روایتی جاگیردارانہ مزاج مکھی کی طرح ایک بیل سے اڑ کر آن واحد میں دوسرے بیل کے سینگ پر آجمتا تھا۔

جیتا سنگھ برا ہیل اس کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔
"کیوں جیتا سنگھ ــــ حرامزادہ پریگوا کہاں مر گیا؟"
"ابھی دیکھتا ہوں سرکار ــــ ہاں ابھی ابھی سرکار" برا ہیل جیتا سنگھ اپنے بھاری بھاری بے ڈھنگے قدموں کو پٹکتا اور بڑبڑاتا اصطبل کی طرف اس طرح دوڑ پڑا جیسے کسی کنویں میں گرتے ہوئے بچے کی چیخ سن کر اسے نکالنے کے لئے بھاگا جا رہا ہو۔

بوڑھا قاضی لمبی لمبی سانس لیتے ہوئے کھپریل کے سامنے چبوترے کے پاس اپنے دونوں ہاتھ پیچھے کمر پر جوڑتے ہوئے ٹہلتا رہا۔ سرد برفیلی ہوائیں آتیں اور اس کے بدن میں ایک جھرجھری سی پیدا کر دیتیں۔ اور وہ ڈگمگا جاتا۔ وہ بار بار اپنی مٹھی دوسرے ہاتھ کی ہتھیلی پر مار رہا تھا۔

وہ پتلے پائچوں والا کھدر کا پاجامہ پہنے ہوئے تھا۔ اس کی کاٹ شرعی تھی۔ اس کا کرتا بھی سفید کھدر کا ہی تھا اور وہ اس وقت ہلکی ہلکی دھند میں پہاڑی سے دور وادی میں برف سے ڈھکی ہوئی اکیلی چٹان نظر آ رہا تھا۔ کھدر کے کرتے پر اس نے ایک روئی کی گدلی مرزئی پہن رکھی تھی۔ اس کا رنگ بھی سفید تھا۔ پرانے ڈیزائن کی عینک پر پھپھوندی اُگ آئی تھی۔ وہ بار بار اپنی عینک اتارتا' کرتے کے دامن سے عینک کے شیشے کو صاف کرتا اور دانت کٹکٹاتے ہوئے پھر اسے اپنے کانوں سے لگالیتا۔ جب اس کے ہاتھ 'جن پر پتلی پتلی رگیں ابھری ہوئی تھیں اور جو برگد کے تنوں کی طرح نظر آتی تھیں' کان سے قریب ہوتے تو ان کا ارتعاش بہت نمایاں ہو جاتا۔ سردی کا اثر کم کرنے کے لئے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو رگڑنا شروع کر دیا' لیکن اس کے جسم میں سردی کی تکلیف دہ برقی گدگدی سی دوڑ جاتی اور اس طرح اس کی روح میں ٹھنڈک کی تہیں موٹی سی ہوتی چلی گئیں۔ اسے ایسا محسوس ہوا کہ برقی بلب کے فیوز تاروں کو جلانے کے لئے بٹن کتنے ہی زور اور خلوص سے کیوں نہ دبائے جائیں اس میں جان پیدا نہیں ہو سکتی۔

"سرکار ــــ یہ رہا پریگوا" برا ہیل نے دونوں ہاتھ باندھ کر ہانپتے ہوئے اعلان کیا۔
"کہاں تھا تو؟"
"اصطبل میں"۔

"گدھا کہیں کا۔۔۔۔ اصطبل میں کیوں تھا۔۔۔۔ اور مجھے پانی لا کر کون دے گا۔۔۔۔ تیرا باپ؟"

قاضی کو غصہ آ رہا تھا۔ اس کی بڑی بڑی زرد اور سرخی مائل آنکھیں نکلی پڑ رہی تھیں۔ ایسے موقع پر جذباتی اور اعصابی تشنج سے ان کی کنپٹیوں کی رگیں ابھر آتی تھیں اور ان میں سے انگلیوں کے چٹخنے کی سی آوازیں پیدا ہونے لگتی تھیں۔ اس نے اپنے بائیں پیر سے جس میں اگزیما کی وجہ سے ایک کھردری سی کھال ابھری ابھری نظر آ رہی تھی اپنا جوتا نکالا اور زور سے اس کے چہرے پر کھینچ مارا۔

پریگوا بچتے بچتے بھی جوتے کی زد میں آ گیا۔ چہرے پر تو نہیں، لیکن جوتا اس کی مڑی ہوئی پشت سے ضرور ٹکرا گیا۔ وہ پلٹا اور پلٹ کر اس نے جوتا اٹھا لیا۔ ایک چمکتا ہوا خوبصورت ہلکا پھلکا جوتا۔۔۔۔!

اس کے رخساروں پر بھی گوشت تھرکنے لگا۔ اس کے جوتے کی گرفت سخت ہوتی چلی گئی۔ قاضی آپ ہی آپ گھبرا گیا۔ پریشانی کو دباتے ہوئے گالیاں بکتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا۔ براہیل نے اس کے ہاتھ سے جوتا چھین لیا اور اسے دھکیل کر پیچھے ہٹا دیا۔ اور بڑے ادب سے جوتا پھر قاضی کے پاس رکھ دیا اور جاتے جاتے اپنی دھوتی سے جوتے کی گرد بھی صاف کرتا گیا۔

پریگوا کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ وہ کھلیان کی طرف جا رہا تھا۔ اس کے سامنے فضائی دھند مٹ رہی تھی۔ لیکن آنسوؤں کی دھند گہری ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے دونوں ہونٹ دانتوں میں بھنچے ہوئے تھے۔۔۔۔ اس کے پیچھے براہیل کبھی چھینکتا، کبھی کھانستا، اپنے ڈنڈے کو کھیتوں کے درمیان دوڑتی ہوئی پگڈنڈیوں پر مارتا، جھومتا، آہستہ آہستہ قدموں کے ساتھ بڑھ رہا تھا۔ اس کے جوتوں کی رگڑ سے جن پر کڑوے تیل میں لپٹی ہوئی گرد کی بھیگی ہوئی تہہ جمی ہوئی تھی گھاس پر بچھی ہوئی اوس پر ایک سبز سی شرمیلی لیک بنتی جا رہی تھی۔

الاؤ سے چنگاریاں پھر ایک بار زور سے بہت سے جگنوؤں کی طرح اڑیں اور دھند کانپ گئی، ہانپ گئی۔ افق پر کرنوں کا ایک دھندلا سا رشیمی جال تھرتھرایا اور قاضی کھلیان کی طرف دیکھ دیکھ کر بالکل الو کی طرح اپنے ناخن کترنے لگا۔

ریاض بھی چارپائی سے اٹھ گیا تھا۔ منہ میں نیم کا داتن دبائے ہوئے اور کندھے پر زرد تولیہ رکھے ہوئے جب کنوئیں کی طرف چلا تو اس نے دیکھا بوڑھا قاضی اپنے قلمدان کے سامنے بیٹھا آنکھوں سے آنسو پونچھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ اب بھی تھرتھرا رہے تھے اور جھریاں آہستہ آہستہ تڑپ رہی تھیں۔ وہ ٹھٹکا' مسکرایا اور چلا گیا۔ جب اس نے بھاپ پھینکتے ہوئے پانی کی بالٹی اپنے سر پر انڈیلی تو اس کے دانت بج اٹھے اور وہ گنگنانے لگا۔

پرانے درختوں کو جلنا پڑے گا۔

دوسری بالٹی سر پر الٹتے ہوئے بلی کی سی غراتی ہوئی آواز میں وہ برابر گائے جا رہا تھا۔

بدلنا پڑے گا' بدلنا پڑے گا۔

ہاں جلنا پڑے گا۔۔۔۔ پڑے گا۔۔۔۔ پڑے گا۔۔۔۔

درخت جل رہا ہے۔ درخت جل رہا ہے اور دھواں پھینک رہا ہے۔۔۔۔ واہ بیٹا' دیکھو درخت آج جل رہا ہے۔۔۔۔ درخت آج رو رہا ہے۔

اس نے کنوئیں میں جھانک کر دیکھا۔ کنوئیں کے پیٹ میں حلق تک دھواں بھرا ہوا تھا۔ لیکن اس دھوئیں میں' تمباکو کی تلخی نہیں تھی۔ اس میں لطیف سی' شرمیلی سی دوشیزگی تھی گویا زندگی کی سبک سانسیں چھپی ہوئی تھیں۔ وہ پھر مسکرایا اور پوری بالٹی اپنے سر پر انڈیل کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے جسم سے بھاپ نکلنے لگی۔ وہ بالکل اگربتیوں کا جلتا ہوا ستون معلوم ہو رہا تھا۔

قاضی نے اپنا زرد کھاتا نکالا اور اس کے پیلے ورق اُلٹ اُلٹ کر' بے جان ہندسوں کو گھورنے لگا۔ سامنے سے بیل' بھینس' بکریاں' مختلف جوڑیوں میں گزر رہی تھیں۔ چرواہوں کی آواز سن کر قاضی کی آنکھیں اوپر اٹھ جاتیں۔ اور اس کے ہونٹ بھینچ جاتے اور دوبارہ وہ پیلے ورقوں کو الٹ پھیر کر ہندسوں کو پڑھتا اور زیر لب بڑبڑانا شروع کر دیتا۔ اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے اور آنکھوں میں غصہ چمک اٹھتا۔

ریاض تولئے سے اپنا بدن پونچھ رہا تھا۔ نیچی کھڑکی سے ہوا کے تیز جھونکے آ رہے تھے۔ کھڑکی کے پٹ کھلتے اور بند ہو جاتے۔ ریاض کو یہ بہت اچھا معلوم ہوا۔ بغیر کپڑے بدلے صرف بنیان پہنے وہ ہوا کے جھونکوں کے سامنے کھڑا ہو گیا اور کنگھے سے اپنے جھبرے بالوں کو آراستہ

کرنے لگا۔ دانت پیستے ہوئے ایک زاوئے میں قاضی کا صرف سر نظر آ رہا تھا جس پر چھوٹے چھوٹے سفید بال لیموں پر چپکے ہوئے نمک کے دانوں کی طرح نظر آ رہے تھے۔ ابھی اس نے گاڑھے کا سفید کرتا پہنا ہی تھا کہ کسی کی چاپ سنائی دی۔

"سرکار ناشتہ تیار ہے۔"

"تو میں کیا کروں؟"

پاؤں کی چاپ جس طرح قریب آئی تھی اسی طرح سہمی سہمی دور ہوتی چلی گئی۔

"ریاض"

"جی" ریاض نچلے کمرے میں پہنچا تو قاضی اپنے سیاہ جوتے پہن رہا تھا۔

"جاؤ تم ناشتہ کر لو۔ میں نہیں کروں گا۔"

"کیوں؟" ریاض نے کرتے کا بٹن لگاتے ہوئے پوچھا۔

قاضی جی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"میں ناشتہ کیسے کر سکتا ہوں۔ آج مقدمے کی تاریخ ہے۔ اور میں یہاں مر رہا ہوں۔ پر گوا ۔۔۔۔ حرامی کا بچہ" کنپٹیوں پر جھریوں کی لہروں کے نیچے گوشت تھرتھرایا۔ جیسے چولھے پر پک رہا ہو۔

براہیل اپنی بغل میں چند گنے دبائے ہوئے اور دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا مصیبت ہے۔"

"سرکار ۔۔۔۔" وہ نیاز مندی میں اور جھک گیا "گنے اپنے کھیت سے چرا کر یہ دونوں بھاگے جا رہے تھے۔"

"سرکاری کھیت سے؟"

"ہاں سرکار ۔۔۔۔ ہاں سرکار"

دو نوجوان سیاہ رنگ کے 'ہٹے کٹے' آدھی دھوتی باندھے ہوئے اور آدھی دھوتی کو چادر کی طرح لپیٹے ہوئے کھڑے تھے۔ دھوتیوں پر گوبر کے داغ پڑے ہوئے تھے۔ آنکھوں میں غلیظ اور خیالی سرخی بھری ہوئی تھی۔ وہ دونوں دو جاندار بتوں کی طرح کھڑے تھے۔ ان کی ناک

سے چھاپ نکل رہی تھی اور وہ زمین کی طرف گھور رہے تھے۔

"باندھ دو دونوں کو"۔

دونوں کو باندھ دیا گیا۔ کچہری کے سامنے۔ دھوپ نکل چکی تھی۔ اور انسانوں کے سائے تیزی سے گھٹتے چلے جا رہے تھے۔ دھند پگھل کر کرنوں میں گھل رہی تھی۔ سامنے دھان کے کھیتوں میں کٹے ہوئے دھان کی کھونٹیاں نظر آ رہی تھیں۔ کھلیان میں دھان کی پیلی پیلی مونچھیں چمک رہی تھیں۔ سرشتے میں منشی اور تحصیلدار پیلے پیلے کھاتوں پر جھکے ہوئے ناریل پی رہے تھے اور دھوتی کے ایک گوشے میں زکام کی ریزش کو جذب کرتے جاتے تھے۔

"لگاؤ پچاس جوتے سالوں کو"۔

راجپوت براہیل کی آنکھوں میں۔۔۔ بھیڑیوں کی آنکھوں کی چمک پیدا ہو گئی تھی اور اس کے اوپر کے میلے کتھئی دانتوں کی کائی صاف نظر آنے لگی تھی۔ جوتے برسانے سے پہلے اس کا بدن لڑاکو مرغ کی طرح پھول گیا۔ اس نے اپنے جوتوں کو اپنے پیروں سے نکال لیا۔ جوتوں کو دونوں ہاتھوں سے تولا اور ایک بار پھر اپنے سمٹتے ہوئے بدن کے ساتھ جلیل القدر سرکار کی طرف دیکھا۔ جیسے بلی چوہے پر جھپٹنے سے پہلے حالات کا جائزہ لے رہی ہو یا کوئی پجاری بکری کی بھینٹ چڑھانے سے پہلے دیوتا کی آنکھوں کی طرف دیکھ رہا ہو۔

"لگاؤ جوتے سالوں کو۔ تمہارے لئے جوتے آ جائیں گے۔ ٹوٹ جائیں تو ٹوٹ جائیں۔"

براہیل کا جسم پھر ایک بار پھیل گیا۔ شکار سامنے تھے زد پر۔ اس کا ہاتھ ہوا میں لہرایا اور اس کا جوتا ہوا میں بلند ہو کر تھوڑی دیر ٹھہرا رہا۔ جوتا اس چیل کی طرح نظر آ رہا تھا جو کسی چوزے پر جھپٹنے والی ہو۔

دونوں مجرم ان لوگوں کی طرف دیکھ رہے تھے جو گاؤں سے یہ تماشہ دیکھنے کے لئے جمع ہو گئے تھے۔ ان میں بوڑھی اور جوان عورتیں تھیں' بچیاں بچے اور چند بوڑھے بھی تھے۔ البتہ ایک بھی جوان نہیں تھا۔ براہیل نے ان کی طرف فاتحانہ شان سے دیکھا اور پھر جوتے دھواں دھار برسنے لگے۔ پہلے جوتے کی گرد جھڑی اور اس کے بعد زمین سے گرد اڑی۔۔۔ دھم دھم۔۔۔ بچیاں سہم گئیں۔ بچے ایک دوسرے سے قریب ہو گئے۔ عورتوں نے اپنی آنکھیں کھیت کی

طرف پھیر لیں۔

قاضی جب اندر پہنچا تو گھر میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس کی جوان لڑکیوں کے قہقہے مر گئے اور بھینگی آنکھوں والی بوا چولھے میں لکڑیاں جھونکنے لگی۔ قاضی کی بیوی نے کڑاہی میں گھی زیادہ انڈیل دیا۔ گھی کے پکنے سے پہلے انڈے کی زردی ڈال دی اور اس کے چھلکے بھی گھبراہٹ میں کڑاہی میں جا پڑے۔ سنجیدہ اپنی دودھ پیتی بچی کی آنکھوں میں کاجل بھرنے کے لئے اتنے تپاک سے بڑھی کہ کاجل کی لکیر بدنما دھبے کی طرح پھیل گئی اور ناک کی سرحد کو چھوتی ہوئی گداز ڈھلکنے سے گالوں میں ابھرتے ہوئے خوبصورت بھنوروں تک جا پہنچی۔

وہ جا کر پچھم والے لمبے سائبان میں اس پرانے تخت پر بیٹھ گیا جو اپنی بوسیدگی کی وجہ سے کناروں پر دانت نکالے ہوئے تھا۔ دیہاتی چھاپ کے دستر خوان پر پراٹھے' نیم برشت انڈے' ملائی' انڈے کے حلوے کی طبق اور قتلیاں مختلف چینی کی پلیٹوں میں رکھی تھیں۔ دستر خوان پر فارسی کا ایک شعر چاروں طرف چھپا ہوا تھا۔ "تم خوش قسمت ہو کہ تمہارا مہمان اپنا رزق کھانے کے لئے تمہارے گھر آ گیا ہے۔" اس نے گلاس اٹھایا' وہیں پر ذرا سا ہاتھ کو بھگویا اور اپنے کرتے کے دامن میں ہاتھ کو پونچھتے ہوئے باورچی خانے کی طرف دیکھا۔۔۔ وہاں اس کی کنواری لڑکی زرینہ بیٹھی کیتلی سے دم کیا ہوا پانی چائے دان میں انڈیل رہی تھی۔ اس کا گندمی ہاتھ کانپ رہا تھا۔ سر سے دوپٹہ ڈھلک گیا تھا اور آنکھیں جھکی جھکی جھپ جھپ جھپک رہی تھیں۔ اس نے اپنے نچلے ہونٹ کو ہلکے سے دبا رکھا تھا۔ قاضی کی بیوی جس کی اونچی اور چھوٹی سی ناک باورچی خانے کے دھوئیں سے سیاہ ہوتے ہوئے دروازے کے پس منظر میں سکڑتی ہوئی نظر آ رہی تھی' اپنی انگلیاں چٹخا رہی تھی۔ اس کے منہ میں پان بھرا ہوا تھا۔ وہ قاضی کی طرف دیکھتی تھی اور پھر اس کے تیور سے سہم کر چولھے سے نکلتی ہوئی سرخ زبانوں کو دیکھنے لگتی تھی اور جلدی جلدی ہاتھ سینکنے لگتی تھی۔

"کیا میں اکیلا ہی ناشتہ کروں گا۔ زرینہ تم کیوں نہیں آتیں؟"

زرینہ کے ہاتھ سے کیتلی گر گئی اور پانی اپلوں پر بہنے لگا۔ اس کی کلائیوں کی دھانی چوڑیاں چیخ اٹھیں۔ اس نے اپنے بوڑھے باپ کی طرف دیکھا اور چائے دان طشت میں اٹھا کر اس کے

پاس لے آئی۔ قاضی کا اشارہ پاتے ہی وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔

"آج صبح ہی سے شگون خراب ہو گیا۔ کمبخت۔۔۔۔!"

"باجی آپ بھی تو آئیے"۔

"ہونہ ہو۔۔۔۔ میں ایک بھوت ہوں۔ سب مجھ سے ڈرتے ہیں۔ کوئی میرے پاس نہیں آتا۔ کیا میں تمہیں کھا جاؤں گا نجو؟"

سنجیدہ اپنی بچی کو نانی کے پاس چھوڑ کر دسترخوان پر آ بیٹھی۔ دونوں بہنوں نے ایک دوسرے کو دیکھا اور ناشتہ کھانے لگیں۔ ریاض بھی کھانستا ہوا اندر آ گیا۔ زرینہ سمٹ گئی۔ سنجیدہ نے اس طرح سانس لی جیسے اس کے دل کا بوجھ اتر گیا ہو اور ساتھ ہی خون بھی آہستہ آہستہ کم ہو گیا ہو۔

ریاض مسکراتا ہوا تخت کے دوسرے کنارے پر بیٹھ گیا۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب سا زہر بھرا ہوا تھا۔ ناشتہ چلتا رہا' چائے چلتی رہی' چمچے چڑیوں کی طرح چہکتے رہے۔ باورچی خانے کی پراسرار سرگوشیاں' ماماؤں کی گھبرائی گھبرائی نظریں' بوا کا کوؤں کو بھگانے کے لئے بار بار اپنے لنڈورے ہاتھوں کا اٹھانا۔۔۔۔ یہ ساری چیزیں' ساری ادائیں' ساری آوازیں' پرچھائیوں کی طرح ابھرتی رہیں۔ رینگتی رہیں۔ ایک کوا بالکل پاس ہی آکر چائے پر بیٹھا' کائیں کائیں کرنے لگا۔ اس کی آنکھیں دسترخوان کی نعمتوں پر جمی ہوئی تھیں۔

"یہ کوے بھی کتنے نڈر ہو گئے ہیں۔" زرینہ چائے کی پیالی ریاض کو بڑھاتے ہوئے بولی۔

"جب آدمی نڈر ہونے لگتا ہے تو کوے بھی نڈر ہو جاتے ہیں۔" قاضی نے کوے کی طرف دیکھتے ہوئے طنزیہ لہجے میں کہا۔

زرینہ چپ ہو گئی اور ریاض کی طرف دیکھنے لگی جس کے ہونٹ بھنچ گئے تھے۔ سنجیدہ نے ہاتھ اٹھا کر کوے کو بھگایا۔ لیکن وہ اڑا ہی نہیں۔ صرف پینترے بدل کر رہ گیا۔ وہ خود اٹھی اور اپنی روتی ہوئی بچی کے پاس چلی گئی جو چولھے کی آنچ کے پاس رہنے کی وجہ سے کافی گرم ہو گئی تھی۔

"ریاض میاں دیکھ لیا' یہ کسان کیسے ہیں۔ یہ کیسے ہوتے ہیں۔ انہی چوروں کو حکومت سونپنا

چاہتے ہیں آپ۔۔۔۔؟" ریاض قاضی کا گاؤں کے بہت دور دراز کے رشتے سے بھتیجا ہوتا تھا۔ وہ چھ ماہ کا تھا کہ اس کے ماں باپ ہیضے میں مر گئے تھے اور اس کی پرورش قاضی نے کی تھی۔ قاضی اپنے خاص طنزیہ انداز میں اس سے آپ ہی کہہ کر باتیں کیا کرتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ ریاض کسانوں سے ہلا ملا ہوا تھا اور اس کا لگاؤ ان لوگوں سے تھا جو کسانوں کے آندولن کا رخ اس کی جاگیرداری کی طرف پھیر رہے تھے۔

ریاض نے گرم گرم چائے کا گھونٹ حلق سے اتارتے ہوئے بہت سنجیدگی سے زرینہ کی طرف دیکھا اور کہا "جب یہ کسان حکومت کرے گا تو ایسا نہیں رہے گا۔ مجھے بدل پور کے کسان پسند ہیں۔ وہ یہاں کے کسانوں سے ایک قدم آگے جا چکے ہیں۔"

"کیا کہا ایک قدم آگے جا چکے ہیں۔ میرے عملوں سے فوجداری کرتے ہیں۔ کھیت سے فصلیں اٹھالے جاتے ہیں۔ اسی لئے ایک قدم آگے جا چکے ہیں۔ یک نہ شد دو شد۔۔۔۔ چور نہیں ڈاکو کسانوں کو تم پسند کرتے ہو۔"

"ڈاکو نہیں۔ اپنا حق چھیننے والوں کو۔" ریاض نے دستر خوان میں اپنی انگلی رگڑتے ہوئے اپنی آواز میں تلخی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"جی آپ لوگوں کی خیالی کھچڑی بھی خوب ہے۔"

"یہ خیالی کھچڑی نہیں ہے۔۔۔۔ کسان ان لوگوں سے چوری سیکھتا ہے جو اسے چوری پر مجبور کرتے ہیں۔ اپنی چوری کو انصاف کہتے ہیں۔ خدا کا قانون کہتے ہیں۔ قسمت کا کھیل کہتے ہیں۔"

"ہاں خدا کا قانون نہیں بدل سکتا۔ یہ خدا کا قانون ہے۔" قاضی نے منہ میں ملائی کا چمچہ ڈالتے ہوئے کہا۔

"یہ قانون اندھے کی لاٹھی ہے اور اندھوں کے ہاتھ میں ہے۔ کم ہیں جو اندھے ہیں۔ کم ہیں جنہیں اس لاٹھی کی ضرورت ہے۔"

زرینہ اٹھ گئی۔ قاضی مسکرایا۔ وہ ریاض کی باتوں کا آخر میں اس طرح جواب دیا کرتا تھا۔ اسے ریاض کی تلخی پسند تھی۔ وہ اسے دلیر اور خوددار سمجھتا تھا۔ لیکن وہ اسے ایک گمراہ نوجوان سمجھتا تھا جسے انگریزی تعلیم نے برباد کر دیا تھا۔

ماما ئیں برتن اٹھالے گئیں۔ قاضی کنارے والے کمرے میں گیااور اپنی بیٹی زرینہ کے تکیے پر سر رکھ کراور لحاف کھینچ کرلیٹ گیا۔ اس کی ناک میں زرینہ کے بالوں کی خوشبو تکیے سے نکل کر گھسنے لگی۔ اس نے تکیے کو الٹ دیا۔ مگر خوشبو کی یلغار جاری رہی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کرلیں۔ اس کی آنکھوں میں پریگوا کا چہرہ ابھر آیا۔

جب پچھلے دروازے سے گاؤں کی طرف جانے لگا تو دروازے کے پاس کھلے آنگن میں کبوتروں کے آگے گیہوں کے موٹے موٹے دانے بکھیرتی ہوئی زرینہ اسے نظر آئی۔ وہ خاموشی سے نکل جانا چاہتا تھا کہ زرینہ نے کبوتروں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''آپ کو ابا سے ڈر نہیں لگتا؟''

''کیوں مجھے تو ڈر نہیں لگتا۔''

''مجھے تو بہت ڈر لگتا ہے۔'' ایک سفید کبوتر اڑ کر زرینہ کے کندھے پر بیٹھ گیا۔

''ہاہا۔۔۔دیکھو یہ کبوتر جب آدمی سے نہیں ڈرتا تو میں آدمی سے کیوں ڈروں؟''

''میں تو اس کبوتر کو دانے کھلاتی ہوں۔ جس سے کھانا ملتا ہے آدمی اس سے نہیں ڈرتا۔ وہ تو اس کے سر پر چڑھ کر ناچنے لگتا ہے۔''

ریاض کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ اس کے منہ میں نمکین پانی بھر آیا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس نے جو کچھ کھایا تھا سب قے کردے گا۔ تیر اس کے سینے میں پیوست ہوگیا تھا۔

''زرینہ یہاں کے سیکڑوں کسان تمہارے ابا کو کھلاتے ہیں۔ دانہ دیتے ہیں۔ خود تمہاری رگوں میں ان کی محنت کا خون ہے۔ مگر تمہارے ابا تو ان داتاؤں سے بہت ڈرتے ہیں ۔۔۔کیوں؟''

''کیا مطلب؟''

ریاض نے اپنی جیب سے ایک بیڑی نکالی اور اس کے سرخ تاگے کو اپنی انگلیوں سے چھوتے ہوئے لب تک لے گیا۔ ماچس کی تیلی جلائی' لیکن بیڑی سلگانے سے پہلے ہی زور سے ہنسا۔ تیلی کے سر پر پھڑ پھڑاتی ہوئی سنہری تتلی ایک قہقہے کی پھونک میں اڑ گئی۔

''آج نہیں تو کل مطلب سمجھ میں آجائے گا۔'' اور وہ تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا باہر چلا گیا۔ زرینہ

نے اپنے کندھے پر کبوتر کو دونوں ہتھیلیوں میں لے لیا۔ اس کے ہاتھوں میں غڑغوں کرتا ہوا کبوتر کنول کے پھول کی طرح نظر آنے لگا۔

"ٹیڑھے آدمی اور جلی ہوئی رسی کے بل میں کیا فرق ہے میرے منے غڑغوں؟" اس نے کبوتر کو چومتے ہوئے پوچھا اور پھر اسے ہوا میں اچھال دیا۔ کبوتر اڑا اور پھر آنگن میں اتر کر دوسرے کبوتروں کے سنگ سرسوں چگنے لگا۔

جب زرینہ حویلی میں اندر آئی تو اس کی ماں زور سے منہ چباتی ہوئی اور سفید ململ کی ساڑی کی چون کو ایک ہاتھ سے سنبھالتے ہوئے اور دوسرے ہاتھ میں پان کی مراد آبادی ڈبیہ اور تمباکو کی شیشی لیے ہوئے قاضی کے کمرے میں داخل ہوئی۔ قاضی تکیے میں منہ کو دفن کیے ہوئے آہستہ آہستہ سانس لے رہا تھا اور اس کے پیٹ میں ایک تلاطم بپا تھا۔

"لیجیے پان تو کھائیے۔ آج طبیعت کیسی ہے آپ کی۔ اجی اتنے ست کیوں ہیں آپ؟" بیگم نے ساری کی چون چھوڑتے ہوئے اپنی ٹھنڈی ہتھیلی قاضی کی پیشانی پر رکھ دی۔

"میرا دماغ خراب ہو رہا ہے اور تمہیں پان کی سوجھی ہے۔" قاضی نے جھلا کر کہا اور اپنا منہ کھول دیا۔ بیوی نے پان اس کے کھلے ہوئے منہ میں رکھ دیا جس سے پائیریا کی سڑاند اٹھ رہی تھی۔

"آخر بات کیا ہے جی" پائنتی میں بیٹھ کر بیوی نے قاضی کا پیر دبانا شروع کر دیا۔

"بات کیا ہے۔ آگ لگ گئی ہے اور تم پوچھتی ہو دھواں کیسا ہے۔ تم عورت ہو بس عورت۔"

"ہائے میں نگوڑی عورت ہوں پر یہ آگ کیسی' ہائے میرے اللہ یہ دھواں کیسا؟۔۔۔۔ آئیں؟ پاک پروردگار۔۔۔۔" اس کی بیوی کے سفید ہوتے ہوئے بال پیشانی پر جھک آئے۔

"تمہیں خطرے کی گھنٹی نہیں سنائی دے رہی ہے۔"

"کیا ہوا میرے مولا سنوں بھی تو۔۔۔۔؟" اس کی بیوی کی آواز رندھی رندھی سی ابھری اور سسکیوں میں ڈوب گئی۔ "بتائیے خدا کے لئے بتائیے۔"

"یہاں کی حالت بگڑ رہی ہے۔ لوگ باغی ہو رہے ہیں۔"

"میری جوتی سے باغی ہو رہے ہیں۔ نمک حراموں کا دماغ چل گیا ہے۔ کوڑھ پھوٹے گا تو پتہ چلے گا۔۔۔۔ خیر خدا کی لاٹھی میں آواز نہیں۔۔۔۔ دیر ہے اندھیر نہیں۔"

"خدا خدا۔۔۔۔ اب یہ سب نہیں چلے گا۔"

"کیا نہیں چلے گا۔"

"یہی اور کیا۔"

وہ اٹھا اور باہر جانے لگا۔ اس کی بیوی نے ہاتھ پکڑ کر بیٹھالیا۔

"کیوں کیا بات ہے۔"

اس کی بیوی سرگوشی کے سے انداز میں کہنے لگی۔

"آپ نے کچھ اس رشتے کے بارے میں سوچا۔"

"کس رشتے کے بارے میں" قاضی نے اپنی بیوی کی چمکتی ہوئی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ اس کے کانوں میں سونے کی پھول دار بالیاں آہستہ آہستہ ہل رہی تھیں۔

"زرینہ کے اور کس کے۔ آپ تو اتنا بھولے بنتے ہیں۔۔۔۔ خدا کی قسم"

قاضی چپ ہو گیا۔ اس کی آنکھوں میں ٹھیکیدار بختیار احمد کے بیٹے کا روپ نکھر آیا۔ دوسرے ہی لمحے میں اس کا روپ تو مٹ گیا البتہ دو کاریں سرسرانے لگیں۔ نیلی اور سیاہ اسٹوڈی بیکر۔ ایک کار میں ٹھیکیدار بختیار احمد اپنا مہین کرتا پہنے' سگریٹ کے بھدے کش لگاتا ہوا' چوڑی کالی سڑکوں پر بھاگا جا رہا تھا۔ دوسری کار میں اس کی دو بیویاں تھیں۔ ایک جوان بیوی اور دوسری بوڑھی بیوی۔ دونوں دیکھنے میں ماں بیٹی معلوم ہوتی تھیں۔ لیکن دونوں ایک دوسرے کے کانوں میں کچھ کہتی تھیں اور ہنستی جاتی تھیں۔ ڈرائیور سامنے ایک بڑے سے انگریزی اسٹور سے ان کے لئے چیزیں لا لا کر پسند کروا رہا تھا۔۔۔۔ اس سے آگے زرینہ تھی۔ سادہ اور کھڑے نقوش جھلملاتی ہوئی آنکھیں' بھیچے ہوئے پتلے ہونٹ' اخبار اور کتابوں میں ڈوبی ہوئی اور دوسری طرف وہ ٹھیکیدار کا بیٹا' فلمی ایکٹریسوں کی آپ بیتی اور شب زفاف جیسی کتابیں پڑھتا ہوا۔ شمع کے معمے حل کرتا ہوا۔۔۔۔ حقارت آمیز قہقہے لگاتا ہوا اور ریاض جیسے لوگوں کو الو کہتا ہوا۔۔۔۔

"ابھی رشتے وشتے کی فرصت نہیں۔ تمہیں کیا معلوم کہ ادھر تمام کیڑوں اور کسانوں نے کیا ادھم مچا رکھی ہے۔"

"لیکن ذرا سنئے تو سہی۔ یہ تو ہوتا رہے گا۔ مگر پھر ایسا لڑکا نہیں ملے گا۔ وہ موٹریں' بڑا سا مکان'

باغ' ملازم' خانسامے' لڑکا بھی ایسا شوقین اور کمسن ۔۔۔۔ زرینہ راج کرے گی۔"

قاضی اٹھا اور اپنا بھاری بھرکم جسم ڈگمگاتا ہوا حویلی سے باہر چلا گیا۔ ڈیوڑھی میں کھپریل کے پاس بیٹھ گیا اور پھر اپنے کاغذات دیکھنے لگا۔

بادل گھر آئے تھے۔ سورج چھپ گیا تھا۔ ہوا بھاری اور ٹھنڈی تھی۔ دور کھلیان میں براہیل کے سوا اور کوئی دکھائی نہ دیتا تھا۔

قاضی کے چہرے سے جذبات کی اضطراری کیفیت جھلک رہی تھی۔ وہ اپنی عینک کو کرتے کے دامن سے صاف کرتے ہوئے کھلیان کو دیکھ رہا تھا۔ ہوا میں اور زور پیدا ہوا اور بارش شروع ہو گئی۔ چھوٹے چھوٹے اولے گرتے' آواز پیدا کرتے اور اچھل اچھل کر اس کے جوتوں تک لڑھکتے چلے آتے' سامنے ماما کے لڑکے اور لڑکیاں کٹورے میں اولوں کو اٹھا رہے تھے اور ہنس ہنس کر مزے سے کھا رہے تھے۔ قاضی نے تلملا کر زور سے براہیل کو پکارا۔ براہیل دوڑا ہوا بھیگی ہوئی پگڈنڈیوں پر سے پھسلتا ہوا اس کے پاس آیا اور پھر ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ایک اولے کی چوٹ سے اس کا کان کٹ گیا تھا اور اس میں سے ہلکے ہلکے خون رس رہا تھا۔
"ہاتھ جوڑ کر کیا کھڑا ہو گیا ہے تو۔ دیکھتا نہیں دھان بھیگ رہا ہے کھلیان میں۔ کیوں نہیں ان کی پونج بندھوا دیتا۔"
"سرکاری کمیرے نہیں آئے۔"
"کیوں نہیں آئے۔"
"میں نے سب کو بلایا' گالیاں بھی دیں ماں بہن کی۔ مگر کوئی ٹس سے مس نہیں ہوتا سرکار۔"
"گالیاں نہیں ۔۔۔۔ جاؤ سب کو پھسلا منا کر لاؤ یہاں۔ یہ گالیوں کا زمانہ نہیں۔"

براہیل دوڑا ہوا کمیروں کے ٹولے کی طرف چلا گیا۔ جب وہ پھسلنے لگتا تو دونوں ہاتھوں کو ہوا میں پھیلا دیتا اور پھر تیزی سے دوڑنے لگتا۔ بارش اور تیز ہو گئی۔ اولے اور برسنے لگے۔ اس کی آنکھیں بھیگتے ہوئے کھلیان پر جمی رہی۔ اور مٹھیاں بندھتی کھلتی رہیں۔

شام ہو گئی۔ کھپریل میں لالٹین چھپر کی کڑی میں لٹکا دی گئی۔ پانی برسنا بند ہو گیا تھا۔ بادل اب بھی سرمئی شامیانے کی طرح تنے ہوئے تھے۔ کھلیان میں بھی لالٹین جل چکی تھی۔ ہوا میں اور

تیزی اور کاٹ پیدا ہو گئی تھی۔

اندھیرا ایک پر چھائیں کی طرح گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ قاضی اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا رہا تھا۔

براہیل کے بار بار بھیجنے پر بھی کمیرے نہیں آئے تھے۔ کھلیان میں اولے اور بارش کی وجہ سے دھان بھیگ گیا تھا۔ اسے اس نقصان سے دل میں کچوکے لگ رہے تھے۔

اس کا رعب ان کمیروں پر سے بھی اٹھ گیا تھا۔ اس نے پورے چالیس سال اس گاؤں پر حکومت کی تھی۔ اس گاؤں کی ایک ایک پگڈنڈی ایک ایک دھان کی نیری' ایک ایک پیپل' ایک ایک شیشم کا پیڑ' ایک ایک انسان' ایک ایک جانور اس کے جلال سے تھراتا تھا۔ لیکن اب کیا ہو گیا تھا۔ جب شیر بوڑھا ہو جاتا ہے تو خرگوش بھی اس کے کان کو گدگدا کر سامنے کھڑا ہو جاتا ہے۔ مونچھوں پر تاؤ دیتا ہے' قہقہے لگاتا ہے' تالیاں پیٹتا ہے اور اپنی سرخ آنکھوں کو ٹمٹماتا ہے۔

''میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ خزاں آگئی ہے۔ درخت کا زرد پتہ ہوا کے جھونکوں سے کتنا ڈرتا ہے......''

زندگی میں پہلی بار بے بسی کا تصور اسے اتنا ستا رہا تھا۔ اس کا دل غم اور شکستہ پائی کے احساس سے بھر گیا تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ جو سامنے آئے اس کا منہ نوچ لے۔ اسی لئے آدمی تو آدمی اس وقت اس کی شوخ اور گستاخ پالتو بلی بھی دبے پاؤں دور سے کھڑی کھڑی اسے دیکھ کر اور ایک بھرپور خواب اور جمائی لے کر واپس چلی گئی تھی۔

قاضی کو محسوس ہوا کہ وہ جس چارپائی پر بیٹھا تھا وہ آہستہ آہستہ لرز رہی تھی۔ پائے لرز رہے تھے۔ چھپر چچ چچ کر رہا تھا۔ اس نے چونک کر نظریں اٹھائیں تو بوڑھی ڈیوڑھی لرزتی ہوئی معلوم ہوئی۔ لرزتی لالٹین کی مریضانہ دھندلی روشنی میں اس کی ڈیوڑھی سے متصل کھنڈر ہی تھے جو اس تلاطم میں اپنی جگہ جے اندھی آنکھوں سے گھورتے نظر آ رہے تھے۔ ٹوٹی ہوئی دیوار کے گھیرے میں پیپے کے پیڑ پر کوئی چڑیا کھڑ کھڑ کر رہی تھی۔ اس کھنڈر کے بارے میں عجیب عجیب وہم تھے۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ اس میں بیرسٹر وراثت علی کی روح رہتی تھی۔ بیرسٹر وراثت علی بہت بڑا کنجوس زمیندار تھا۔ اس نے اپنی عمر سے دگنی عمر کی عورت سے شادی اس لئے

کر لی تھی کہ اس کے مال و دولت پر قبضہ کر لے۔ تھوڑے دن کے بعد وہ عورت اچانک مر گئی۔ لوگوں نے اس کے مرنے کے بعد جب اس کا جوٹھا کھانا گھر کی بلی کو کھلایا تو وہ چیخ چیخ اور تڑپ تڑپ کر مر گئی تھی۔ بعض لوگوں کا دعوئٰ تھا کہ اب بھی رات کے وقت بلی کے غرانے 'عورت کے سسکیاں بھرنے اور بیر سٹر وراثت علی کے نوحے اور فریاد کی آواز اس کھنڈر سے آتی تھی۔ لیکن یہ سب سنی سنائی باتیں تھیں۔ البتہ ٹوٹی ہوئی دیواروں سے اندر کے ویرانے میں بہت سے درخت جنگل کی طرح اگے ہوئے نظر آتے تھے اور کبھی کبھی وہاں سیاہ سانپ دیواروں پر سے سر اٹھا کر جھانکتے ہوئے دیکھے جاتے تھے۔ رات کے سناٹے میں ان کے بولنے کی آواز بھی سنائی دیتی تھی یوں لگتا تھا جیسے کوئی دیہاتی عورت اپنی مرغیوں کو دانے چگنے کے لئے بلا رہی ہے۔

"تی تی۔۔۔۔۔تی تی۔۔۔۔۔تی تی۔۔۔۔۔تیہ۔۔۔۔۔"

قاضی اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کھنڈر کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں سے واقعی سانپ کے بولنے کی آواز آ رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ اس کھنڈر میں بہت سی دولت دفن ہے۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے باپ بوڑھے قاضی نے ایک بار وہاں زمین کھود کر دولت کا پتہ چلانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن وہ ڈر کر وہاں سے بھاگ آیا تھا اور جو اس کے بعد بیمار پڑا تو چارپائی سے اٹھ نہ سکا۔ یہ کہانی مختلف راویوں کی زبان سے گزر کر اچھا خاصا دل دہلا دینے والا واقعہ بن گئی تھی۔

قاضی پچھلے ایک مہینے سے سخت مصیبت میں گرفتار تھا۔ اس کا گاؤں ریلوے اسٹیشن سے بارہ میل کے فاصلے پر تھا۔ قریب ترین سڑک بھی تین میل تھی۔ سڑک کیا تھی گرد کا ایک ناہموار سلسلہ تھی جہاں گرمیوں میں طوفانی بگولے اٹھتے اور چکراتے رہتے تھے۔ یہی کچی سڑک قریب ترین تھانے تک جاتی تھی جو ساڑھے گیارہ میل کے فاصلہ پر دکھن کی طرف تھا۔ قاضی کی زمینداری اتر میں تھی۔ اس لئے تھانے سے زیادہ سے زیادہ دور ہوتی چلی گئی تھی۔ گاؤں کے زیادہ تر کسانوں کی زمین کبھی نیلام ہو کر کبھی قرض کی عدم وصولی کی پاداش میں اس کی بڑی زمینداری میں پیوند کی طرح چپکتی چلی گئی تھی۔ گویا چھوٹی چھوٹی مچھلیاں ایک بڑی اژدہا نما مچھلی کے پیٹ میں ہضم ہوتی رہی تھیں۔ وہ بادشاہ تھا اپنے علاقے کا۔ اور اس وجہ سے اپنے علاقے کا رستم زماں بھی۔ صرف دس سال پہلے اس کی ڈیوڑھی کے سامنے سے کوئی نہیں گزر

سکتا تھا۔ اگر کبھی غلطی سے کوئی بکری یا گائے ادھر آ نکلتی تو اس کے مالک کو جرمانے کی سزا بھگتنی پڑتی۔ عدم ادائیگی کی صورت میں پچاس جوتے کی سزا عام تھی۔ گاؤں کے دوسرے لوگ جو اچھے قسم کے سفید پوش کاشتکار سمجھے جاتے تھے' اس کے سامنے آتے تو زانو تہہ کر کے بیٹھتے تھے۔ قاضی کے بڑے بھائی خانقاہ نشیں ہو گئے تھے۔ ان کا کام لوگوں کو کلمے پڑھوا کر ان کے سینے میں ایمان کی شمع فروزاں کرنا تھا۔ لیکن زندگی اتنے طوفان' گرد اور زلزلے سے بھر گئی تھی کہ یہ شمعیں جلتی بجھتی رہتی تھیں۔ اس لئے اسے تنہا اپنے بڑے بھائی کی زمینداری کی دیکھ بھال کرنی پڑتی تھی اور تین سو روپے ماہوار اپنے بھائی کو بھیجنے پڑتے تھے۔ وہ اپنے بڑے بھائی کے ایثار کا چرچا گاؤں والوں میں بیٹھ کر گھنٹوں کیا کرتا اور جب وہ لوگ سر دھنتے تو وہ ان کے لئے سنگترے منگواتا اور گرم گرم چائے پلواتا۔ یہ سب لوگ اس سے اتنا مرعوب تھے کہ اپنے گھریلو مقدمے بھی اس کے سامنے پیش کرتے اور وہ انصاف کیا کرتا۔ اس کا فیصلہ خدا کا فرمان سمجھا جاتا۔ کسی کو سرتابی کی جرات نہ ہوتی۔ طلاق کا مسئلہ ہو تو مقدمہ اس کے سامنے' کسی مولانا نے چھپ کر کسی کی بیوی کا نکاح کسی دوسرے سے پانچ روپے لے کر پڑھوا دیا تو اس کا مقدمہ اس کے سامنے۔ کسی کا کھیت بکری چر گئی تو اس کا مقدمہ اس کے سامنے' کسی کو قبر کے لئے خراب جگہ ملی تو اس کا مقدمہ اس کے سامنے۔۔۔۔ ان سب مقدموں کا فیصلہ وہ مزے لے لے کر کیا کرتا تھا۔

لیکن اس وقت جب وہ کھنڈر کو دیکھ رہا تھا اور سانپ کے بولنے کی آواز سن رہا تھا' اس کی دنیا اندھیری ہو رہی تھی۔ اب اس کے سامنے کوئی ادب سے نہیں بیٹھتا تھا۔ گاؤں کا کوئی ایسا شخص نہیں تھا جسے قاضی سے ذاتی شکایت نہیں تھی۔ اب اس کی ڈیوڑھی کے سامنے سے ہر شخص گزرتا تھا۔ بیل گاڑیاں گزرتی تھیں' ریوڑ گزرتے تھے' چرواہے گیت گاتے ہوئے اور اپنے جانوروں کو موٹی موٹی گالیاں دیتے ہوئے گزرتے تھے اور وہ محسوس کرتا تھا کہ یہ سب گالیاں اسے دی جا رہی ہیں۔ لیکن وہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا اور طبیعت زیادہ خراب ہوتی تھی تو اندر جا کر بیگم سے پان کی گلوری مانگتا تھا اور منہ میں پان بھر کر کہتا تھا۔

''ہوا کا رخ بدل رہا ہے بیگم' ہاتھ باندھ کر خرچ کرو۔ ورنہ ٹھیک چوراہے پر پٹرول ختم ہو گا اور موٹر رکے گی۔۔۔۔ ہاں کہے دیتا ہوں''۔

اسے معلوم تھا کہ اتر کے گاؤں میں اس کے کھیت سے فصلیں نہیں اٹھی تھیں۔ اس طرف قحط پھیلا ہوا تھا اور کسانوں اور کمیروں نے کھلیان کو گھیر رکھا تھا۔ وہ غلہ چاہتے تھے۔ وہ موت سے بچنے کے لئے لڑنے پر اتر آئے تھے۔ دوسری مصیبت یہ تھی کہ پچھلے تین سال سے اس نے غلے بچا کر جو ذخیرہ کر دیا تھا وہ غلے خراب ہو رہے تھے۔ اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ اب اسے خود اپنے گاؤں میں لوگوں کے تیور بدلے نظر آرہے تھے۔ بعض بعض کمیروں کی آنکھوں میں تو اسے ابلتا ہوا خون اور بھنچی ہوئی پیشانیوں میں خوفناک انتقامی وحشت نظر آتی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ کچھ دنوں میں شہر اور تھانے سے اتنا دور محفوظ رہنا مشکل تھا۔ ہر طرح کے خطرے چاروں طرف سے گھیرا ڈال رہے تھے اور گھیرا روز بروز تنگ ہوتا جا رہا تھا۔ خود اپنے براہیلوں' تحصیلداروں اور دوسرے پٹواریوں پر سے اس کا بھروسہ اٹھ گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے گاؤں میں بھی لوگ قحط کے چنگل میں تھے اور اس کے کھلیان کو لوٹنے کی باتیں کر رہے تھے' لیکن اس کی موجودگی میں ان کی ہمت جواب دے دیتی تھی۔

"اگر میں پولس بلالوں تو کھلیان بچ جائے گا۔ ورنہ جان کا خطرہ بھی ہے۔" اس نے چٹکی بجائی اور پھر کھنڈر کی طرف دیکھنے لگا۔ وہاں اب تک سانپ بول رہا تھا۔ اور دوسری طرف ڈیوڑھی لالٹین کی دھندلی روشنی میں اونگھتی نظر آرہی تھی۔ کھنڈر سے زور سے ایک الو کے قہقہہ لگانے کی آواز آئی اور قاضی نے اپنا مرتعش ہاتھ بڑھا کر لالٹین بجھادی اور چھنکتا ہوا بستر پر گر گیا۔ اس وقت دہرے کمبل بھی اسے سانپ کے کینچل کی طرح ہلکے محسوس ہوئے۔ دور سے برہا کے گانے کی دردناک آواز اب تک آرہی تھی۔

سرکنڈوں کے جنگل سے گھرے ہوئے بگھے پر چھوٹے چھوٹے جھونپڑوں میں اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ سرکنڈوں کے جنگل کے پاس گنے کے کھیت ہوا میں سنسنا رہے تھے اور گیدڑوں کی چیخیں کبھی تیز اور کبھی آہستہ آہستہ ابھر رہی تھیں۔ بادل پھٹ چکے تھے اور مہوئے اور کنیل کے پیڑوں کے جھنڈ کے پیچھے سے آدھا چاند ململی بادلوں کے بھاگتے ہوئے بادبانوں کے بیچ تیر رہا تھا' آہستہ آہستہ اوپر اٹھ رہا تھا۔ ہوا کی چبھن اور بڑھ گئی تھی۔

پر یگوا کے باپ کی کھانسی کی آواز گیدڑوں کی چیخ سے ملتی جلتی تھی۔ جھونپڑی میں ایک کمرہ تھا

اور اس کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ پھونس کی داڑھی سے اب تک پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔

پریگوا کی ماں سونہی گاڑھے کتھئی رنگ کی بھدی دیہاتی چھاپیوں سے بھری ہوئی موٹے کی ساڑی پہنے ہوئی تھی ایک چھوٹا سا چراغ کونے کی طاق میں رکھا ننھی سی لو کے ساتھ جل رہا تھا۔ خاموشی میں بھی وہ چراغ سسکیاں بھرتا ہوا سنائی دیتا تھا۔ سونہی صرف ساڑی کے آنچل سے ہی اپنے جسم کے اوپر کا حصہ چھپائے ہوئی تھی۔ اس کے کالے ہاتھ شانے تک ننگے نظر آرہے تھے۔ وہ ایک تھالی میں مولی کے پتوں کا ہرا اونٹا ہوا پانی لے کر آئی اور پریگوا کے باپ جیٹھنا کو بڑھانے لگی تو دونوں ہاتھوں کے نیچے سے اس کا گٹھا ہوا سیاہ بدن اور ابھرے ہوئے صحت مند سینے نظر آنے لگے۔ ہوا زناٹے سے اندر گھس رہی تھی، لیکن ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس کے جسم میں اس ہوا کے خلاف لڑنے کی بڑی قوت تھی۔ اس قوت میں بڑی آگ تھی۔ بڑی تپش۔ جیٹھنا نے مکروہ کپکپاتی آواز میں کہا۔۔۔۔ ''ارے پریگوا کی ماں! آج تیرا پریگوا دکھائی نہیں دیا۔ کہاں مر گیا۔''

''میں کیا جانوں۔ آج تو مولی کا ساگ کھانے بھی نہیں آیا۔''

جیٹھنا اٹھ کر بیٹھ گیا اور چٹائی پر سکڑ کر بیٹھتے ہوئے مولی کا گرم گرم پانی پینے لگا۔

''آج تو کوئی جھانکنے بھی نہیں آیا۔ یہ سب بگھے والے کہاں چلے گئے۔ کیا چھوٹے سرکار نے سب کو تاڑی پینے کے لئے بہت سے پیسے دے دیئے ہیں؟''

''تاڑی کا نشہ تو تجھے چڑھا ہوا ہے۔۔۔۔ آج کوئی کھلیان پر نہیں گیا۔''

''کیوں؟'' جیٹھنا نے تھالی سے مولی کا ہرا پانی چوستے ہوئے اور تھالی زمین پر رکھتے ہوئے حیرانی سے پوچھا۔

''سب کہتے ہیں دھان چھوٹے سرکار کے گھر میں نہیں جائے گا۔ اس میں سے سب کو حصہ ملنا چاہئے۔ اکال میں چوہے کی طرح مرنا پاپ ہے۔۔۔۔ سب کا۔۔۔۔''

''سب پاگل ہو گئے ہیں۔۔۔۔ اکال میں تو مرنا ہی پڑتا ہے۔۔۔۔ اس میں چھوٹے سرکار کا کیا۔ دھان تو ان کی کچہری میں تلے گا۔''

''ہاں تلے گا۔۔۔۔''

جیٹھا کو زور کی کھانسی اٹھی اور وہ چٹائی پر تڑپنے لگا۔ سوہنی نے ٹھنڈی سانس لی اور چپ بیٹھی اسے بے حسی کے ساتھ دیکھتی رہی۔

جیٹھا دمے کا مریض تھا۔ دمہ تو اسے جوانی کے وقت سے تھا۔ آندھی طوفان کی ایک رات تھی۔ اور برسات میں بھیگتے ہوئے اسے راتوں رات ایک من کالی بانک چاول لے کر تھانے دار کے یہاں جانا پڑا تھا۔ تھانے دار کے لونڈے کا عقیقہ تھا۔ چاول بھیگ گئے تھے اور چاروں اصیل مرغے بھی۔ جب وہ تھانے سے واپس آیا تھا تو راستے میں ہی اسے بخار آگیا تھا۔ گھر پہنچ کر اسے ایسی کھانسی نے آدبوچا تھا کہ آج تک چھوڑنے کا نام نہ لیتی تھی۔ پھر بھی وہ کام کرنے میں کسی سے پیچھے نہ تھا۔ اس کی پہلی بیوی مرگئی تو کچھ دنوں تو اس نے پریگوا کے خیال سے دوسری شادی نہیں کی۔ لیکن جب پریگوا ذرا بڑا ہو گیا تو وہ ایک عورت گھر اٹھا لایا۔ سوہنی اس کے مقابلے میں بالکل چھوکری تھی۔ دونوں مل کر کھیت میں کام کرنے والے مزدوروں پر بازی لے جاتے تھے۔ جھپ جھپ ان کی دارنتیاں چلتیں اور کھڑی فصلوں کے پشتوں کے پشتے لگ جاتے۔ دو برس پہلے جیٹھا پر نئی آفت آئی۔ رات کے وقت وہ ڈیوڑھی پر پہرہ دے رہا تھا۔ برسات کی امسی ہوئی رات تھی۔ کہیں ایک پتہ بھی نہیں ہل رہا تھا۔ وہ کھنڈر کے پاس ڈیوڑھی سے قریب ایک لکڑی کے کندے پر بیٹھ کر ذرا اونگھ گیا۔ اسے محسوس ہوا کہ کوئی چیز اس کے انگوٹھے میں چبھ گئی تھی۔ وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ لیکن پاس کچھ بھی دکھائی نہ دیا۔ وہ دیر تک اپنے ہاتھ کی لالٹین اٹھا کر ادھر ادھر دیکھتا رہا۔ اسے شک بھی گزرا کہیں سانپ تو نہیں تھا۔ وہ رات بھر ٹہل ٹہل کر پہرہ دیتا رہا اور غنودگی سے لڑتا رہا۔ لیکن کھنڈر کے پاس نہ پھٹکا۔ دو تین مہینے کے بعد اس کے خون میں جلن رہنے لگا اور سر چکرانے لگا۔ دیکھتے دیکھتے اس کی کھال پر جھریاں سی پڑنے لگیں۔ کان کی لووں پر مکڑی کے جالے سے تن گئے۔ چیونٹیاں اسے کاٹتی رہتیں اور اسے احساس نہ ہوتا۔ اگلے چھ مہینے میں یہ بات پھیل گئی کہ اس کا بدن خراب ہو گیا تھا۔ کوڑھ کی وجہ سے اسے ڈیوڑھی سے الگ کر دیا گیا۔ اب وہ اپنی جھونپڑی میں پڑا رہتا تھا۔ اس کا گوشت آہستہ آہستہ گل رہا تھا۔ آنکھیں انگارے کی طرح جلتی رہتی تھیں اور جہاں جہاں سے اس کا جسم پھٹ گیا تھا' خون کی لیپ سی نکلتی رہتی تھی۔ ناک دونوں آنکھوں کے بیچ ابلے ہوئے آلو کی طرح سمٹے ہوئے چھلکے کے ساتھ اندر کو دھنستی

چلی جارہی تھی۔ مکھیاں بھنبھناتی رہتیں اور وہ بیٹھا پیال کی رسیاں باٹتا رہتا۔ اس کی ہتھیلی سے خون نکلنے لگتا۔ بگھے کے دوسرے لوگ کہتے "کیوں جیٹھنا کاکا' کاہے کو یہ سب کرتا ہے تو" وہ ہنستا اور سڑے ہوئے دانتوں کو نکال کر ان کی طرف سرخ آنکھوں سے دیکھتا اور کہتا "کام بنا آدمی کوڑھی ہو جاتا ہے۔۔۔۔ میں جیٹھنا ہوں۔۔۔۔ جیٹھنا۔"

سب تنگ آکر کہتے۔۔۔۔ "ہاں تو چھوٹے سرکار نہیں ہے یہ کسے معلوم نہیں۔" سب اپنی راہ لیتے اور وہ اسی طرح سر جھکا کر رسیاں باٹتا رہتا۔ پریگوا اور سوہنی کی وجہ سے اس کا پیٹ کسی نہ کسی طرح بھر جاتا تھا۔ وہ دل ہی دل میں پکتار ہتا اور اپنے آپ کو کوستا۔
"کوڑھی کوے کی طرح کٹھ جیو ہوتا ہے۔ جلدی مرتا بھی نہیں۔"

سوہنی اپنی ساری کے آنچل کے نیچے ایک بورسی رکھے ہوئی تھی۔۔۔۔ (ایک پرانی کالی ہانڈی جس میں اوپلے کے چورن اور پیال میں آگ دبی ہوئی تھی) اور اس کا تلخ دھواں آہستہ آہستہ نکل رہا تھا۔

کچھ آہٹ ہوئی تو سوہنی نے اپنے چھوٹے چھوٹے چکٹ بالوں کو جھٹک کر دیکھا۔ پریگوا اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں ایک موٹا سا ڈنڈا تھا۔ وہ آتے ہی ماں کے پاس ڈنڈا پٹک کر بیٹھ گیا۔
"کیوں بے تو آج آیا نہیں۔ کہاں تھا تو؟" جیٹھنا نے اپنے تیور چڑھاتے اور کھانستے ہوئے پوچھا۔
"ماں ہے کچھ؟" اس نے اپنی انگلیوں کو منہ پر رکھ کر اشارہ کیا۔
"ابے تو جواب کیوں نہیں دیتا؟" جیٹھنا نے جھلا کر اپنی سرخ آنکھوں کو نکالتے ہوئے پوچھا۔
"ہاں نہیں دیتا۔ کیا کرے گا تو؟"

جیٹھنا چپ ہو گیا۔ اس نے اپنی دونوں کہنیوں کے درمیان اپنا سر رکھ لیا اور آہستہ آہستہ ہلنے لگا۔ اس کی کھانسی کی آواز زبردستی نکل جاتی اور اس آواز سے معلوم ہوتا کہ وہ اپنی کھانسی کو دبانے کی کتنی کوشش کر رہا تھا۔

سوہنی اپنے سوتیلے بیٹے کے لئے بھی مولی کے ساگ کا پانی لے آئی۔ وہ ایک ہی سانس میں پی

گیا۔ اس کے چہرے کی تھکن اسی طرح قائم رہی۔ اس کے پتلے بال آگے کو جھک آئے تھے۔

جیٹھنا نے پھر سر اٹھایا "دیکھو میں کہے دیتا ہوں پر یگو اتو بہت دبلا ہوتا جا رہا ہے۔ ہمارے گاؤں میں کوئی غریب انگریزی بال نہیں رکھتا۔ پر تو سالا چھوٹے سرکار کا جنا ہے۔ چر کی رکھتا ہے۔۔۔ ہوں" اسے کھانسی آئی اور چپ ہو گیا۔

"دیکھ بپا۔۔۔۔ کوئی اور ہوتا تو ڈنڈا بجا کر سر پھاڑ دیتا۔ کتے کی گالی دو چھوٹے سرکار کی مت دو۔"

"ای سالہ جنم کا سنکی ہے" جیٹھنا ہنسنے لگا۔

سوہنی تھالی رکھ کر آئی اور بیٹھ کر بورسی کی آگ کریدنے لگی۔ جھونپڑی تلخ دھوئیں سے بھر گئی اور خود سوہنی کو بھی کھانسی آ گئی۔

"چھوٹے سرکار کا اب میں سائیس نہیں ہوں۔ میں نے کام چھوڑ دیا ہے۔

"کیا بکتا ہے بے۔"

"ٹھیک کہتا ہوں۔"

ایک تلخ اور بھری ہوئی خاموشی جھونپڑی پر مسلط ہو گئی۔

"میں جا رہا ہوں" پر یگوا اٹھ کھڑا ہوا۔ "ٹھاکر واڑی کے پچھواڑے ابھی پنچایت ہو گی۔"

"پنچایت ہو گی؟ کیسی پنچایت؟ پنچایت دکان والی پنچایت؟ اس میں تیرا کیا کام۔" جیٹھنا صرف ایک طرح کی پنچایت جانتا تھا جو گاؤں کے زمیندار اور دوسرے بڑے کاشتکاروں نے مل کر دکان کی صورت میں قائم کی تھی اور جہاں سے چینی اور کپڑے کا سارا ذخیرہ غائب ہو جاتا تھا اور اس کے جیسے غریبوں سے لٹھے اور پاپلین خریدنے کو کہا جاتا تھا اور وہ جب انکار کر دیتے تھے تو کہا جاتا تھا یہ گنوار اچھے کپڑے خریدتے ہی نہیں۔ سرکار کیا کرے۔

"نہیں۔ اپنی پنچایت۔ گاؤں گاؤں میں بھوک مری کا ڈر ہے۔ چھوٹے سرکار کا ظلم بہت بڑھ گیا ہے۔ ہمیں غلہ ملنا چاہیے۔ ہم کھلیان سے اٹھا لیں گے۔"

"پاگل ہو گیا ہے بے پر یگوا۔ سالا گھر پر گدھے سے ہل چلوا دے گا۔ کھلیان سے غلہ اٹھا لے گا۔ کس میں ہے دم۔۔۔۔ اور پھر یہ تو ڈاکہ ہے ڈاکہ۔۔۔۔ لوٹ ہے لوٹ 'لوٹ کے مال سے

کوڑھ پھوٹتا ہے 'کمینے۔"

"تم نے کس کو لوٹا تھا۔ تمہارا خون کیسے خراب ہوا۔۔۔ایں؟" یہ کہہ کر وہ چہرے پر ایک آہنی جرات کی تختی لئے ہوئے جھونپڑی سے باہر نکل گیا۔ اس کے ڈنڈے کی آواز آتی رہی۔ جو رفتہ رفتہ مٹ گئی۔ البتہ جب وہ پتلی سی چین کو پار کر رہا تھا تو بہتے ہوئے پانی سے تیرنے کی آواز آ رہی تھی۔

جیٹھا تلملا رہا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ پریگوا کو اس وقت روئی کی طرح دھن کر رکھ دیتا۔ اس کا آخری جملہ کوڑوں کی طرح اس کے دکھتے ہوئے زخمی بدن پر برس رہا تھا اور پیپ بھرے زخموں میں سیروں نمک بھر رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جلتی ہوئی ریت سی بھر گئی تھی۔ لیکن وہ تلملانے کے سوا اور کچھ نہ کر سکتا تھا۔ اس کی آنکھیں اور سرخ ہو گئی تھیں اور ان کے اندر بیزاری 'تھکن اور روکھا پن پیدا ہو گیا تھا۔

سوہنی بھی اٹھی اور چپکے سے ٹھاکر واڑی کی طرف چل دی۔ چین کو پار کرتے وقت وہ ٹھنڈ اور زور سے بہتے ہوئے پانی میں ایک ذرا کھڑی ہو گئی۔ اس نے اپنی ساڑی کمر تک سمیٹ لی تھی۔ اس کے دانت بج رہے تھے۔ اندھیرا ہر طرف سرگوشی کر رہا تھا۔ دور ڈیوڑھی کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ سامنے کھلیان میں الاؤ نہیں جل رہا تھا۔

"اگر یہ ڈیوڑھی زمیندار سمیت اس ٹھنڈے پانی میں بہائی جا سکتی۔۔۔۔" سوہنی کے دماغ میں یہ خیال گونجنے لگا اور وہ چین سے نکل کر ٹھاکر واڑی کی طرف لپکنے لگی۔

ٹھاکر واڑی کے پچھواڑے میں ایک صحن تھا جس پر ٹوٹا پھوٹا چھپر تھا۔ یہ کسی زمانے میں اصطبل تھا۔ اب وہاں گائیں اور بھینسیں بندھتی تھیں۔ گوبر اور پیشاب کی بو میں بیٹھ کر گاؤں کے غریب کسان اور کھیت مزدور پنچایت کر رہے تھے۔

پریگوا کی آواز زور زور سے گونج رہی تھی۔

وہ کہہ رہا تھا کہ "دوسرے گاؤں میں جو ہوا وہی یہاں بھی ہونا چاہئے۔ بھوک سے چوہے کی طرح مرنا آدمی کا کام نہیں ہے۔"

ایک بوڑھی آواز اندھیرے میں ابھری "سنا نہیں بسنت پور میں کیا ہوا۔ پولس والوں کی چوکی سرکاری کچہری میں بیٹھ گئی۔ مار مار کر کتنوں کی کھال ادھیڑ دی۔ عورتوں کو بے عزت کیا۔ اور پولس چوکی کا خرچ الٹا وصول کیا گاؤں والوں سے۔۔۔ یہ تو چوہے کی طرح مرنے سے بھی برا ہے۔"

"نہیں یہ چوہے کی طرح مرنے سے اچھا ہے۔ برا نہیں ہے۔" چار پانچ نوجوانوں کی گرجدار آوازیں ابھریں اور بوڑھی آواز سلسلاتی ہوئی دیوار کی طرح دھم سے بیٹھ گئی۔

اب کوئی نہیں بول رہا تھا۔ البتہ سرگوشی کی آوازیں ضرور ابھر رہی تھیں۔ کھسر کھسر پھسر پھسر جیسے بہت سے کتے ایک ساتھ ہانپ رہے ہوں۔ دانت کھیس رہے ہوں۔

"کل کوئی سرکاری بیگار پر نہیں جائے گا۔"

اس کی آواز ایک خاموش جھیل میں ایک بڑی سی چٹان کی طرح گری اور پھر خاموشی چھا گئی۔

"میں کہتا ہوں کوئی کل سرکاری کام پر نہیں جائے گا۔"

"ہاں نہیں جائے گا۔" کئی آوازیں بلند ہوئیں۔

"کل سرکاری کھلیان سے غلہ اٹھا کر نہیں ڈھوئے گا۔"

"ہاں نہیں ڈھوئے گا۔"

"کھلیان کو ہم گھیر لیں گے۔"

خاموشی چھا گئی۔

"ان چاولوں کو کالے بازار میں جانے سے گاؤں والے ہی روک سکتے ہیں۔ نہیں تو پھر بھوک مری کا راستہ کھلا ہوا ہے۔" یہ آواز گنوار کسانوں میں سے کسی کی نہیں تھی۔ یہ کسی پڑھے لکھے نوجوان کی آواز معلوم ہوتی تھی۔

"کھلیان کو ہم گھیر لیں گے۔" پریگوا کی آواز پھر ابھری اور سننے والوں کے سینے پر اس طرح گری جیسے پتھریلی زمین پر پھاوڑا گرتا ہے۔

"لیکن ہم کھلیان گھیر کر کیا کریں گے۔" کسی نے بہت مغموم اور جھجکتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

"ہم اپنے آپ کو مرنے سے بچائیں گے اور کیا کریں گے؟"

"ہاں ہم اپنے آپ کو مرنے سے بچائیں گے۔"
تھوڑی دیر کے بعد مجمع بکھر گیا۔

پریگوا اپنی جھونپڑی کی چوکھٹ پر رات بھر اسی طرح بیٹھا رہا۔ سوہنی اور جیٹھنا میں تھوڑی سی گالی گلوچ کے بعد صلح ہو گئی اور ان کے خراٹوں کی آواز ابھرنے لگی۔ کبھی درختوں کے اوپر بادل تیرتے اور کبھی بھینگ پر چاند سورج مکھی کے پھول کی طرح اتر آتا۔ دور گنے کے کھیتوں میں گیدڑوں کا شور بھی کم ہونے لگا تھا۔ ہوا میں تیزی اور تازگی پیدا ہو گئی تھی اور اس کی سنسناہٹ میں صبح کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ بھیگے ہوئے درختوں اور جنگلی پھول کے ساتھ ملی ہوئی گوبر اور زمین کی بو تیز ہوتی جا رہی تھی۔

چاندنی کا رنگ غبار کی طرح اڑنے لگا اور بادل دور دور جا نکے تو اس وقت ہوا کے تیز اور ضدی جھونکوں سے پریگوا کو جھرجھری آ گئی اور وہ جماہی لے کر اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے اپنا ڈنڈا اٹھایا اور جھونپڑی میں جھانک کر دیکھا۔ سوہنی بے خبر سوئی ہوئی تھی۔ جیٹھنا بھی سویا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ مگر اس جھپٹے میں اس کی ایک آنکھ پیال میں چھپی ہوئی مچھلی کی آنکھ کی طرح چمکتی نظر آئی۔

پریگوا مڑا اور کندھے پر ڈنڈے کو تولتا ہوا۔۔۔۔ کھلیان کی طرف بھاگا۔۔۔۔ وہ زور زور سے گا رہا تھا اور ٹھنڈی ہوا برف کے گالوں کی طرح اس کے پھیپھڑوں میں جم رہی تھی۔
میرا ڈنڈا کتنا سرخ ہے
اس نے سرسوں کا کتنا تیل پیا ہے
مجھے یاد ہے وہ رات جب
تیلی کے بیل نے مجھے اپنے سینگ دکھائے تھے
اور اس کا کتا مجھے کاٹنے کے لئے لپکا تھا
اور میرے اس سرخ ڈنڈے نے
جھپٹ کر اسے ٹھنڈا کر دیا تھا
ہاں اسے ٹھنڈا کر دیا تھا
ابھی اندھیرے اور اجالے کی لڑائی جاری تھی۔ صبح قریب ہو رہی تھی۔

ڈیوڑھی کے پچھواڑے گلیارے میں تین پالکیاں رکھی تھیں جو اس وقت بھُرتے کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ اٹھارہ کہار ایک بڑے سے جھرمٹ میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے اور تھوک رہے تھے۔ ان کی آواز اور دھندلے ہیولے فضا کو کافی پراسرار بنا رہے تھے۔

اندر حویلی میں ایک افسردگی اور مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ قاضی کی بیوی کے ہاتھ میں چاندی کا بڑا سا قلم دان تھا۔ اس میں نہ ایک قلم تھا اور نہ ایک دوات۔ اس میں اس کے زیورات تھے۔ اس کی دونوں بیٹیاں بھی سہمی سہمی کھڑی تھیں۔ ان کے ہاتھوں میں ایک ایک قلمدان تھا اور ان قلمدان میں بھی وہی روح تھی جو ان کی ماں کے قلمدان میں تھی۔

قاضی کے سر سے ٹوپی غائب تھی۔ اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ اس نے رات بھر جاگ کر اپنے براہیلوں کو دور دور دوڑا کر کہار منگوائے تھے۔ وہ رات بھر ٹہلتا رہا تھا۔ اسے بار بار شک ہوتا کہ وہ جس زمین پر کھڑا ہے وہ آہستہ آہستہ سرک رہی ہے۔ کئی بار تو اس نے جوتے اتار کر ننگے پیر سے زمین کو چھو کر دیکھا۔ لیکن زمین اتنی ٹھنڈی تھی کہ اس کے پیر میں بجلی سی لگتی اور پھر وہ جلدی سے اپنا جوتا پہن لیتا۔

اس کی بیوی نے صبح ہونے سے بہت پہلے دودھ گرم کیا اور اپنے بوڑھے شوہر کو ایک پیالہ گرم گرم دودھ کا پیش کیا۔ اس نے ایک ہی سانس میں سب دودھ پی لیا اور منہ بناتے ہوئے بولا۔ ”بیگم تم کتنی بدنصیب ہو۔“

”ہاں میرے بچے بھی بدنصیب ہیں۔“

”اب ہمیں شہر ہی میں رہنا ہوگا۔“

”ہاں یہاں تو مال اور جان خطرے میں ہے۔“

”ہاں سب کچھ خطرے میں ہے۔“ اس کی آواز بھرا گئی۔

”پولس کو کیوں نہیں بلاتے۔“

”آجائے گی“ قاضی نے منہ میں پان رکھتے اور دامن کے کونے سے آنکھوں کو چھوتے ہوئے کہا۔ ”آجائے گی۔ براہیل گیا ہے۔ داروغہ کے لئے روپے بھی بھیج دیئے ہیں۔“

”بھیج دیئے ہیں۔ اچھا کیا۔۔۔۔ سرکار بھی ہماری دشمن ہو گئی ہے۔ زمینداری ختم کرنے کا

ڈھونگ۔۔۔۔ان گنواروں کا سر بہت ہی آسمان پر چڑھ گیا ہے۔"

"اوہوں بیگم۔۔۔۔اب یہ زمینداری سرکار لے لے اسی میں جان کی خیر ہے۔ ہم سے یہ نہیں چل سکتی۔ سرکار تو پولس اور فوج کے زور سے چلائے گی۔ بس معاوضہ مل جائے پھر میں تو اپنی لوہے کی تجارت کو بڑھاؤں گا۔۔۔۔کیوں؟"

"اور کیا ہم پکے ہوئے آم۔۔۔۔کب ٹپک جائیں یہ کیا ٹھکانا۔ اپنے بچوں کے لئے دو چار لاکھ روپے کا انتظام تو کرنا ہی ہوگا۔۔۔۔ایں؟" قاضی کی بیوی نے ایک اور پان بنا کر اسے دیا اور اس کی پنڈلیوں کو دبانے لگی۔

صحن میں زرینہ اپنے برقعے کو ٹھیک کر رہی تھی۔ سنجیدہ اپنی بچیوں کو منا رہی تھی۔ مامائیں کٹھ چیلیوں کی طرح دوڑ رہی تھیں۔

ریاض جب اندر آیا تو اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ رات بھر نہیں سویا ہے۔

"آپ کہاں تھے ریاض بھائی رات بھر؟ ابا کتنا ڈھونڈتے رہے۔"

"اچھا تو تم سب ڈر کر شہر بھاگ رہے ہو؟" اس نے طنزیہ انداز میں اس کے سوال کو ٹالتے ہوئے کہا۔

"ڈر کر کیوں؟ شہر تو سیر کے لئے جاتے ہیں۔" زرینہ نے اسی طرح کہا۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔ لیکن اب کے تمہاری پالکیاں ڈیوڑھی کے سامنے کیوں نہیں۔ پچھواڑے میں کیوں ہیں؟ اس میں چوری کی کیا بات ہے؟"

"کمینے کہیں کے۔ تو گھر سے نکل جا۔" قاضی کی آواز گونجی۔ "زرینہ کس سے بات کر رہی ہو۔ چلو دیر ہو رہی ہے۔"

ریاض پلٹا اور ڈیوڑھی سے باہر نکل گیا۔

"ریاض بھائی۔" زرینہ نے اپنے قلمدان کو زور سے اپنے سینے سے لگالیا۔ اس کی آواز لبوں پر تیر کر رہ گئی۔

"میں جانتا ہوں ریاض آستین کا سانپ ہے' میں جانتا ہوں رات وہ کہاں تھا۔ اچھا جو سانپ پال سکتا ہے وہ سانپ کا سر بھی کچل سکتا ہے۔"

"جب کہار سواریوں کو لے کر تالاب کے ڈھلان کے کنارے کنارے سرکنڈوں کے جنگل

کے پاس پوکھر کی طرف اتر رہے تھے تو قاضی اپنی ڈیوڑھی کی چھت پر ٹہل رہا تھا اور آپ ہی آپ بک رہا تھا۔

دوسری طرف کھلیان سے آگے افق پر بادلوں کا شامیانہ گر گیا تھا اور ایک ہلکی سرخی بھاپ کی طرح آہستہ آہستہ پھیل رہی تھی ۔۔۔۔ اور اب کھلیان کے چاروں طرف گاؤں کے لوگ ڈنڈے لئے سمٹتے اور پھیلتے نظر آرہے تھے۔

قاضی نے اپنا خاص کمرہ کھولا۔ اپنی بندوق نکالی۔ رائفل کی نال صاف کی اور پستول میں چھ چھوٹے چھوٹے کارتوس بھر لئے۔ وہ بڑی مشکل سے بندوق لے کر چھت پر آیا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ اس نے اپنے گھریلو ملازم کو بلایا۔ وہ لنگی اور پھٹا ہوا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اندر ایک بنیان بھی نہیں تھی۔ اس کا منہ اترا ہوا تھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔

"بینگو کے بچے دیکھ تو کہیں دور دور موٹر کی گرد دکھائی دیتی ہے؟"

بینگو نے اچک کر مینڈیر پر پیر رکھ دئے اور اوپر اٹھتے ہوئے دیکھا۔

"سرکار ایک جگہ گرد اڑتی دکھائی دیتی ہے۔"

"کہاں" قاضی بندوق لے کر کھڑا ہو گیا۔

"لیکن یہ موٹر کی گرد نہیں سرکار۔ وہاں کچھ جانور ہیں سرکار۔"

"سور کے بچے۔۔۔۔ جا میرے کمرے سے رائفل اور پستول لے آ۔"

بینگو بھاگتا ہوا نیچے چلا گیا۔ بینگو بچپن سے اسی طرح بھاگ رہا تھا۔ اس کی پچھلی سات پشتیں قاضی کے یہاں نمک کھاتی رہی تھیں۔ یہ سات پشتیں ماماؤں کی نسلیں تھیں۔ بینگو اس نسل میں پہلا مرد تھا۔ اور یہ گھاٹے کا سودا رہا تھا۔ لڑکیاں بہت کام آتی رہی تھیں۔ سرکاری خاندان میں ان ماماؤں کی نسلیں چلتی رہتی تھیں لیکن ان کی شادی کبھی نہ ہوتی تھی۔ جب یہ نئے مفلس چراغ جل اٹھتے تو ان کے باپ کے بارے میں کوئی کچھ پوچھتا بھی نہ تھا۔ دل ہی دل میں ماما کی لڑکی کی پیدائش سے اندازہ لگا لیتے کہ جب بچی کی بنیاد پڑی تو بیگم میکے گئی ہوئی تھیں یا خود زچگی کی منزل سے گزر رہی تھیں۔ بینگو کو اپنے باپ کا پتہ نہیں تھا۔ لیکن وہ جانتا تھا کہ قاضی اس کا باپ ہے۔ بس بات صرف اتنی تھی کہ وہ اس کا جائز لڑکا تھا اور وہ اس کا حرامی باپ!

بینجو پستول اور رائفل لے آیا۔ اور ترچھا کھڑا ہو گیا جیسے اسے ڈر تھا کہ قاضی اسی کو نشانہ بنا لے گا۔ قاضی ایک زمانے کے بعد اس بندوق 'رائفل' پستول کو ہاتھ لگا رہا تھا۔ جوانی میں جب اسے شکار کا شوق تھا ہریل اور بطخیں مار کر لایا کرتا تھا۔ رائفل تو چور اور ڈاکوؤں کے شکار یا فوجداری میں کام آتی ہے۔ پستول کو اس نے آخری بار اس وقت چھوا تھا جب اسے اپنی بیوی کے چال چلن پر شبہ ہو گیا تھا اور دیر تک یہ سوچتا رہا تھا کہ خودکشی کر لے یا بیوی کو مار ڈالے۔ لیکن پستول اس کے ہاتھ سے گر گیا اور وہ دونوں میں سے کسی کو نہ مار سکا۔ اپنے ضمیر کو مارنے میں اسے زیادہ فائدہ نظر آیا۔

دن بھر وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ تھانے سے کوئی خبر نہیں آئی۔ اس کا دل بیٹھنے لگا۔ کھلیان سے گانے اور نعرے کی آواز آ رہی تھی۔ کبھی کبھی کتے بھونکنے لگتے تھے۔ کنوئیں پر عورتیں گا رہی تھیں۔ وہ دانت پیس رہا تھا۔ اس نے بینجو کو دن بھر اتنا دوڑایا تھا کہ اسے بخار آ گیا تھا اور وہ اطمینان سے قاضی کے خاص کمرے میں لحاف کے اندر گدے پر سو رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ قاضی چھت سے اس وقت تک نہیں اترے گا جب تک کہ پولس نہ آ جائے۔ ڈیوڑھی کے سارے دروازے بند کر لئے گئے تھے اور ڈیوڑھی میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ البتہ آنگن میں زرینہ کی چپل کے پاس دو گلہریاں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگ رہی تھیں۔

رات اپنے ساتھ خوفناک سردی اور ہواؤں کا طوفان لے کر آئی۔

کھلیان میں الاؤ جل رہا تھا۔ وہ۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔وہ۔۔۔۔۔ شعلوں کی لپٹیں ہر طرف لپک رہی تھیں۔ دو دو تین تین کی ٹولیاں بنی ہوئی تھیں۔ گاؤں کے کاشتکاروں نے انہیں سمجھایا بھی کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں اس میں پس جائیں گے۔ لیکن سب کے سب خاموش اپنی جگہ ڈٹے رہے۔ ڈیوڑھی میں اس رات ایک لالٹین بھی نہیں جلی۔ ان سے چھت کی روشنی دھیمی دھیمی نظر آ رہی تھی۔ اس روشنی میں سفید دیوار کے پس منظر میں ایک لحیم شحیم سایہ ایک طرف سے دوسری طرف بڑھتا اور پلٹتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

سردی ڈھلتی چلی جا رہی تھی۔ رات اب ڈھلنے لگی تھی۔ الاؤ میں چھوٹی چھوٹی جنگلی لکڑیاں اور گھاس پھوس کے علاوہ اس کے چاروں طرف بیٹھے ہوئے لوگ تنکے چن چن کر ڈال رہے

تھے۔ سب کی آنکھیں الاؤ کی روشنی میں چمک رہی تھیں پر یگوا کی آنکھیں پھیل گئی تھیں۔ اس کے ہونٹ بھنچ گئے تھے اور اس کی ہڈیوں کے پاس کی رگیں ٹوٹتی اور بولتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ الاؤ کا عکس اس کی آنکھوں میں پڑ رہا تھا۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا۔ آسمان دھلا اور نکھرا ہوا تھا اور ستارے گرد کی طرح اڑ رہے تھے۔

"اب ایک پہر اور ہے رات۔۔۔۔"

سب کی آنکھیں پر یگوا کی طرف اٹھ گئیں۔ الاؤ زور سے بھڑ کا اور اس میں سے چنگاریاں ہوا میں اڑیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس مجمع کا قانون خاموشی تھی۔ پر یگوا نے رات کی موت کا اعلان کر کے گویا اس قانون کی بے حرمتی کی تھی۔

"سویرا ہونے والا ہے۔۔۔۔۔ سنا۔۔۔۔ بطخیں سیتا کنڈ کی طرف اڑتی چلی جا رہی ہیں۔۔۔۔"
پر یگوا نے الاؤ کو اپنے ڈنڈے سے کریدتے ہوئے کہا۔

"آج اصطبل سے گھوڑا نہیں نکالو گے ؟" کمبل میں لپٹے ہوئے ریاض نے کہا۔ وہ ایک گٹھر بنا ہوا تھا۔ صرف اس کی آنکھیں سلگتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ ریاض بابو کی بات۔۔۔۔ "آج اصطبل سے گھوڑا تو گھوڑا گدھا بھی نہیں نکلے گا۔۔۔۔"

دوسرے گاؤں سے موذن کی اذان اور مرغوں کی بانگ کی آواز آئی۔ سب خاموش ہو گئے۔ پر یگوا صبح کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اب کیا ہو گا۔ وہ کانپ رہا تھا۔ کل کیا ہو گا۔ چھوٹے سرکار کیا کریں گے۔ کیا زمیندار غلے میں حصہ دار بنانے کے لئے تیار ہو جائے گا۔ کیا وہ باہر کے آڑھتیوں کو غلہ دینا بند کر دے گا۔ وہ سب جنم جنم سے اس کی بیگاری کر رہے تھے۔ کیا وہ انہیں موت کے منہ سے بچا لے گا۔ پھر مرغوں کے بولنے کی آواز آئی۔

کلیا مانجھی نے گیت گانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر میں الاؤ کی روشنی کے ساتھ گیت کی آواز بڑھنے لگی۔ سبھی ٹھنڈے جھونکوں کے باوجود اپنا اپنا چہرہ باہر نکال کر گیت میں اپنی آواز ملانے لگے۔ کلیا کا پھٹا ہوا کمبل کندھے تک ڈھلک آیا۔ اس کا گھٹا ہوا سر چمکنے لگا اور اس کے دانتوں کی چمک بڑھ گئی۔ اس کا جسم گیت کی لے کے ساتھ آہستہ آہستہ پھڑکنے لگا تھا۔

پر یگوا الاؤ کو کرید کرید کر چنگاریوں کو بھڑکا رہا تھا۔ اس کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ اندھیری رات کا رنگ تیزی سے پھیکا ہو رہا تھا۔ الاؤ کی چاروں طرف لوگوں کی آنکھیں دھوئیں اور سردی سے سرخ تھیں اور پپوٹے بھاری ہو کر سوجے سوجے نظر آرہے تھے۔

گنے کے کھیت کی طرف ایک آدمی زور زور سے چیختا چلا آرہا تھا۔ سب کھڑے ہو گئے۔ گیت رک گیا۔ دوسری طرف کنوئیں کے پاس پگڈنڈیوں کی طرف سے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز آئی۔ الاؤ کو زور سے کسی نے کرید دیا۔ اور چنگاریاں کھڑے ہوئے انسانوں کے سر سے بھی اڑنے لگیں۔ لوگ کبھی کنوئیں کی طرف بھاگتے اور کبھی گنے کے کھیت کی طرف۔ پر یگوا سب سے آگے ڈنڈا تان کر کھڑا ہو گیا۔
"کیوں مر رہے ہو کتو۔۔۔۔ کیوں مر رہے ہو کتو۔۔۔" جیھنا لہولہان ننگے بدن کھڑا ہانپ رہا تھا۔

"کیا ہوا۔۔۔ جیھنا کاکا تو کیوں چلا آیا یہاں۔۔۔ دیکھ تو کتنا خون نکل رہا ہے۔۔۔" کلیا نے قریب ہوتے ہوئے کہا۔ جیھنا اپنے پھٹے پھٹے زخمی بدن پر اور خون سے چپچپاتے ہوئے ہاتھ سے اپنی تھوڑی کھجلاتے ہوئے الاؤ کے پاس بیٹھ گیا۔
"پوری گاڑی ہے۔ پوری گاڑی۔۔۔ باپ رے باپ۔"
"کیا باپ رے باپ ؟ کیا پوری گاڑی؟" ایک ساتھ سب نے پوچھا۔ اور آوازیں گونجنے لگیں۔
"سپاہی' بندوق ...... باپ رے باپ۔" وہ پر یگوا کو گھور رہا تھا جو اپنے ڈنڈے کو زمین پر گاڑے پتھر کے مجسمے کی طرح اکڑا کھڑا تھا اور اپنے باپ پر اپنی طرف سے غضب اور حقارتیں انڈیل رہا تھا۔
"بہت بہت سے سپاہی۔ بہت بہت بندوقیں۔۔۔۔" جیھنا کی آواز دبتی چلی گئی۔ وہ ڈیوڑھی سے متصل کھنڈر کو دیکھنے لگا جہاں پہرہ دیتے ہوئے رات کے وقت کسی چیز نے اسے چھوا اور اس کی چبھن کوڑھ میں بدل گئی تھی۔ وہ ساکت ہو گیا اور اپنی آنکھوں سے ادھر گھورنے لگا۔ اب اس کے پھٹے ہوئے ہونٹوں سے بھی خون کے قطرے ابھرنے لگے تھے۔

"کیا ہو گیا ہے بڈھے کو؟" کسی نے کہا۔
"ڈر گیا ہے۔۔۔۔" دوسرے نے کہا۔
جیٹھنا کی آنکھیں چیل کی طرح ان آوازوں کی طرف جھپٹیں۔
"پر یگوا۔۔۔۔ بیٹا میں بھی تیرے ساتھ ہوں۔۔۔۔ پر یگوا بیٹا۔۔۔۔ بیٹا۔۔۔۔" وہ جا کر اپنے خون بھرے سڑے ہوئے جسم سے پر یگوا سے لپٹ گیا۔ "ڈیوڑھی میں سانپ رہتا ہے۔۔۔۔ چل چل اسے مار ڈال۔۔۔۔ چل چل۔۔۔۔' وہ خون سے لت پت پھر الاؤ کے پاس جھک گیا۔ کھیتوں کی کھونٹیوں اور سرکنڈوں کے پتوں نے اسے جگہ جگہ نوچ لیا تھا۔ وہ اس وقت ایک خوفناک ریچھ معلوم ہو رہا تھا۔

ڈیوڑھی کی طرف سے کوؤں کا ایک جھنڈ کائیں کائیں کرتا ہوا سر پر سے گزر گیا۔ کانوں میں اچانک گھنگھناہٹ ابھرنے لگی۔ پر یگوا نے ٹیلے پر کھڑے ہو کر اشارہ کیا۔ سب ٹیلے پر چڑھ آئے دو تیز شعاعیں بڑھتی آ رہی تھیں۔

الاؤ کے چاروں طرف سب جمع ہو گئے۔ ٹیلے پر صرف جیٹھنا کھڑا رہا۔ وہ اب اس طرح کھڑا تھا جیسے کوڑھی نہیں تھا۔ وہ جوان تھا اور اس کے ہاتھ میں ایک سرسوں کے تیل میں رنگا ہوا سرخ ڈنڈا تھا اور اس کی ہانک کی آواز ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں جا سکتی تھی۔۔۔۔

کلیا نے پھر گیت گانا شروع کر دیا۔ اس کے گیت میں سب کی آوازیں مل رہی تھیں۔ اس کی آواز سب سے زیادہ تیز تھی اور ایسا معلوم ہوتا تھا چٹانوں کے بیچ سے دوڑتے ہوئے نالے میں مختلف بلندیوں سے بہت سے چیختے ہوئے چشمے گر رہے تھے۔

گاؤں کا ہاتھی دیوانہ ہو گیا ہے
بھائیو۔۔۔۔ یارو۔۔۔۔ یہاں آؤ
آؤ اس ہاتھی کو گھیر لیں
یہ ہم میں سے ایک ایک کو سونڈ میں اٹھا لیتا ہے
اور برگد کی شاخ کی طرح چیر دیتا ہے
پھینک دیتا ہے

آؤ آج اس ہاتھی کو گھیر لیں
آؤ اس کے پیروں میں زنجیر ڈال دیں
اور اس کی سونڈ کو کاٹ دیں
اپنی درانتی سے
گاؤں کا ہاتھی۔۔۔۔

گاؤں کے اور لوگ بھی پولس ٹرک کی گھنگھناہٹ سن کر باہر نکل آئے اور ڈیوڑھی اور کھلیان کے درمیان کھڑے ہو گئے۔ ٹرک کی دونوں آنکھیں قریب آ رہی تھیں اور وہ اب سرکنڈوں کے جنگل سے جھانک رہی تھیں۔ اندھیرا سرک گیا تھا۔ دھند چھائی ہوئی تھی۔ ستارے صبح کا غازہ بن گئے تھے۔۔۔۔

کلیا نے سینہ پھلا کر پھر زور سے گیت کو الاپا۔۔۔۔

گاؤں کا ہاتھی۔۔۔۔

سب نے ڈنڈے ہاتھ میں اٹھالئے اور ان کی آوازیں اور تیز ہو گئیں۔ اسکول کے پاس ٹرک رک گئی اور اس میں سے سپاہی کود کود کر قطار میں کھڑے ہونے لگے۔ ڈیوڑھی اسی طرح اونگھتی رہی۔ کھنڈر کی آنکھیں اسی طرح اندھی رہیں۔ ہاں کھیت جاگتے رہے' دھڑکتے رہے اور جب سپاہیوں کی قطار اونگھتی ہوئی خاموش ڈیوڑھی کے سامنے آکر ایک آہنی دیوار کی طرح کھڑی ہو گئی تو جھیٹنا انگلی اٹھا کر ٹیلے پر سے زور سے چیخا اور ٹیلے پر سے لڑھکتا ہوا الاؤ تک چلا آیا جو بجھ رہا تھا۔۔۔۔ اور آج اس کی آواز جوانی کے دنوں کی طرح دور دور کھیتوں پر سے دوڑتی ہوئی صاف سنسناتی ہوئی نکل گئی۔

پر یگوا بیٹا پر یگوا
دیکھ کھنڈر میں سے سانپ نکل آئے ہیں
یہ جسے چھوتے ہیں کوڑھی ہو جاتا ہے
دیکھ مجھے اور ان سانپوں کو پھر بل میں گھسنے نہ دے
پر یگوا۔۔۔۔ بیٹا۔۔۔۔ پر یگوا

یہ سارے سانپ کے بلوں سے نکل آئے ہیں۔ حویلی میں اندھیرا ہے۔ خاموشی ہے۔ بندوق دیوار پر لٹکی ہوئی ہے اور اب قاضی کو ایک قیامت کا اندازہ ہو گیا ہے۔ ہر چیز متحد ہو گئی ہے۔ ہر شئے ٹھنڈی ہے اور بے جان۔ ڈیوڑھی اور کھیت لگتا ہے رات کو آواز دے رہے ہیں اور ہوا کے تیور بدل رہے ہیں۔

○

آزردہ ستاروں کا ہجوم

(’آگ کا دریا‘ کی مصنفہ کے نام)

رات ابھی بھیگی نہ تھی مگر ’پرفلا سرکار‘ کے فلیٹ میں سرشاری کی وہ منزل آگئی تھی جب بات بات پر جام سے جام ٹکرائے جاتے ہیں‘ بات بات پر ٹھنڈی سانس بھری جاتی ہے اور آنکھیں مسکراتے مسکراتے بھیگ جاتی ہیں‘ جیسے مے کی گرمی سے دلوں کے آبگینے پگھلے جارہے ہوں۔

”خلیل ــــــ ہائے‘ کیا بجلی تھی!“ بان نے کشمیری نرمی سے کام لیتے ہوئے خلیل کے جام سے جام ٹکرایا۔

”بلی؟ کس کا بلی؟“ سرکار نے اپنے سیاہ بنگالی چہرے پر چمکدار مسکراہٹ کی پالش پھیلاتے ہوئے چونک کر پوچھا۔ اس کے جام میں ”کوین آف کونیز“ کا پگھلا ہوا سونا بھی اس کی مسکراہٹ کی طرح چمک رہا تھا اور میز پر کٹ گلاس جیسی بوتل بھی چمک رہی تھی۔ اس کے چہرے میں کسانوں والا بھولپن تھا لیکن اس پر یورپ میں آٹھ دس سال کے رہن سہن نے خود پرستی کا شفاف غلاف ڈال دیا تھا۔

بان کا مخملیں منہ تمتما اٹھا اور اس کے بند گلے کے بھورے سرکاری کوٹ میں کسی ہوئی شریفانہ توند پر بٹن ٹوٹتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اس نے جام خالی کیا اور بھیگی ہوئی آنکھوں سے محفل پر نظر ڈالی‘ کیونکہ اس نے جو بات سرگوشی میں کہنا چاہی تھی اس پر پوری محفل کے کان کھڑے ہوگئے تھے۔ سبھوں نے خمار کے سنسناتے ہوئے بوجھ سے بند ہوتی ہوئی آنکھیں کھول کر کشمیری دوست کی طرف دیکھا جس کے منہ سے پچھلے ڈیڑھ گھنٹے میں یہ پہلا فقرہ نکلا

تھا۔ خلیل بھی چونک پڑا جس پر پہلا جام چھوتے ہی یک گونہ بے خودی طاری ہو جاتی تھی۔ اس کی چیل کی چونچ جیسی سید ناک (جس کی وجہ سے اس پر یہودی ہونے کا شبہ ہوتا تھا) اور عینک کے دبیز شیشوں کے پیچھے جلتی بجھتی آنکھیں بان کی طرف مڑ گئیں۔ اس کا چہرہ لمبوترا تھا' کلہاڑی نما۔ بان کا جملہ سن کر اس کا چہرہ اور بھی لمبا ہو گیا جس پر ڈیڑھ گھنٹے کی شراب نوشی کے بعد بھی وہی مرجھائے ہوئے گیندے کے پھول والی زردی چھائی ہوئی تھی۔

''آئیس پلیز۔۔۔۔'' غالب نے بڑے منجھے ہوئے انگریزی لہجے میں کہا اور وہسکی کا گلاس انتا سرکار کی طرف بڑھایا۔ میزبان کے ہونٹ سفید چہرے پر لال مرچوں کی طرح جل رہے تھے۔ انتا سرکار نے سنہرے بالوں کو دلبری کے مغربی انداز سے ذرا سا جھلایا' سرمہ زدہ نیلی آنکھوں کی پلکیں جلدی جلدی گرائیں اور اٹھائیں اور برف کا چمکتا ہوا ایک بڑا سا ٹکڑا چمکتے ہوئے چمٹے سے غالب کے چمکتے ہوئے گلاس میں ٹپکا دیا۔

حسین اور چنچل میزبان کے مڑنے سے پہلے غالب نے ہلکے سے میزبان کا گال تھپتھپا دیا۔ اس کے تمام جاننے والے جانتے تھے کہ وہ عورتوں کے معاملے میں ''ایٹی کیٹ'' کا بڑا خیال کرتا تھا اور ان کا شکریہ اسی طرح ادا کرتا تھا۔ جبھی تو گوریا کی طرح پھدک کر عورتوں کے دلوں میں گھر کر لیتا تھا جن کی عمر سولہ سال بھی ہو سکتی تھی اور پینتالیس سال بھی۔

انتا سرکار بل کھاتی ہوئی خلیل کی طرف بڑھ گئی جو اب تک مبہوت نظروں سے بان کو دیکھ رہا تھا۔ غالب محفل کو بھول گیا اور وہسکی کی چسکیاں لیتا ہوا پھر صوفے پر بیٹھ گیا جس کے کونے میں مس سنہا بیٹھی تھی۔ اس نے نظر بھر کر مس سنہا کی طرف دیکھا' ایک ٹھنڈی سانس لی اور گاگاں کی تصویر کی طرف وہسکی کے گلاس سے اشارہ کرتے ہوئے ہنس کر بولا: ''مس سنہا' آپ جانتی ہیں یہ تصویر پہلے یہاں کی پبلک لائبریری میں تھی۔ ہمارے قومی نیتاؤں نے کہا' اس ننگی تصویر سے نوجوانوں کے چال چلن کا ناس ہوتا ہے۔ تصویر ہٹا لی گئی اور پر فلا سرکار نے خرید لی۔ آپ شاید نہیں جانتیں سرکار 'آرٹ' پر جان دیتا ہے۔ میں اور وہ لندن میں ٹیٹ گیلری میں گھنٹوں کھوئے رہتے تھے۔ میں تو خیر رُوواں کے غلاموں پر مرتا تھا۔'' وہ مس سنہا کے بالکل پاس سرک گیا اور اس کے چہرے پر بے نیازی کی پگھلی پگھلی کیفیت طاری ہو گئی۔

مس سنہا کو پیتے ہوئے مرد کے چہرے پر 'یا ہاتھوں ہاتھ لو مجھے مانند جام مے' والی کیفیت بڑی خطرناک لگتی تھی۔ وہ گھبرائی اور سنبھل کر کچھ اس انداز سے بیٹھ گئی کہ 'آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟'

"آپ شاعری کرتے ہیں نا؟"

غالب نے اس کا سوال سنا ان سنا کر دیا کیونکہ تخلص تو اس نے سکول کے زمانے ہی میں رکھ چھوڑا تھا لیکن آج تک بیالیس سال کی عمر میں بھی پہلا شعر کہنے کی نوبت نہیں آئی تھی۔ تخلص اس کے گلے یوں پڑا کہ لڑکپن ہی سے اس کا مزاج عاشقانہ تھا اور وہ شاعروں کی بری صحبت میں پڑ گیا تھا جو اسے پان کھلا کھلا کر اس کے نمکین بھولے چہرے کے قصیدے پڑھا کرتے تھے۔ بعد میں اسے اپنے نام گورچرن سے نفرت ہوگئی۔ اس کا قد بوناسا تھا لیکن تھا وہ بڑا جامہ زیب 'جس میں شہر کے اچھے اچھے درزیوں کی معاملہ فہمی کا بڑا ہاتھ تھا۔ کوٹ کی کاٹ ایسی ہوتی تھی کہ اس کے تنگ شانے کافی چوڑے اور متناسب معلوم ہوتے تھے۔ اگر کسی محفل میں اس کی مڈبھیڑ کسی سرو قد عورت سے ہو جاتی تو وہ اس کے نزدیک اس وقت تک دوبارہ نہ پھٹکتا جب تک کہ وہ کہیں بیٹھ نہ جاتی۔ عورت بیٹھی رہتی اور وہ فوجی انداز سے پنجوں کے بل اٹھنے کی کوشش کرتا۔ کبھی کبھی وہ عورتوں کو سنا کر کہتا :"ہائی ہیل والے جوتے پہننا دراصل 'انفیریریٹی' کا مپلکس کی نشانی ہے۔"

وہ دراصل بال صفا صابن کی ایک چھوٹی سی کمپنی کا مالک تھا۔ ساتھ ہی وہ ایک ڈرامہ کمپنی کا ڈائریکٹر بھی تھا۔ اس کا بال صفا صابن خوب چلتا تھا مگر ڈرامے کم 'جو وہ خود ہی لکھتا تھا اور خود ہی ڈائریکٹ کرتا تھا۔ وہ اپنی زندگی کے افسردہ لمحوں میں (جو شاذ و نادر ہی میسر آتے تھے) سوچا کرتا تھا: 'کاش میرے ڈرامے بھی بال صفا صابن کی طرح چلتے۔' اس کا دل دکھتا اور آنکھیں بھیگ جاتیں۔

اس نے دیکھا کہ مس سنہا کی آنکھیں جال میں پھنسے ہوئے پرندے کی طرح تڑپ رہی ہیں۔ ان آنکھوں میں سراسیمگی نہ تھی لیکن ایک قسم کا دبا دبا ہیجان ضرور تھا۔ عورت کی آنکھوں کا یہ ہیجان اسے بہت پسند تھا۔ وہ اس میدان کا شہسوار تھا' سب جانتا تھا۔ اسے کان جلتے ہوئے' آنکھیں نم ہوتی ہوئیں اور ٹائی کا پھندا کستا ہوا محسوس ہوا۔ اس نے طوفان دیدہ ملاح کی

طرح بڑی جواں مردی سے اس جذباتی یلغار کا مقابلہ کیا اور جام کے چھلکنے سے پہلے ہی اسے خالی کر گیا۔

"آپ تو پیتے ہی چلے جاتے ہیں۔"

غالب کو لگا مس سنہا نے اس کے کان میں کچھ کہا' حالانکہ سچی بات یہ ہے کہ کچھ کہنا تو در کنار مس سنہا نے اس کی طرف دیکھا بھی نہ تھا۔ وہ تو نہ جانے کب سے ' ٹھیک اپنے پیروں کے پاس' قالین پر' کسی چیختے چنگھاڑتے بھنور کا نظارہ کر رہی تھی۔

غالب نے شاعرانہ بے خیالی میں مس سنہا کے گھٹنے پر ہاتھ رکھ دیا اور گنگناتی ہوئی آواز میں کہا: "گاگاں کی عورت اپنی 'نیوڈیٹی' میں اتنی پاک کیوں معلوم ہوتی ہیں؟" مس سنہا کا جسم اسے بڑا ٹھنڈا اور بے حس سا لگا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ زندگی میں شاید پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اس نے اپنی شاعرانہ بے خیالی میں کسی عورت کا جسم چھوا تھا اور وہ جسم اس کے ہاتھ کے لمس سے لرزا نہ تھا۔

محفل نے اس سلجھے ہوئے ڈرامہ نگار کی اداکاری دیکھی اور خلیل نے کہا: "آخر غالب آج اکیلا کیوں آیا ہے؟ بیوی کہاں ہے؟" ویسے بیویاں بان اور خلیل کی بھی نہیں آئی تھیں لیکن سب جانتے تھے کہ بان کی بیوی' جو نیم اپاہج تھی' اس لئے نہیں آئی تھی کہ غریب کشمیرن اس محفل کی انٹلیکچول فضا میں نہیں چل سکتی تھی اور خلیل کی بیوی اس لئے نہیں آئی تھی کہ وہ شراب نوشی اور زنا بالجبر کو تقریباً ایک ہی پائے کا گناہ سمجھتی تھی۔ لیکن غالب کی بیوی' جو شوہر سے چھ سال بڑی تھی اور قد میں بھی کم از کم تین انچ نکلتی ہوئی تھی اور جو اپنی زبان کی شاعرہ تھی' ایسی محفل میں ضرور شریک ہوتی تھی اور لوک گیت گا کر اپنی آواز کے شعلے سے فلسفیانہ بحثوں کا سارا بوجھل پن اور انجمن میں تنہائی کے احساس کا سارا غبار دور کر دیتی تھی:

'تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے۔'

جب غالب نے دوبارہ گاگاں کی تصویر کی طرف بھاپ اگلتی ہوئی پیاسی آنکھوں سے دیکھا اور پر فلا سرکار کی مصوری نوازی کا ذکر شروع کیا تو مس سنہا نے سانس روک کر اسے دیکھا اور بولی' جیسے اپنے آپ سے باتیں کر رہی ہو: "دیکھئے مجھے تو لیونارڈو داونچی کی 'مونا لیزا' پسند ہے

کیونکہ اس میں انسانیت سے زیادہ Divinity ہے۔ ایک طرح کی شان کبریائی ہے۔" اور جب وہ یہ کہہ رہی تھی تو اسے صاف یاد آ گیا کہ اس نے یہ کسی کتاب میں پڑھا تھا اور اصل میں یہ خیال آرٹ کے مشہور مورخ 'واسارے' کا تھا۔ اس نے بچوں کی طرح ہونٹ پچکاتے ہوئے کہا: "ہاں' سچ یہ پینٹنگ نہیں ہے' یہ تو مصوروں کی...... پر کیا کہوں...... اس وقت میری آنکھوں میں 'لوو' کی وہ بڑی سی دیوار جھلملا رہی ہے جس پر ایک چھوٹی سی تصویر ہے عورت کی' جو ہاتھ باندھے کھڑی ہے۔ وہ اس کی آنکھیں اور وہ مسکراہٹ۔ وہ مسکراہٹ نہیں ہے' خود لیونارڈو کا دل ہے۔ اس مسکراہٹ میں کیسی Moral شانتی ہے' انسان کی معصومیت کا......"

غالب کا منہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے جلدی سے آنکھیں جھپکاتے ہوئے اپنے چھوٹے سے دہن میں بڑا سا گہرے تمباکو کے رنگ کا سگار دبا لیا۔ دھواں اس کے چہرے پر تیرنے لگا۔

"جب انسان کے چہرے پر دھواں تیرتا ہے"" مس سنہا مسکرائی اور اسی لے میں کہنے لگی' "اور آپ نے واٹیکن کی خانقاہ میں مریم کی گود میں عیسیٰ کا ڈھانچہ دیکھا ہے نا' مصلوبی کے بعد' زردی مائل سنگ مرمر میں کیسی جان پڑ گئی ہے! اس کو دیکھ کر میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے......" مس سنہا کے چہرے پر راہبانہ زردی چھا گئی۔ اطالوی زبان میں کیا کہتے ہیں؟ ہاں' 'پیتا'...... اور اس کے پیچھے جو انسانی پیکر ہے' دراصل وہ 'مائیکل انجلو' کا اپنا......"

بان کی آواز یکا یک تیز ہو گئی۔ اس نے جام منہ سے لگایا اور پوری محفل پر خاموشی چھا گئی۔ اس میں اس کے گلے سے نکلتی ہوئی غٹ غٹ کی آواز بڑی مضحکہ خیز محسوس ہو رہی تھی۔

"مجھے اطالوی زبان نہیں آتی لیکن روم میں مجھے دو لفظ یاد ہو گئے تھے: 'سالے' یعنی نمک اور 'پے پے' یعنی مرچ۔ ہاہا۔ ہاں ہاں میں نے بھی دیکھا تھا وہ سنگ مرمر کا......" غالب نے موقع غنیمت جان کر چرخہ کاتنا شروع کر دیا۔

خلیل نے جڑ دیا: "مونالیزا تو مجھے مرد معلوم ہوتی ہے۔"

زوردار ڈیل ڈول کا ادھیڑ ملازم اندر آیا اور اس نے تندوری مرغوں کی پلیٹیں کھانے کی لمبی میز پر رکھ دیں جس پر پہلے ہی پلیٹیں' کانٹے' چھریاں' سلاد کی پلیٹیں' رائتے کی قابیں اور گلاس

سجائے جا چکے تھے۔ میز کے دونوں کناروں پر نیپکن رکھے ہوئے تھے۔ ملازم نے پوری میز پر نظر ڈالی۔ اسے مرغوں کی اٹھی ہوئی ٹانگیں بڑی دلچسپ معلوم ہوئیں: 'یہ دعا کے لئے اٹھے ہوئے ہاتھ!' آیا نے اسے نانوں کی پلیٹ' آلو گوبھی اور ٹماٹر کی ترکاری کا بڑا سا پیالہ تھما دیا۔ اس نے آیا کو دیکھا بھی نہیں۔ وہ چلی گئی۔ وہ اس وقت آیا کو دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے مرغا زندہ نظر آرہا تھا: دانہ چگتا ہوا' ککڑوں کوں بولتا ہوا' پر پھلا کر مرغیوں پر ڈورے ڈالتا ہوا مرغا! اس نے پلٹ کر محفل پر نگاہ ڈالی۔ اس کی نگاہوں نے کہا:

"دست نازک بڑھائیے صاحب
مرغ حاضر ہے کھائیے صاحب!"

خلیل نے بان کی کسی بات پر زور سے قہقہہ لگایا لیکن فوراً اس کے ہونٹ چپک گئے' جیسے اس سے کوئی غلطی سرزد ہوگئی ہو۔ اس نے پھر منہ بسور کر کہا: "واہ بے مرغے!" ملازم مسکرایا۔ پر فلاسر کاران نگاہوں اور مسکراہٹ کے معنی سمجھتا تھا۔ اس نے گلا صاف کیا اور ٹائی کی ناٹ کھول کر Friends to dinner کا نعرہ لگانے ہی والا تھا کہ سب کے کان مس سنہا کی آواز پر کھڑے ہوگئے: Don't be silly' سب کی نظریں اس طرف اٹھ گئیں جہاں بڑے سے گول مرتبان کے سفید پانی میں دو رنگین مچھلیاں تیر رہی تھیں اور غالب کی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور سرخ مچھلی کی دم بھی' جو مرتبان کی دیوار کے ساتھ ٹکرا رہی تھی۔ آہستہ آہستہ کانپ رہی تھی۔

"مس سنہا' ذرا دیکھئے یہ مچھلی اپنی گول گول آنکھوں سے آپ کو دیکھ رہی ہے۔ آخر مچھلیوں میں اتنی aesthetic sense کہاں سے آجاتی ہے؟" گورچرن نے سرگوشی میں کہا۔
"نہیں' آپ کو دیکھ رہی ہے۔ یہ آپ سے کس نے کہہ دیا کہ ......"
"مس سنہا" گورچرن نے بڑا سا پٹیالہ شاہی گھونٹ پیتے ہوئے اور بغلیں جھانکتے ہوئے کہا' "مس سنہا' میری مانئے' یہ مچھلیاں دیکھتی ہیں۔ بالکل ہماری آپ کی طرح دیکھتی ہیں۔ کسی سائنس داں کا قول ہے......"
"جانتی ہوں۔ جانتی ہوں۔ انھیں پکاسو کی پینٹنگ بھی ویسی ہی نظر آتی ہے جیسی آپ کو......
ہے نا؟"

"دیکھئے یہ پکاسو کی پینٹنگ ہے: لڑکی گیند پر کھڑی ہے 'سمندر کے کنارے۔ ذرا اس کا جسم دیکھئے 'جسم۔۔۔۔یہ جسم نہیں 'شعلہ ہے۔ شعلہ 'جو ہوا سے کھیلتا ہے...... یہ balance!"

لیکن شعلہ کہاں ہے؟ اور ہوا؟ وہ سنا ہے آپ نے: 'بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ!'

"ذرا دوسری طرف پتھر کے کھردرے کڑیل مرد کو دیکھئے۔" گورچرن نے اپنی دھن میں اڑنے والا سانپ دکھانے والے کی طرح کہا "ہڈیاں 'گوشت 'کھال 'جبڑے پٹھے اور سب کچھ ......اور انسان کا جسم ...... اور ایسا تو وہ...... صرف جسم 'طاقت 'لیکن وہ نزاکت ...... پھول کی سانس 'وہ موہوم سی......"

گورچرن غالب نے سوچا اگر اس وقت تھوڑی دیر اور ہو جائے تو میں اس لونڈیا کو پٹا سکتا ہوں۔ اس نے سوچا اور مس سنہا کی طرف دیکھا جس کے ہاتھ میں وہسکی کا گلاس اب بھی آدھا بھرا ہوا تھا۔ نازک پیلی انگلیاں ٹھنڈی اور بے جان لگ رہی تھیں۔ لگتا تھا یہ گلاس ہی وہ سب کچھ ہے جس کے سہارے اس حسین عورت کا 'مس سنہا کا وجود قائم ہے۔ اسی کے سہارے آب وخاک کی یہ جنت ایک اندھیرے خلا میں لٹک رہی ہے اور راہ سے بھٹکے ہوئے ستاروں کی طرح جھلملا رہی ہے۔ "میری Thinking کتنی 'اور جنل' ہے۔ 'Really amazing!'

"بوفے ہوگا!" پرفلا سرکار کی کرخت اور نشے کی وجہ سے کانپتی ہوئی آواز گونجی۔

غالب نے سنی ان سنی کر دی اور اسے یہ بات اور بھی اچھی لگی کہ مس سنہا نے بے وقت کی شہنائی کی طرف کوئی توجہ نہیں دی۔ البتہ گلاس پر اس کی لمبی انگلیوں کی گرفت ڈھیلی پڑتی ہوئی معلوم ہوئی۔ شراب ٹھہری ہوئی تھی۔ شراب 'جو وہ پی نہیں رہی تھی۔ (لیکن شاید جسے وہ محسوس کر رہی تھی!) احساس! احساس! احساس! کتنی ونڈر فل چیز ہے یہ احساس! یہی سب کچھ ہے۔ احساس ہی موت ہے احساس ہی زندگی۔ واقعی میرے سوچنے کا ڈھنگ کتنا فلسفیانہ ہے۔ کتنا!

"چلوں 'ٹھسکوں کھانے کی میز کی طرف۔ ورنہ یہ مکڑا یونہی رینگتا رہے گا اور جانے کیسے کیسے میلے میلے جالے بنتا رہے گا۔" مس سنہا نے میز کا رخ کیا۔

گورچرن نے اس کا راستہ روک لیا اور انتہائی بانکا پوز اختیار کر کے بائیں جیب میں کچھ ٹٹولتے

ہوئے کہا: "آپ بہت غمگین ہیں۔ بہت sad معلوم ہو رہی ہیں۔ اس کی پرسنلٹی میں بڑی depth پیدا ہوگئی ہے۔ لیکن سنئے! دو شرابی ایک ریستوران کے ملگجے دھندلکے میں بہت دیر سے بیٹھے شراب پی رہے تھے۔ بوتل آدھی رہ گئی تھی۔ ان میں سے ایک نے کہا۔ "افسوس' دوست بوتل آدھی رہ گئی ہے۔" دوسرے شرابی نے مسکرا کر جواب دیا۔ "ہاں' ابھی تو بوتل آدھی بھری ہوئی ہے۔" "میں بہت sad ہوں لیکن مجھے ہمیشہ بوتل آدھی بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔"

"خالی بوتل بھی؟"

"اولیس' وہائی ناٹ؟"

مس سنہا کے کچے دھاگے سے بندھا وہ بھی میز کے پاس آگیا۔

کمرے میں سگریٹوں کا دھواں بھر گیا تھا اور سردی کے باوجود گھٹن ہو رہی تھی۔ خوش مذاق اور ذہین میزبان نے موقع شناسی سے کام لیتے ہوئے کھانے کی میز کے پاس والی کھڑکی کھول دی۔ ادھر کھڑکی کھلی ادھر ہوا کا تیز جھونکا کمرے کی ہر چیز پر تیر گیا۔ ساتھ ہی زینے پر دھما دھم کی آواز ابھری اور سردار بلونت سنگھ بغیر کسی وارننگ کے "وہٹ سکسٹی نائن" کی موٹی بوتل کی پتلی گردن پکڑے ہوئے اندر گھس آیا' کچھ اس انداز سے جیسے مرغی ذبح کرنے جا رہا ہو۔ آتے ہی اس نے اننا سرکار کے سامنے کھڑے ہو کر اتنا شور مچایا کہ ہر شخص سہم سا گیا۔

مس سنہا نے اس کی طرف نظر بھی نہ اٹھائی اور اگر اٹھائی بھی تو کچھ اس انداز سے کہ کچھ دیکھ ہی نہ رہی ہو۔ وہ شور سنتی رہی اور شاید محض شور کے اتار چڑھاؤ سے وہ اس کے مزاج اور کردار کا اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔ چھ ہاتھ کا آدمی' یہ بلونت سنگھ' جو خچر کے رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا' اسے بالکل دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی گول ٹھوڑی پر داڑھی بجی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور غلافی تھیں۔ پگڑی گلابی تھی اور اس کے جسم کے مقابلے میں بہت ہی حقیر اور موہوم سی چیز معلوم ہو رہی تھی۔ مس سنہا نے منہ پھیر لیا اور پلیٹ پر کانٹے کو سنبھالتے ہوئے کھڑکی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔ ٹھنڈی ہوا اس کے چہرے پر ان دیکھی شبنم کی طرح بکھرنے لگی۔ یہ دھنیں کسی خواب کی وادی سے آ رہی تھیں۔ خواب اور

دھند میں لپٹی ہوئی دھنیں۔ اور مس سنہا کے ہونٹ یاس اور نشاط سے کھل گئے۔ "جانے یہ موزارت ہے یا ویردی یا...... "اس کے ہاتھ سے کانٹا چھوٹا اور پلیٹ پر ایک جھنکار کے ساتھ ٹھہر گیا۔

سردار بلونت سنگھ جرمن عورت 'انا سرکار' کے سامنے پروانے کی طرح تڑپ رہا تھا۔ انا کے رخسار کشمیری سیبوں کی طرح دہک رہے تھے۔ سرکار نے نووارد کے جسم کی تڑپ اور بے قراری دیکھی۔ اسے بوتل کی جان خطرے میں نظر آئی۔ اس نے بوتل غیر متوقع مہمان کے ہاتھ سے لے لی اور گھبرائی ہوئی بلکہ بوکھلائی ہوئی مسکراہٹ سے یونانی دیومالائی قد والے سردار بلونت سنگھ کا شکریہ ادا کیا جو یورپی لیکن ساڑی پوش سفید حسن کے سامنے لڈو کی طرح بکھرا چلا جا رہا تھا۔ شراب کی شرارت سے گل و گلنار حسینہ اور بھی دہکنے لگی۔

انا سرکار کا تعارف اس سے بہت سرسری تھا۔ شاید سرکار کے اخباری دفتر میں ملاقات ہوئی تھی جہاں سردار کی اسمگلنگ کے اسکینڈل کے سلسلے میں کوئی چیز چھپنے والی تھی اور وہ سرکار کو یقین دلا رہا تھا کہ یہ محض چند جیلس کاروباریوں کا کمینہ پن ہے۔ اسمگلنگ اور میں؟ واہ گرو' واہ گرو! اور اب نہ جانے آسمان سے کیسے پھٹ پڑا تھا۔

"آپ نے 'بیوٹی اینڈ دی بیسٹ' والا 'جوک' سنا ہے؟"

مس سنہا نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس کی روح خواب اور دھند میں لپٹی ہوئی دھنوں کی تلاش میں خوشبو کی طرح بہی چلی جا رہی تھی۔ دور...... بہت دور...... جانے کہاں......

"نہیں...... میں نے تو کھانا نہیں...... میں نے تو آپ کو 'نیو ایئر' پر مبارکباد دینا تھا۔ I am so indebted to you."

"No nonsense" بان کی کنپٹیاں سنسنا رہی تھیں۔ اس کے ہاتھ میں پوری ران تھی، بھنی ہوئی سرخ ران۔ اس کے دہن کے کونوں پر پلاؤ کے چند چاول چپکے ہوئے تھے اور اس کے تیور بگڑے ہوئے تھے اور توند پر بٹن کس رہے تھے۔ "نہیں، میں کہتا ہوں سب الیوژن ہے۔ ماضی، حال، مستقبل۔۔۔۔ سب الیوژن ہے! بس وہ لمحہ ایک سچائی ہے جس میں ہم جیتے ہیں۔ واحد سچائی ہے لمحہ۔ واحد اکائی 'لمحہ'! باقی سب الیوژن ہے!"

"ماضی، حال، مستقبل۔۔۔۔ سب الیوژن ہے تو یہ لمحہ کہاں سے آگیا؟ یہ سچائی کہاں سے آگئی جناب؟ کہتے ہیں سچائی ایبسٹریکٹ نہیں ہوتی!"

"کون بولتا؟" سرکار نے ہچکی کو دباتے ہوئے پوچھا۔

"میں کہتا ہوں۔ بیٹا، میں کہتا ہوں۔" خلیل نے پلاؤ کا پورا لطف اٹھاتے ہوئے حسب دستور سرکار کو چھیڑا جس کے چہرے پر عالمانہ متانت کا پھیکا پن نحوست کی طرح چھایا رہتا تھا۔

بان کی آنکھیں ابل پڑیں، جیسے کہہ رہا ہو: میاں ہوش کے ناخن لو، میاں ہوش کے ناخن لو۔۔۔ کیا بک رہے ہو؟"

لیکن اس نے منہ کھولنے سے پہلے اپنے ہونٹوں کو خالص کشمیری مسکراہٹ کی مٹھاس سے بھگو لیا۔ بند گلے میں گردن دونوں طرف ہلا کر دیکھی (کہیں ٹوٹی تو نہیں!) اور بولا: "زندگی کو جب زبان و مکان میں قید کیا جاتا ہے تو زندگی محدود ہو جاتی ہے، تنگ! سردار جی کے گلاس میں جو شراب چھلک رہی ہے نا۔۔۔۔ اس کی طرح گرفتار!"

جب تک بان نے اپنا یہ مکالمہ ختم کیا اور ہونٹ چاٹا، سردار بلونت سنگھ اپنا تیسرا گلاس خالی کر چکا تھا۔

میزبان اخبار نویس پرفلا سرکار اور اس کی جرمن انا نے اس کی بلانوشی سے گھبرا کر آنکھیں چار کیں اور دونوں اپنی بے بسی پر تقریباً رو دیے۔ سردار بلونت سنگھ نے پھر انا سرکار کا ہاتھ تھام لیا اور محتاج کی طرح اسے دیکھنے لگا۔ سرکار نے پاس آکر اس سے کہا:

"On empty stomach? What the hell !....."

"میں نے تو کھانا نہیں۔ میں نے تو پینا ہے!"

سردار بلونت سنگھ نے پرفلا سرکار کو آنکھ ماری اور اس کی بیوی کا نرم ہاتھ چوم لیا جو اسے دھوپ کی طرح گرم محسوس ہوا۔ (اور باہر کتنی سرد ہوا چل رہی تھی!) پرفلا سرکار نے اس کا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹ کر اسے کھانے کی میز کی طرف لے آیا۔ سردار بت کی طرح کھڑا ہو گیا۔ اس نے گلاس میز پر رکھا اور سب کو سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔ اس نے کسی کو پہچانا نہیں لیکن

اس کی آنکھوں میں غضب کی دوستانہ چمک پیدا ہو گئی۔ اس نے مس سنہا کی پشت دیکھی، اطالوی انداز سے سنوارے ہوئے بال دیکھے (ہائے کیا سج دھج ہے!) پتلی کمر دیکھی جس کو غالب کا ہاتھ ڈرتے ڈرتے چھو رہا تھا اور ہٹ رہا تھا۔ سردار بلونت سنگھ جرمن حسینہ کو بھول گیا اور اس نے سرکار کا ہاتھ ایک طرف ہٹا دیا جس میں مرغ کی پلیٹ تھی۔ سرکار کے نیم گنجے سر پر پسینے کی نمی چمک رہی تھی۔

"سردار جی کھانا نہیں؟"

"یہ کون ہے مسٹر سرکار؟"

"یہ مس سنہا...... ہسٹری کی لیکچرار...... بہت بڑی ایکٹریس......"

"مس سنہا...... وہ جس نے سنجوگتا کا پارٹ کیا تھا؟ مس سنہا۔"

سردار بلونت سنگھ نے ہونٹ چاٹے جو سوجے سوجے سے لگ رہے تھے۔ اس کو ہونٹ چاٹتے دیکھ کر انا سرکار کو جماہی آ گئی اور اس نے بھی آخر پلیٹ اٹھائی 'نازک انگلیوں میں کانٹا' کانٹے سے لگی ہوئی ٹماٹر کی سرخ سرخ قاش۔ یورپ کی عورت کتنی کلچرڈ ہوتی ہے 'کتنی ڈیلی کیٹ!' خلیل نے اپنے چھوٹے سے منہ میں مرغی کی کلیجی رکھتے ہوئے سوچا ہی تھا کہ بان نے کہا: "جانتے ہو خلیل کانٹے سے ٹماٹر کی قاشیں اٹھانے میں وہی لطف آتا ہے جو قدیم سورماؤں کو ـــــ یونان اور مصر کے سورماؤں کو ـــــ نیزے پر غلام کا کٹا ہوا سر اٹھانے میں آتا ہو گا۔" بان نے بڑی مشکل سے اپنی کسی ہوئی توند پر ہاتھ پھیر کر نامعقول ڈکار کو دبایا اور ہنس کر بات بدل دی: "ذرا گور چرن کو دیکھو۔ مس سنہا آج خودکشی نہ کر لے تو میں کشمیری برہمن نہیں، شودر ہوں شودر!"

اس کا چہرہ ٹماٹر کی طرح سرخ ہو گیا۔ اس نے ٹھوڑی کھجائی اور اس کے دل پر سانپ لوٹ گیا: مجھے یہاں آنے سے پہلے ایک بار اور شیو کر لینا چاہئے تھا۔ میری داڑھی تو عرب لڑکیوں کی جوانی کی طرح بڑھتی ہے۔ انا سرکار کی آواز آئی: "No, really, I do not like clowns"

کھانے کا زور تھمنے لگا۔ کانٹوں' چمچوں' چھریوں اور پلیٹوں کی کھنک مدھم پڑتی گئی۔ کھانے والوں کے جبڑے تھکنے لگے اور ایک ایک' دو دو کر کے کھانے والے میز سے دور ہٹنے لگے۔ مس

سنہا نے برائے نام کھایا۔ غالب اس کو کھلانے کی مہم پر ایسا جٹا کہ خود رومال سے منہ صاف کرتا رہ گیا۔ آخر اس نے بھی پلیٹ میز پر رکھ دی اور ہتھیار ڈال دئے۔

خلیل کو مس سنہا بار بار اپنی طرف کھینچ رہی تھی لیکن وہ 'میرا حصہ دور کا جلوہ' پر اکتفا کئے ہوئے تھا۔ خلیل کا خیال تھا کہ 'عشق انسان کو آزاد کرتا ہے۔ انسان کو ہر پابندی سے آزاد ہو جانا چاہئے۔ عشق انسان کو ہر پابندی سے' ہر غلامی اور محکومی سے' ہر الیوژن سے آزاد کرتا ہے۔ آزادی اپنے آپ کو پالینے کا نام ہے اور اپنے آپ کو پالینے کے لئے عشق بہت ضروری ہے۔ عشق دوسرے سے نہیں ہوتا بلکہ اپنے آپ سے ہوتا ہے۔ عورت اپنے کو' یعنی کائنات کی ایک اکائی کو' ڈھونڈنے اور پانے کے لئے مشعل کا کام کرتی ہے۔ عورت واہمہ ہے۔ لیکن ایسا واہمہ جو ذات کو سورج کی کرنوں کے کائناتی رنگوں کی طرح بکھیرتا نہیں بلکہ فرضی مظاہر کے چھوٹے رشتوں سے کاٹ کر ایک نقطے پر مرکوز کرتا ہے اور یہ نقطہ انسان کی اپنی ذات ہے۔ ایک فرد' جس کا وجود اپنی ذات سے ہے؛ ایک اکائی' جو ایک خاص لمحے میں ہے۔ اور جب وہ لمحہ گزر جاتا ہے تو وہ اکائی بھی اس کے ساتھ ہی گزر جاتی ہے' اور کائنات ان گنت اکائیوں سے بنی ہے جس کا کوئی ماضی اور مستقبل نہیں ہے۔ یہ ذات' یہ اکائی اس وقت تمام خیالی رشتوں سے آزاد ہوتی ہے جب وہ اپنے آپ کو جان لیتی ہے کیونکہ یہی خود آگاہی اسے پھیلا کر کائنات بنا دیتی ہے جس کا کوئی ماضی اور مستقبل نہیں' جس کا کوئی آغاز اور انجام نہیں۔ انسان اپنے عمل سے قائم ہے۔ انسان اپنے عمل سے اپنی نفی کرتا ہے اور فنا ہو جاتا ہے' خلیل کا یہ عقیدہ نہیں تھا لیکن وہ اسی طرح کی باتیں کرتا تھا اور لوگوں کو بتاتا تھا کہ یہ اس کا عقیدہ ہے۔

خلیل کا چہرہ سرخ ہوا اور پھر زرد پڑ گیا۔ اس نے دبی ہوئی مریضانہ شرمندگی کے ساتھ کہا: "دوستو شمپین کی بوتل کھولو' نیا سال دروازے پر دستک دے رہا ہے۔"

"نیا سال؟" بان نے چونک کر پوچھا "نیا سال کیسا ہوتا ہے؟ زمانے کو دنوں' ہفتوں' برسوں' صدیوں میں تقسیم کیوں کرتے ہو بھائی؟ یہ تقسیم فریب ہے۔ اس فریب نے ہمیں تقسیم کر دیا ہے؟ انسان کو' زمین کو' چاند کو' ہر چیز کو تقسیم کر دیا ہے۔ زمانہ بے کراں ہے اور میں ایک تنکا ہوں۔ میں تنکا بھی اس لئے ہوں کہ ڈوبتوں کو تنکے کا سہارا چاہئے۔ جب اس سہارے کی ضرورت نہیں رہے گی تو میں مٹ جاؤں گا۔"

''مٹ جاؤں گا! تم کیا بولتا؟ جو ہے نہیں وہ مٹ کیسے سکتا ہے؟''
''میں نہیں ہوں؟'' بان کی آنکھیں بھیگ گئیں اور آواز بھرا گئی۔

بان کشمیری برہمن تھا۔ اس کی بیوی نیم اپاہج تھی جو اس کے بچوں کی پرورش کرتے کرتے خوشی خوشی سورگباش ہو جانے کے پروگرام بنا رہی تھی۔ بان ملک عدم کے اس راہی کو دیکھ کر پورے ماحول کی ٹھنڈی اجنبیت سے ڈر جاتا تھا۔ لیکن وہ دفتر' بازار' یار دوست اور کافی ہاؤس کی اجنبیت سے گھبرا کر بھاگتا تھا تو اپنے گھر کی اس اجنبیت میں آ کر پناہ لیتا تھا جہاں اس کی بیوی صبح شام گیتا کا پاٹ کیا کرتی تھی اور بچوں کو زعفران کے کھیتوں اور کنول کے پھولوں میں رہنے والی پریوں کے قصے سنا کر دودھ پلایا کرتی تھی۔

وہ اپنے پلنگ پر لیٹ جایا کرتا تھا اور کامو اور سارتر کی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ اس کی آنکھوں اور دل پر بوجھل پن چھا جاتا تو اس کے جسم میں عجیب سا تناؤ پیدا ہوتا اور وہ لارنس کے ناولوں کے مختلف کرداروں میں روح کی طرح حلول کر جاتا اور جب وہ 'لیڈی چیٹرلیز لور' کے جاٹ نما ہیرو کے جسم میں داخل ہوتا تو اسے ہر طرف روشنی بکھرتی ہوئی محسوس ہوتی اور وہ آنکھیں بند کر لیتا اور اپنی بیوی کی کراہ سنتا رہتا جس کی کمر کا درد رات کو انگارے کی طرح دہکنے لگتا تھا۔ نیند سے پہلے گھنٹوں وہ 'لیڈی چیٹرلی' کے عاشق کے ساتھ سورج کی طرح ڈوبتا رہتا' طلوع ہوتا رہتا۔

''ٹھیک ہے سرکار' شمپین کی بوتل کھولو۔'' اس نے کہا اور دل میں سوچا ''ہم سب ابھی کیڑے ہیں اور نالیوں میں رینگ رہے ہیں۔ شاید ہم کبھی آزاد نہیں ہوں گے کیونکہ ہم اپنے آپ کو پہچانتے ہی نہیں۔''

اننا سرکار نے ریکارڈ پلیئر پر چکوسکی کا ریکارڈ رکھا: ''لیبدنا اوزیرا (راج ہنس کی جھیل)۔ ''ہنس ناچ رہے ہیں' چاندنی میں نغمہ آنکھیں کھول رہا ہے اور ایک کالا پرندہ' ایک بدروح پاک اور اجلی فضا پر اپنا سایہ ڈال رہی ہے۔ اننا سرکار کے جوتے دھن کے ساتھ بڑی نرمی سے زمین کو چھوتے ہیں اور پھر اٹھ جاتے ہیں جس طرح بہار کی شعلہ فشاں شام کو ہونٹ سے ہونٹ ملتے ہیں اور پھر الگ ہو جاتے ہیں۔ لیکن نغمے میں خزاں کا حزن' پت جھڑ کی آگ ڈھل رہی ہے۔

آنکھوں میں آنسو جل رہے ہیں۔ پتے ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہے ہیں اور ہوا اسسکیاں بھر رہی ہے۔ راج ہنس کی جھیل! یہ کیسی جھیل ہے؟ یہ راج ہنس کیسا ہے۔۔۔۔اور چاندنی میں پھیلتا ہوا سیاہ پریوں کا سایہ؟ یہ سب کچھ اجنبی ہے۔ لیکن ہر شخص کا دل کیوں بھر آیا ہے؟

"انا! دس منٹ اور۔۔۔۔ نیا سال آرہا ہے۔ تمہیں یاد ہے لندن کی رات؟ پکاڈلی سرکس کی دھند؟ وہسکی اور روشنیاں؟ ڈارلنگ "What a bliss it was!" پر فلا سرکار اپنی جرمن بیوی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر سرگوشی میں کہہ رہا تھا۔ انا سرکار مرتبان میں تیرتی ہوئی رنگین مچھلیوں کو دیکھ رہی تھی۔

مس سنہا کا رنگ اور بھی زرد پڑ گیا تھا۔ لیکن گورچرن غالب سوچ رہا تھا 'سونا کس طرح کندن بن رہا ہے! جب یہ میرے ڈرامے میں ہیروئن کا پارٹ کرے گی تو میری بیوی جل جائے گی اور اس پر دے کا دورہ پڑے گا لیکن بلا سے۔' "نیا سال بہت ہی مبارک اور خوبصورت سال ہوگا' کیوں مس سنہا؟"

"پچھلے سال بھی کسی نے شراب پی کر مجھ سے یہی کہا تھا اور مجھے ہنسی آگئی تھی۔ نئی نئی دوائیں ایجاد ہوتی رہتی ہیں اور ہر دوا کا اشتہار......"

سردار بلونت سنگھ نے زور سے قہقہہ لگایا۔ وہ دیر سے خاموش بیٹھا اپنی اجنبیت اور بے ہنگم پن کے احساس سے لرز رہا تھا۔ 'یہ لوگ کون ہیں اور ان سے میرا رشتہ کیا ہے؟' وہ بار بار اپنے آپ سے پوچھ رہا تھا۔

یکایک موسیقی کی رو تیز ہوگئی اور کمرے میں ہوا کا ایک جھونکا در آیا۔ ہر چیز کو ایک جھرجھری سی آگئی۔ کتنا عجیب احساس ہے' چیزوں کو بھی جھرجھری آتی ہے۔ گاگاں' رینوا اور پکاسو کی پینٹنگ کو' میز کو' میز پر بکھرے ہوئے برتنوں کو جن پر چکنائی جم گئی ہے' ٹھنڈے گلاسوں کو شمپین کے سنسناتے ہوئے جھاگ کا انتظار ہے اور ان انسانوں کو بھی جن میں سے ایک پکاڈلی سرکس کا ذکر کر رہا ہے اور سردار بلونت سنگھ کی نگاہیں اور دانتوں کی چمک سے ڈر رہا ہے۔

موسیقی کی دھنوں میں وجدانی شدت پیدا ہو رہی ہے۔ عروج کا نقطہ قریب ہے۔ جب نغمہ سورج کی طرح تڑپتا ہوا' ناچتا ہوا شعلہ بن جاتا ہے جس کے گرد نہ جانے کتنے سیارے' کتنے

دل گردش کر رہے ہیں۔ ان دلوں میں فریب کے سوا کیا ہے؟ محبت 'نفرت 'رقابت 'سرخوشی اور غم۔۔۔۔ فریب کے کتنے نام ہیں! دھنیں تیز ہو رہی ہیں۔ عجیب نشاط کا عالم ہے۔ خیر و شر کی لڑائی پورے عروج پر ہے۔ کالے پرندے کے پر سفید ہنسوں کے جوڑے کے درمیان کتنا بھیانک سایہ ڈال رہے ہیں۔ ہوا کس طرح گونج رہی ہے اور آنکھوں سے کیسی شبنم ٹپک رہی ہے! دل پگھلتا ہے تو شبنم کیوں ٹپکتی ہے آنکھوں سے؟ اور یہ سب لوگ جو صوفوں اور کرسیوں پر بیٹھے ہیں اور بارہ بجنے کا انتظار کر رہے ہیں 'جو کسی کے جانے اور کسی کے آنے کا' کون و مکاں کے کیا سے کیا ہو جانے کا انتظار کر رہے ہیں! میں اس گھیرے میں کب تک گرفتار رہوں گا؟

سردار بلونت سنگھ اچھلا 'چنگھاڑا اور 'راج ہنس کی جھیل' کے تال پر ناچنے لگا۔ اس کی آنکھیں سرخ انگاروں کی طرح دہک رہی تھیں۔ اس کے ہونٹوں پر عجیب سی کربناک مسکراہٹ کسی زہریلے پھول کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ اس کے بازو اور ٹانگیں بل رہی تھیں۔ اس کے شانے آگے کی طرف جھک آئے تھے جیسے ٹوٹنے ہی والے ہوں۔ وہ انتا سرکار کے سامنے سانپ کی طرح لہرانے لگا۔ انتا کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔ اس نے اپنے بنگالی شوہر کی طرف دیکھا جس کی دھند میں لپٹی ہوئی سیاہ مسکراہٹ جھلملائی اور اس کے ہاتھ ہنس کے پروں کی طرح اٹھ گئے۔ ایک ہاتھ خچر کے رنگ کے کوٹ میں چھپے ہوئے چوڑے شانے پر جم گیا اور دوسرا بڑے سے کھردرے ہاتھ پر سو گیا۔ دونوں آہستہ آہستہ ہلکورے کھاتے ہوئے ناچنے لگے اور پر فلا سرکار خلیل کے پاس آکر بیٹھ گیا جو ناچتے ہوئے جوڑے کو مجبور اور مجہور آنکھوں سے دیکھ رہا تھا اور کہہ رہا تھا: "ہم سب لوگ کتنے اکیلے ہیں 'کتنے اداس 'اور زندگی ہے کہ ہم سے الگ 'کہیں دور 'سراب کی طرح چمک رہی ہے۔ زندگی کا چشمہ بہہ رہا ہے اور جھلملا رہا ہے۔ ہم اسے صرف دیکھ سکتے ہیں اس میں بہہ نہیں سکتے کیونکہ ہم بے بس ہیں۔ ہم نہ اپنی خوشی سے پیدا ہوئے ہیں نہ اپنی خوشی سے مریں گے۔ 'اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے۔' کتنی لغو ہے یہ زندگی؟ اور شاید موت بھی!"

"لیکن یہ ہے کہاں؟ غالب کو بھول گئے! 'ہر چند کہیں کہ ہے 'نہیں ہے۔' میرا مطلب گورچرن غالب سے نہیں 'اسد اللہ خاں سے ہے۔"

گورچرن' جو مس سنہا کی ٹانگ کے لمس سے لطف اندوز ہو رہا تھا' اچانک چونک گیا اور بڑی تلخی سے بولا: "بان' اگر تم پیرس میں پیدا ہوتے تو سارتر اور کاموبھی وہاں پیدا نہ ہوتے۔ وہ یقینی یہاں ہوتے' یہاں۔ پر فلا سرکار کے فلیٹ میں۔" اس کے گلے میں کوئی چیز پھنس گئی۔

"اور کسی خوبصورت بلا سے فلرٹ کرتے ہوئے۔" خلیل نے اس کی بات کاٹ دی۔

مس سنہا نے پوری شام میں پہلی بار خلیل کو نظر بھر کر دیکھا۔ خلیل کو اپنے جسم کا سارا خون گردن کی طرف دوڑتا ہوا محسوس ہوا۔ مس سنہا کی آنکھیں مچی ہوئی تھیں اور ہونٹوں پر ایک طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ اس کا پتلا دبلا جسم اس بڑے کمرے میں ہر چیز سے الگ تھلگ اور گریزاں معلوم ہو رہا تھا۔ یہ شخص' جس کا چہرہ کلہاڑی جیسا ہے' جس کی اچکن کے بٹن اوپر تک لگے ہوئے ہیں اپنے آپ کو 'سسی فس' سمجھتا ہے۔ چٹان کو دھکیلتا ہوا پہاڑ کی چوٹی پر لے جاتا ہے اور چٹان پھر لڑھکتی ہے اور نیچے آجاتی ہے اور یہ شخص پھر۔۔۔۔اس کی دردانگیز رات کبھی ختم نہیں ہو گی۔ گورچرن نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور بولا: "افسوس' مجھے ناچنا نہیں آتا ورنہ میں بھی اس کے ساتھ ناچتا' راج ہنس کا ناچ!"

"سچ!" مس سنہا کھل کھلا کر ہنس پڑی۔

پر فلا سرکار دبے پاؤں ناچتے ہوئے جوڑے کی طرف بڑھا۔ ہر شخص کی نظر اس کی طرف اٹھ گئی۔ "چلو بارہ بجنے والا ہے۔۔۔۔ آؤ۔۔۔۔ شمپین پیو۔" اس نے بلونت سنگھ سے کہا لیکن سردار نے انا سرکار کو گلے لگالیا اور ناچتا رہا۔ پر فلا سرکار کے دونوں ہاتھوں میں شمپین کے گلاس تھے۔ اس کے پیر لڑکھڑا رہے تھے اور اس کا سیاہ چہرہ اور زیادہ سیاہ ہو گیا تھا۔

"بایں سیل غم و سیل حوادث۔" خلیل گنگنا رہا تھا اور اس کی نگاہیں اپنے جام میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

بان نے ایک بڑا سا سگار سلگالیا تھا جس کا دھواں اڑ کر مس سنہا کی طرف جا رہا تھا۔ لگ رہا تھا کہ دھوئیں کی تہیں پگھلنے سے جھجک رہی ہیں اور ہوا میں مبہم سے خیال کے تاروں کی طرح ٹھہر گئی ہیں۔

انا سرکار نے خواب آلود نگاہوں سے اپنے بنگالی شوہر کو دیکھا جس کی کھوپڑی چمک رہی تھی۔ انا کو لگا کہ اس کا شوہر ہونٹ چبا رہا ہے اور ناچ رہا ہے اور پکاڈلی کی روشنیوں سے اس کی

آنکھیں پکاچوند ہو رہی ہیں۔

انّا سرکار یکایک اپنے پارٹنر کی مضبوط' تشنہ اور فریادی گرفت سے نکل آئی' جس طرح لیمپ کی چمنی میں سے دھواں نکلتا ہے۔ اس نے آہستہ سے اپنے خاوند کے ہاتھ سے شمپین کا گلاس لیا اور جا کر خلیل کے پاس بیٹھ گئی۔ سرکار نے ٹھنڈی سانس لی اور سردار بلونت سنگھ کو گھورتا رہا جو اب اکیلا ناچ رہا تھا۔ سرکار اس کی طرف بڑھا۔ سردار بلونت سنگھ کی آنکھیں' دانت اور مونچھیں بڑے بھیانک پن سے چمکیں اور یکایک اس کے لمبے ہاتھوں کی لمبائی دگنی ہو گئی۔ پرفلا سرکار کے ہاتھوں کا جام طوطے کی طرح اڑا اور مس سنہا کی گود میں گرا' لڑھکا اور فرش پر ایک چھناکے کے ساتھ بکھر گیا۔ گورچرن پھر کر کھڑا ہو گیا۔ مس سنہا کی گود ٹھنڈی شمپین سے بھیگ گئی تھی لیکن وہ خاموش بیٹھی حیرت سے چکنا چور جام کو دیکھ رہی تھی۔ پوری محفل پر سناٹا چھا گیا۔ گورچرن اپنی پتلی ٹانگوں پر تین بار گھوما: "یہ کون ہے ایڈیٹ؟ یہ کون جانور ہے؟ پرفلا سرکار یہ کون ہے؟" پرفلا سرکار اپنی جگہ ہکا بکا چاروں طرف دیکھ رہا تھا۔

سردار بلونت سنگھ بڑے بڑے ڈگ بھرتا ہوا مس سنہا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کے ہونٹ بے ہنگم پن سے لٹک رہے تھے۔ اس کی نگاہیں مس سنہا کی خاموش گود پر جھکی ہوئی تھیں۔ وہ جھک کر معافی مانگنے ہی والا تھا کہ گورچرن پھر چیخا: "کون ہے پرفلا سرکار یہ ایڈیٹ؟ شریفوں کی محفل میں پرفلا سرکار...... یار......"

سردار بلونت سنگھ نے اس کی گردن پکڑلی اور دو تین جھٹکے اتنے زور سے دیئے کہ اس کا بے بس جام چھلک پڑا۔

"گٹ آؤٹ پلیز' گٹ آؤٹ!" انّا سرکار نے رندھی ہوئی آواز میں کہا۔

سردار بلونت سنگھ نے گورچرن کو صوفے پر دھکیل دیا' جیسے وہ کوئی میلا چیتھڑا ہو۔ گورچرن نے سنبھلتے ہوئے پھر گردن سیدھی کی۔ گردن کی رگیں پھول رہی تھیں۔ اس نے پھر فریاد کی: "گارڈ...... کون ہے یہ؟ نکالو یہاں سے بدمعاش کو......"

"یو اسمگلر...... بروٹ...... گٹ آؤٹ......" پرفلا سرکار کے گلے میں پھنسی ہوئی آواز آخر پھوٹی۔

''ہاں میں اسمگلنگ کرتا ہوں اور کروں گا۔۔۔۔ کروں گا۔۔۔۔ کروں گا۔ لیکن تم مجھ سے بھی بڑے اسمگلر ہو۔۔۔۔ مجھ سے بھی بڑے اسمگلر۔ میں جانتا ہوں...... '' اس کے قدم لڑکھڑائے۔ وہ پیر پٹکتا ہوا زینے کی طرف بھاگا۔ نیچے پہنچتے پہنچتے وہ لڑھک گیا اور بھاگتا ہوا گیٹ سے نکل گیا۔ پرفلا سرکار کا السیشن لپکا بھی مگر بلونت سنگھ سرد رات کے اندھیرے میں آنکھوں سے اوجھل ہو گیا۔

بان اس ہنگامے میں اپنا جام لے کر ایک کونے میں کھسک گیا تھا جہاں مرتبان میں مچھلی اب بھی لرز رہی تھی۔ 'مچھلی لرزتی رہتی ہے۔ کیا مچھلی کے لئے دن اور رات نہیں ہیں؟ کیا اسے نیند نہیں آتی؟' وہ کچھ اس ڈھنگ سے سوچنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن اصلی خیال جو اس کے ذہن میں خون کی طرح گردش کر رہا تھا یہ تھا کہ 'مس سنہا کی گود شمپین سے بھیگ گئی ہے۔ اسے کتنی ٹھنڈک محسوس ہو رہی ہو گی؟ اور یہ سب لوگ بے حس ہیں۔ انہیں ذرا بھی احساس نہیں کہ ایک غریب لڑکی پر کیا بیت رہی ہے؟ کیسی عورت ہے؟ اس میں ذرا سیکس اپیل نہیں۔ انٹلیکچول لڑکیوں میں سیکس اپیل نہیں ہوتی۔ اور یہ دیکھو مچھلیاں اب بھی تیر رہی ہیں۔ یہ لوگ۔ یہ سوڈو انٹلیکچول۔ اف! میں کہاں آن پھنسا ہوں؟'

تھوڑی دیر کے لئے کمرے میں سناٹا چھایا رہا' پھر کہیں سے بارہ بجے گھنٹے کی آواز آئی۔ تنہا اور اداس آواز' رات کی پرچھائیوں پر تیرتی ہوئی آواز۔ پوری محفل چونک گئی۔

سب نے جام اٹھالئے۔ گورچرن نے پھدک کر سب سے جام ٹکرایا۔ سب کی آنکھوں سے پرچھائیاں چھٹ گئیں اور آنکھوں میں تتلیاں سی جھلملائیں۔

پرانا سال گیا اور نیا سال آیا۔ پرانا' پرانا۔۔۔۔ نیا' نیا۔۔۔۔ پرانا نیا۔۔۔۔ نیا پرانا۔۔۔۔ 'سب نے ایک ایک گھونٹ پیا اور مسکرا کر ایک دوسرے کو دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سال کوئی مرئی پیکر ہے جسے ان کی آنکھیں افق کے پار غائب ہوتا دیکھ رہی ہیں۔

خلیل ہونٹ چاٹ رہا تھا۔ بان اسے ہونٹ چاٹتے دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ 'میں یہاں سے جاؤں گا اور چپکے چپکے زینے پر چڑھوں گا۔ سب سوئے ہوئے ہوں گے۔ نئے سال سے بے خبر' مجھ سے بے خبر۔ بچے زور زور سے سانس لے رہے ہیں اور بلی فرش پر سو رہی ہے۔ میں اپنے

ٹھنڈے پلنگ پر لیٹ جاتا ہوں۔ نیا سال اور پرانا لحاف۔ اس لحاف پر پرانے برسوں کی نہ جانے کتنی گرد ہے؟ اور اس کی بو پرانے برسوں کی بو۔ عینک اتارتا ہوں' تکیے پر سر رکھتا ہوں۔ یہ سر ہے یا چرخاب؟ بھنور...... میں نے ذرا زیادہ پی لی ہے۔ ہمارے بھی ہیں مہرباں کیسے کیسے! ایک وہ زمانہ تھا جب میں انگریز کی جیل۔ اور اب دیکھو یہ کاغذوں کی فرم ہے اور میں ہوں۔ میرے مالک کا لاکھوں روپیہ ہے جو اجنبیوں کی طرح ہاتھ میں آتا ہے اور نکل جاتا ہے۔ کاش مس سنہا ایک بار' صرف ایک بار!'

اس کو خلیل کا چہرہ بڑا بوکھلایا ہوا لگ رہا تھا اور اسے بالکل اندازہ نہ تھا کہ خلیل کے کانوں میں اس کی بیوی کی آواز گونج رہی ہے: 'اچھا' آج پھر پی کر آئے!' 'نہیں بھئی' آج نہیں۔' بیوی کروٹ بدل لیتی ہے اور خلیل اس کے گھنے بالوں میں منہ چھپا کر سو جاتا ہے۔ اچکن اتارنا بھی بھول جاتا ہے۔

خلیل کے ہونٹ کپڑے کے بٹوے کے منہ کی طرح کھل رہے تھے اور بند ہو رہے تھے۔

'ہم سب کتنے اداس ہیں! ہم سب کتنے اکیلے ہیں! شمپین کتنی نفیس ہے! پر فلا سرکار کو ڈیوٹی فری شراب کہاں سے مل جاتی ہے؟ ڈیوٹی فری شراب ہی نہیں' ڈیوٹی فری بیوی بھی۔ سرکار سے زیادہ تو وہ کما لیتی ہے۔ وہ نہ ہوتی تو سرکار کے پاس اتنا شاندار فلیٹ نہ ہوتا' اس کے پاس گرے کلر کی فیئٹ کار نہ ہوتی اور اس کا باپ نہ مر جاتا تو اس کے پاس کلکتے کا اتنا بڑا مکان نہ ہوتا جس کا کرایہ ہی ایک ہزار روپیہ ہے۔ پھر بھی کمبخت اخبار کی نوکری سے چپکا ہوا ہے۔ اسے اپنی آزادی کی فکر نہیں ہے؟ اور یہ گورچرن' جو ہمیشہ میری لائی ہوئی عورت کو اپنے ڈرامے کی ہیروئن بنا دیتا ہے اور میں اکیلا رہ جاتا ہوں۔ اکیلا' ازلی اکیلا۔ مس شمع عجیب شمع ہے۔ جلتی ہے پگھلتی نہیں۔ اگر میرے پاس ایک فیئٹ کار ہوتی تو میں اسے جیت لیتا۔ لیکن اب میں جانتا ہوں میں اکیلا رہوں گا۔ ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے۔ کیا مذاق ہے؟ میں نے جوتے ذرا چھوٹے خرید لئے ہیں۔ کاٹ رہے ہیں۔ کتنی عجیب بات ہے' مجھے ہر چیز کاٹتی ہے۔ ہر شخص کاٹتا ہے۔ دوست بھی اور دشمن بھی۔ اور میں افق کے اس پار پرانے سال کی لو کو تھرتھراتے دیکھ رہا ہوں۔ میرے شانے پر میری دوست انتا کا ہاتھ ہے اور اس کا ہاتھ مجھ سے

کچھ کہہ رہا ہے۔ یورپ کی عورت کتنی انسان دوست ہوتی ہے' کتنی غم نواز! اور یہ بے وقوف بان اپنے آپ کو بہت بڑا انٹلیکچول سمجھتا ہے کیونکہ اس کے پاس وقت ہے اور بہت ساری کتابیں پڑھ سکتا ہے' کیوں کہ اسے نیو اسٹیٹس مین کے سارے ریویوز زبانی یاد ہو جاتے ہیں۔ وہ تھا نا اکبر بادشاہ' کیا نام تھا ان کا؟ ایک ایک بار سن کر یاد کر لیتا تھا' دوسرا دو بار سن کر' تیسرا ...... یہ ہاتھ کچھ کہہ رہا ہے اور میں لرز رہا ہوں اور اس لئے کہ میں اکیلا ہوں۔ بیتھوون کی سمفنی آہستہ آہستہ فضا میں تیر رہی ہے اور میں اس میں کھویا چلا جا رہا ہوں۔ شمپین میرے دل میں درد کو آہستہ آہستہ صبح کی طرح نکھار رہی ہے۔'

بان ڈگمگاتا ہوا' بھاری بھاری قدم اٹھاتا ہوا محفل میں لوٹ آیا اور اس نے نظر بھر کر مس سنہا کو دیکھا جو پرفلا سرکار سے کہہ رہی تھی: "دلی بڑی ویران لگتی ہے۔"

"And freedom lends you wings"

کیوں تم ابھی کیمبرج کو بھولی نہیں ہو؟"

"joy کیا چیز ہے مسٹر سرکار؟" مس سنہا نے گردن کو ذرا خم دیتے ہوئے پوچھا۔

"جواب دو" مس سنہا کو جواب دو existentialist کے بچے۔ فرانس کا آرٹ کیا ہے؟ جہاں فٹ پاتھ پر اوپن ایئر ریستوران کے پاس کوئی الجیریائی لکیریں کھینچتا ہے اور ہم کہتے ہیں اس سے بڑا آرٹ تو پیدا ہی نہیں ہوا کیونکہ ان لکیروں کے معنی نہیں ہیں' جس طرح زندگی کے کوئی معنی نہیں ہیں۔" گور چرن چہکا' "اچھا بتاؤ یہ جوائے کیا ہے مسٹر......؟"

"لیکن میں یہ نہیں کہہ رہی تھی۔ میں نے پیرس کی بہار اور خزاں دیکھی ہے۔ دریائے سین کے کنارے کنارے بڑے بڑے درختوں سے کومل رنگوں کی طرح چھنتے ہوئے' جھڑتے ہوئے پتے دیکھے ہیں۔ ٹھنڈی ہوا اور ناتر دام پر جھکے ہوئے بادل۔ میں سمجھتی ہوں خدا نے اس سے زیادہ خوبصورت زمین نہیں بنائی جہاں لوو میوزیم ہے جہاں سے اگر سیدھے چلئے تو شاں زے لیزے کی سڑک جگمگاتی نظر آتی ہے اور آرک آف ٹرائمف پر ختم ہوتی ہے۔ نہیں' اس سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔ اف وہ رمبراں کی پینٹنگ' اس کے ابھارے ہوئے چہروں پر......"

"اب بتاؤ اپنے زمانے کے فلسفی بان۔۔۔۔ بتاؤ۔۔۔۔ پیرس سے زیادہ خوبصورت سرزمین کون سی ہے جہاں پہلی کمیون بنی تھی اور جہاں بریکیڈ پر ہزاروں معصوم اس آزادی کے لئے مر گئے تھے جس کا نام بعد میں انقلاب پڑا؟ اور ان کے تصور میں بھی نہیں تھا کہ انقلاب کیا ہوتا ہے۔ لیکن جب خون بہا تھا تو۔۔۔۔ تم نے وکٹر ہیوگو کی کتاب پڑھی ہے نا! او گاڈ۔۔۔۔"
خلیل خود اپنی بات پر چونک سا گیا۔

مس سنہا کو گورچرن کی بات پر ہنسی آگئی جس کی ٹائی سردار بلونت سنگھ کے جھٹکے سے ٹیڑھی ہو گئی تھی۔ گورچرن کو معلوم تھا لیکن اس نے ٹائی سیدھی نہیں کی کیونکہ وہ جتانا چاہتا تھا کہ کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔

محفل کو جمائیاں آنے لگیں۔ کھڑکی سے آتی ہوئی ہوا کی چبھن بڑھ گئی تھی۔ دور سے آتا ہوا نغمہ بجھ گیا تھا۔ انا سرکار نے کھڑکی بند کر دی اور بان کے پاس کھڑی ہو گئی۔ بان نے بڑی نرمی سے پوچھا: "مسز سرکار آج کی پارٹی بڑی کامیاب رہی نا؟"
"لیکن آپ تو اکیلے پھرتے رہے!"
"میرا اکیلا پن کون دور کر سکتا ہے؟"

انا سرکار اٹھلا کر اس کے پاس سے ہٹ گئی۔ وہ دیکھ رہی تھی کہ اس کا شوہر بور ہو رہا ہے۔ اسے جمائیاں آ رہی تھیں۔ ہر پارٹی کے اختتام پر اس کا یہی حال ہوتا تھا۔ اسے احساس ہوتا تھا کہ یہ لوگ 'جو دعوتیں اڑاتے ہیں' مفت کی پیتے ہیں اور تنہائی کا فلسفہ بگھارتے ہیں' دراصل اسے بے وقوف بناتے ہیں۔ ان میں سے کوئی وہ نہیں کہتا جو محسوس کرتا ہے۔ یہ سب بنتے ہیں۔ اکیلا تو میں ہوں۔ اور کل جب میں دفتر جاؤں گا تو وہ موٹا ایڈیٹر چلائے گا اور کہے گا:
"Well, I expected something better......what do you think?"
"ہم کیا سمجھتا؟...... ہم سمجھتا تم سالہ بیٹا ڈنگی ہے۔ ایک دم ڈنگی!" اسے جمائی آگئی اور انا سرکار مہمانوں کے کھسکنے کا انتظار کرنے لگی۔ کانچ کے ذرے اب بھی فرش پر بکھرے ہوئے تھے۔
"ڈنگی سمجھتا ہے ابھی پاسٹ کا hangover باقی ہے۔" اس نے یہ بات اتنے زور سے کہی کہ سب چونک گئے۔

"گرد ــــ گرد ــــ ہر طرف گرد اڑ رہی ہے۔" گورچرن نے ہنس کر کہا اور مس سنہا کی طرف جھکا "اب تو چلنا چاہئے۔ چلئے میں آپ کو چھوڑ آؤں!"

مس سنہا کو جھرجھری آگئی۔

کار بڑی تیزی سے مس سنہا کے فلیٹ کی طرف جا رہی ہے جہاں وہ اکیلی رہتی ہے۔ اگلی سیٹ پر مس سنہا خاموش بیٹھی ہے' گورچرن غالب کار چلا رہا ہے اور سیٹی بجا رہا ہے اور سوچ رہا ہے کہ جب میں آج گھر پہنچوں گا تو کس قیامت کا سین ہوگا۔ وہ سنے گی اور کہے گی: میں جانتی تھی یہی ہوگا۔ میں تم سے عمر میں بڑی ہوں اور یہ میں نے اس وقت کہا تھا جب تم نے ڈل جھیل کی سیر کرتے ہوئے دسویں بار پر دپوز...... اور تب تم نے کہا تھا "میں تمہارے جسم کا نہیں تمہارے اندر کے آرٹسٹ کا پجاری ہوں جس کی عمر نہ گھٹتی ہے نہ بڑھتی ہے' جو مہاتما بدھ کی مورتی کی طرح ہے۔' اور تب میں نے بڑی شرمندگی محسوس کی تھی کہ اگر میں تم سے پانچ چھ برس بڑی ہوں تو کیا میرے جسم میں کچھ رہا ہی نہیں؟ اور تب میں کنواری تھی۔ کسی نے مجھے ہاتھ نہیں لگایا تھا اور تم چیونٹے کی طرح چمٹ گئے تھے اور اب دیکھو تم اتنی رات گئے آئے ہو اور میں جانتی ہوں تم کہاں تھے اور وہاں کون کون تھا؟" میں سب کے نام لیتا ہوں اور وہ کہتی ہے "اور کون تھا؟" میں مس سنہا کا نام نہیں لیتا اور وہ کہتی ہے، "تم نے مس سنہا کا نام نہیں لیا' تمہارے دل میں چور ہے۔ میں اکیلی ہوں اور تم......"

کار پارک کا چکر کاٹتی ہے اور مس سنہا کے فلیٹ کے سامنے رک جاتی ہے۔ مس سنہا اتر جاتی ہے اور زینہ چڑھنے لگتی ہے۔ گورچرن بھی کار کا دروازہ بند کر کے اس کے پیچھے پیچھے زینہ چڑھتا ہے...... اور میں بھاگ رہی ہوں۔

"اچھا' تھینک یو مسٹر گورچرن غالب۔" ...... لیکن میں اب سوؤں گی ...... اکیلی؟ اور میں دروازہ بند کر دیتی ہوں۔ اندھیرے میں فر کا کوٹ بوجھل خواب کی طرح گرتا ہے۔ ایک سینڈل یہاں اور دوسرا وہاں اور میں کانپ رہی ہوں اور آنکھیں آنسوؤں سے جل رہی ہیں۔ کوئی دروازے پر کھڑا ہے' کوئی اب بھی دروازے کے کھلنے کا انتظار کر رہا ہے۔

جب ہر سال کی طرح نئے سال کی شمپین پی کر مہمان گورچرن کی کالی فیئٹ میں بیٹھ کر چلے

گئے تو پر فلا سرکار کا سر چکرانے لگا اور پیشانی پر پسینے کی نمی چمکنے لگی۔ "Do not get excited"
انا سرکار نے ساری روشنیاں گل کر دیں اور ٹیبل لیمپ روشن کر دیا۔ وہ دھیرے دھیرے آئی اور صوفے پر لیٹ گئی۔ پر فلا سرکار گرا اور اس کی کمر کے خم میں سما گیا' جس طرح ساحل کی گود میں تھکی ہوئی کشتی ٹھہر جاتی ہے۔

"ڈارلنگ' ڈارلنگ How boring...... تم لندن سے کیوں آ گئیں؟ یہاں صرف پنچھی ہوتے ہیں۔۔۔۔ پنچھی!"

"تم یہ کیوں نہیں پوچھتے میں برلن سے کیوں آ گئی؟"

دونوں خاموش ہو گئے۔

مغربی برلن کے زو اسٹیشن کے باہر' جہاں خوبصورت چکنی چوڑی سڑک بڑے اسٹور کے پاس سے دو شاخوں میں کٹ گئی ہے اور جہاں بیچوں بیچ جنگ کی یادگار' ٹوٹا ہوا گرجا' بوڑھے سینٹ کی طرح کھڑا ہے؛ جہاں گھنٹے بجتے ہیں اور جنگ کی ہولناکیوں کی یاد دلاتے ہیں؛ جہاں برف گر رہی ہے اور میں مشرقی برلن سے بھاگ کر آئی ہوں اس لئے کہ مجھے آزادی کی تلاش ہے جس کا نغمہ میں نے سنا ہے لیکن جسے میں نے دیکھا نہیں اور میں ریشمی فراک پہننا چاہتی ہوں؛ خرگوش کے سفید سمور کی نرمی کو اپنی گردن کے گرد اور رخساروں پر محسوس کرنا چاہتی ہوں' میں جگمگاتے ہوئے ہال میں' جہاں غبارے اڑ رہے ہیں اور شراب لنڈھائی جا رہی ہے اور رنگین کاغذوں کی زنجیریں بکھر رہی ہیں' ناچنا چاہتی ہوں اور کوئی میرے ساتھ ناچنے والا نہیں اور بڑے سے اسٹور کے پاس' جہاں شیشے کے شوکیس میں لومڑی اور خرگوش کے سمور چمک رہے ہیں۔ میں اکیلی کھڑی ہوں۔ مجھے ایک امریکی نوجوان اپنے پاس بلاتا ہے' قریب کے ہوٹل میں لے جاتا ہے' ہنستا ہے' شراب پلاتا ہے' گدگداتا ہے اور ہنستا ہے۔ بڑا بانکا جوان ہے۔ چیونگ گم چوستا ہے اور مجھے پیار کرتا ہے' مجھے گرماتا ہے اور اپنے ساتھ سلاتا ہے اور ٹوٹے ہوئے گرجے کا گھنٹہ گونج رہا ہے...... وہ شام اور کتنی شامیں...... اور پھر لندن کی وہ شام۔۔۔۔ میں پھر اکیلی ہوں کیونکہ میرا امریکی کھلنڈرا دوست میرے ساتھ رات بھر ناچنے کے بعد ٹرانس ورلڈ کے ہوائی جہاز میں دبک کر آنکھوں سے اوجھل ہو گیا...... پھر برف گر رہی ہے اور کچھ دکھائی نہیں دیتا کیونکہ لندن دھند' بادلوں اور سرمگی پرچھائیوں کا شہر ہے۔

میں اس ہندوستانی طالب علم کی شکر گزار ہوں جو انقلابی باتیں کرتا ہے لیکن عورت سے عشق کرنا' اسے سہارا دینا بھی جانتا ہے...... اور اب یہ ہندوستان ہے: یہاں دھند نہیں ہے' یہاں دھوپ ہے؛ یہاں خلیل اور بان ہیں؛ سردار بلونت سنگھ ہے۔۔۔۔ ہے اور نہیں؟ کانچ کا ٹوٹا ہوا جام ہے۔ بیتھووِن کا نغمہ بند ہو چکا ہے اور میرا ڈارلنگ میری گود میں پڑا خراٹے لے رہا ہے اور اس کی پیشانی پر ٹھنڈا پسینہ چمک رہا ہے۔ میں کتنی اکیلی ہوں! کتنی آوارہ! برلن کی خزاں کہیں اچھی ہے' جہاں درختوں کے پتے ٹوٹتے ہیں لیکن ہوا گاتی ہے۔'

"ڈارلنگ تم خراٹے لے رہے ہو۔ "Let's make love!"

پرفلا سرکار چونکتا ہے' نشے میں انا کو ٹٹولتا ہے: "میں ایڈیٹر کو بولے گا۔۔۔ میں بولے گا۔"

انا بیڈروم میں چلی گئی اور ساڑی فرش پر پھینک کر اوندھے منہ بستر پر گر پڑی۔ پرفلا سرکار وہیں صوفے پر دراز ہو گیا اور بڑبڑایا: فنٹاسٹک! بیوٹی!"

○

اجنبی کے ساتھ

لوگ اپنی سی سوچتے ہیں۔ اور میں اپنی سی۔ وہ جو کہتے ہیں ناکہ میں کبھی بوڑھا نہیں ہوں گا۔ نہ کبھی تھکوں گا۔ بس اسی طرح دوڑتا رہوں گا۔ زندگی بھر۔ زندگی کے بعد بھی۔ شاید۔ زندگی سے پہلے اور زندگی کے بعد۔ زندگی نے یہ جاننے کی چھٹی ہی نہیں دی۔ اور اگر دیتی بھی تو میں کیا کرلیتا۔ دوڑتا رہتا۔ گھوڑے کی طرح۔ گھوڑے بھی کبھی کبھی اصطبل میں چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ نہیں، میں ان گھوڑوں میں سے نہیں ہوں۔ تانگے کا گھوڑا جو چمکیلی سڑک کے پیچھے اندھیری گلی میں پیدا ہوتا ہے۔ میں وہ ہوں۔ جو وہیں تانگہ کھینچ کھینچ کر سدھار جاتا ہے، گلی میں۔ میں بھی سدھار جاؤں گا۔

لگتا ہے تم بوڑھے ہو رہے ہو۔ جانے کیا کیا بڑبڑاتے رہتے ہو۔ اپنے آپ سے کچھ کہتے رہتے ہو۔ ہوا سے الجھتے رہتے ہو۔

ہوا سے؟ اچھی کہی، ہوا سے۔ مجھ میں اب ہوا سے کیا کسی سے بھی الجھنے کی سکت نہیں رہی۔ تم سے بھی نہیں۔ جینا کیا، وقت کاٹنا ہے۔ سو کاٹ رہا ہوں۔ دیکھو کتنی اچھی فصل ہے۔ بال سفید، آنکھوں کے گرد جھریاں، آواز آنسوؤں میں بھیگی ہوئی، ایک عینک اتاروں، دوسری ناک پر سنبھالوں تو کچھ پڑھوں۔ ہاں ہاں، یہی کہ کسی نے کسی کا قتل کر دیا، دو گاڑیاں لڑ گئیں، کتنوں نے زہریلی شراب پی اور اللہ کو پیارے ہوگئے۔ وہ تو ہونا ہی تھا۔

اور جو میں اتنی دیر سے تم کو ٹہوکے دیے جا رہی ہوں تو کوئی بات ہی نہیں۔ مجھے بالکل اکیلا چھوڑ دیا ہے۔ اکیلی مروں اس پورے جھمیلے میں۔ ہر آیا گیا میری ذمہ داری۔ ہر شادی بیاہ میری

الجھن۔ گھر میں کیا پکتا ہے' کیا نہیں پکتا' میرا دردِ سر۔ باورچی سے میں الجھوں۔ جمعدار اگر جھاڑو نہ دے تو میرا قصور' تمہارے موزے چوہے کتر گئے تو میں پکڑی جاؤں' دکان کا ادھار میں چکاؤں' بجلی' پانی' بس' سب کے پیسے میں بھروں۔ پھر اوپر سے اسکول بھی جاؤں اور پچاسوں موذیوں کو اپنا دماغ چاٹنے دوں۔ اور تم مزے میں بیٹھے بڑبڑاتے رہو۔ جیسے سارا آسمان تمہارے ہی کندھوں پر ٹکا ہوا ہے۔ لعنت بھیجتی ہوں تم پر۔ اپنے آپ پر بھی۔ کوئی تم کو دیکھے تو یہی سمجھے یہ گھر نہیں پنجرا ہے۔ جس میں بھوکی شیرنی کے ساتھ بند کر دیے گئے ہو۔ سب تم پر ترس کھاتے ہیں۔ سب تو سب۔ تم بھی اپنے آپ پر ترس کھاتے ہو۔ بڑے مکار ہو۔ کائیاں۔ خوب سمجھتی ہوں۔

میں اس کی آنکھیں دیکھ رہا ہوں۔ بوجھل۔ دھواں دھواں سی۔ چنگاریوں سے کبھی کبھی جھلملاتی ہوئی۔ اب میں پہچانتا نہیں اس عورت کو۔ اس کا چہرہ کتنا بدل گیا ہے۔ اور آواز۔ چہرہ اور آواز۔ سب کچھ۔ وہ دانت پیستی ہے۔ اور مجھے جھنجھوڑتی ہے۔ میرا ہاتھ گر جاتا ہے۔ اور ٹھوڑی نیچے آجاتی ہے۔ گردن پر جھریاں سمٹ رہی ہیں اور پھیل رہی ہیں۔ میرے گلے میں کوئی چیز' کوئی گچھا سا پھنس رہا ہے سوئیوں کا۔

جانتا ہوں' میں تم کو کچھ بھی نہیں دے سکا۔ میں خزاں کی ہوا کی طرح تم سے کھیلتا رہا۔ وقت کہاں سے کہاں چلا گیا اور میں اس کی گرد کو بھی نہ پا سکا' اور میں خود کھو گیا۔

اب تھوڑی دیر میں سب آجائیں گے اور تم سے بات پوری نہ ہو سکے گی۔

کتنا اچھا ہو گا' سب آجائیں گے' گھر قہقہوں اور باتوں سے بھر جائے گا۔ اور میں ایک کونے میں بیٹھا سب کو دیکھوں گا۔ لڑکے لڑکیاں۔ دمکتے ہوئے چہرے۔ ہر شام' جب یہ دن کاٹ کر آتے ہیں اور اکٹھا ہوتے ہیں تو ان کے پاس کتنا تجربہ ہوتا ہے۔ کتنی باتیں جمع ہو جاتی ہیں۔ چہرے پر میلوں کی موٹر سائیکل کی دوڑ کی گرد۔ بال الجھے ہوئے' لیکن آنکھوں میں کیسی چمک اور ہونٹوں پر ایسی مسکراہٹ کہ دل کا سارا میل بہہ جائے' آن کے آن میں۔ اور بیٹا نہیں تو اندھیرے میں بھی روشنی کی کونپلیں پھوٹنے لگیں۔ اور وہ اس کا ہمدم' جو اسے دیکھتا ہے اور دیکھے چلا جاتا ہے۔ اور پھر اتنی ساری باتیں۔ بس فلم ہو تو ایسی کہ پیسے دے کر اندر جاؤ اور سر

میں درد لے کر باہر آؤ۔ اور کیا چاہئے۔ ہیرو ہو تو ایسا کہ جنگل میں آگ لگی ہوئی ہے اور وہ ہے کہ گھوڑے پر اڑا چلا جا رہا ہے۔ گھوڑے سے درخت پر۔ درخت سے پل پر۔ اور پل سے سیدھے ریل گاڑی کی چھت پر' جس میں ہیروئن دھوپ کا چشمہ لگائے انگور کھا رہی ہے' اور ۔۔۔۔اور۔۔۔۔۔ گھر قہقہوں اور باتوں سے بھر گیا ہے۔

کھانے کی میز لگائی جا رہی ہے اور میری آزمائش کا وقت آ رہا ہے۔ بڑے میاں' ساری جولانی ختم۔ تمہارے بچے جو اب جوان ہیں' اپنے زمانے کی ہواؤں سے کھیلتے ہیں۔ ہوائیں تیز ہیں اور ان کے تیور چڑھے ہوئے۔ اور تم بوکھلائے ہوئے چپاتیوں کے چھلکے اتارتے رہتے ہو اور بے تکان دوزخ بھرتے چلے جاتے ہو۔ تم کتنا ڈرے سوئے ہوئے ہو۔ منہ کھولو تو پکڑے جاؤ۔ اور جو چپ چاپ کھاتے چلے جاؤ تو چور۔ اور بات اتنی سی ہے کہ تم پچھڑ گئے ہو زمانے کی دوڑ میں۔ اب دیکھو اتنی دیر سے 'ہونق کی طرح' دال پیتے چلے جا رہے ہو۔ اور اتنا بھی نہیں سوچتے کہ زمانے میں اور بھی بہت کچھ ہے' میرا مطلب ہے اس بگھاری ہوئی دال کے علاوہ۔ اتنی اچھی اچھی باتیں ہو رہی ہیں اور تم سب سے آنکھیں بچا کر 'بس کھاتے چلے جا رہے ہو' کچھ روٹی' کچھ سالن اور کچھ ترس۔ جسے تم بے نمک ہڈی کی طرح چوستے رہتے ہو۔ اور شاید تھوڑا سا غم۔ غم کاہے کا بڑے میاں؟ کیا کہا جینے کا؟ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی اور بڑے میاں کے کان کھڑے ہوئے۔ پہلے کان کھڑے ہوئے' پھر خود کھڑے ہو گئے۔ بھئی کس کا فون تھا؟ میں نے پوچھا نہیں کہ قہقہے کا غبارہ پھٹا نہیں۔

"What a morbid old fellow?"

بڑے میاں تم اپنی دوڑ دوڑ چکے۔ جیت چکے' ہار چکے' نوجوانوں کے ٹیلیفون پر اتنا چونکنے کی کیا ضرورت ہے۔ کوئی کسی کی گرل فرنڈ ہو' کوئی کسی کا بوائے فرنڈ ہو' تم کیوں مرے جا رہے ہو' بھائی۔

ہاں ہاں' واقعی میں کیوں مرا جا رہا ہوں۔ اور یہ کوئی ایسی بات تو نہیں کہ آدمی کھانے کی میز سے اٹھ جائے۔ اور دیواروں کو یوں گھورنے لگے جیسے یہ کوئی پکاسو کی پینٹنگ ہو۔ وہ زرد کینوس کے دھندلکے میں لپٹی ہوئی عورت جس کے پاؤں ننگے ہیں اور بال ہوا میں اڑتے ہوئے اور ایک کتا' بہت اداس اور فکر مند' اس کی پنڈلیوں کے اوپر سر اٹھائے نہ جانے کیا دیکھ

رہا ہے' میری طرح۔ اور کتے کے سر پر جو ہاتھ ہے' بالکل ہاتھ کی پرچھائیں کی طرح' جنے وہ کتے سے کیا کہہ رہا ہے اور اچانک :What a morbid old fellow? یہ آواز کتنی دور ہے' جیسے جنگل سے چھن کے آ رہی ہو اور پھر اتنی پاس جیسے دل سے چشمے کی طرح پھوٹ رہی ہو۔ جنے کیا سچ ہے' کیا جھوٹ۔ شاید میں جھوٹ ہوں اور باقی سب سچ۔

میں ہوں کہ تڑکے' جب سانس میں بلید' سے اڑ رہے ہوں' اور بے گل' گل مہر کو کہرے نے اپنی سانس میں چھپالیا ہے' کیسی کیسی آوازیں سرسرا رہی ہیں اور میں اپنی پرانی کار کو جگانے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میری طرح' یہ بوڑھی کار بھی بس چلی جا رہی ہے۔ آدھے choke پر کس طرح گرج کر چالو ہو جاتی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ' جیسے جیسے چوک دباتا ہوں' اپنے آہنگ پر آجاتی ہے۔ برسوں کا تجربہ ہے' صبر ہے۔ اور نباہ کا انداز۔ میں آہستہ آہستہ دھند میں گاڑی کو بیک گیر میں لیتا ہوں' گیٹ کے باہر نکلتا ہوں اور کھڑا کر دیتا ہوں' کہرے میں چھپے ہوئے گل مہر کے پیڑ کے نیچے۔ اب میں گاڑی نہیں چلاتا۔ چلاؤں تو کیسے پٹرول کہاں سے لاؤں۔ اور اسے بیچ سکتا نہیں۔ دل دکھتا ہے۔ پرانی ثروتوں اور دوستوں کو بیچنا آسان نہیں ہے۔ کتنا ساتھ دیا ہے اس نے' کتنا بوجھ ڈھویا ہے میرا۔ کتنا فاصلہ طے کرایا ہے اس نے اور اب میں اسے بیچ دوں۔ نہیں' یہ مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ ٹھیک ہے میں بھی جانتا ہوں اس کا رنگ اڑ گیا ہے۔ لگتا ہے چھت پر کھجلی بھری کھال منڈھ دی گئی ہے۔ فرش کے ٹکڑے اڑ گئے ہیں' سارے لیور ڈھیلے پڑ گئے ہیں' کھڑکی کے شیشے خراشوں سے بھر گئے ہیں' وائپر کے بھی ناخن نکل آئے ہیں اور شیشے کے افق پر نیم دائرے سے کھنچ گئے ہیں۔ پہیوں کا الائنمنٹ بگڑا ہوا ہے۔ ٹائر کو سڑکیں کھا گئی ہیں۔ یہ سب ٹھیک ہے' پھر بھی جب میرے بچوں کو ضرورت ہوتی ہے' یہ اسی وفاداری سے شہر کے فاصلے طے کرا دیتی ہے' روشنی ہو یا اندھیرا' یہ مسافروں کو اپنی اپنی منزل پر پہنچا دیتی ہے۔

اور میں اپنی اس بوڑھی گاڑی سے جینا سیکھتا ہوں۔ میں نے زندگی بھر تجربے سے سیکھا ہے۔ اب بھی سیکھ رہا ہوں۔ جب گاڑی رک جائے گی' رک جائے گی' لیکن ابھی تو چل رہی ہے۔ میری نبض کی طرح۔

لوگ مجھے دیکھتے ہیں اور ہنستے ہیں۔ بڑا لئے دئے پھرتا تھا۔ اب دیکھو کیسا ہانپ رہا ہے۔ نادار' بے گھر' مقروض۔

لوگ جو زندگی کرائے کے فلیٹ میں گزار دیتے ہیں۔

لوگ جو خود زندگی کو فلیٹ کی طرح استعمال کرتے ہیں اور کرائے پر چڑھائے رکھتے ہیں۔

لوگ جو نہ یہ کرتے ہیں' نہ وہ۔ صرف ڈرائنگ روم میں بیٹھے رہتے ہیں' پائپ پیتے رہتے ہیں' اپنے کتوں کا ذکر کرتے رہتے ہیں اور سوچتے رہتے ہیں کہ سال کے آخر میں بینک بیلنس کیا ہوگا' ۔۔۔۔ یہ سب لوگ ہی ہیں نا! میں بھی تو ان میں سے ایک ہوں۔ پھر بھی میں ان کی طرح کیوں نہیں ہوں۔

میرے اس سوال کا جواب کوئی نہیں دیتا۔ اور میں دبے پاؤں زینہ چڑھتا ہوں۔ ابھی سورج نہیں نکلا ہے اور میں نہیں چاہتا کہ میرے قدموں کی آہٹ سے کسی کی نیند خراب ہو۔

اب تو جیتے جی اسی طرح چلنا ہے' کانچ کے زینے پر اور چپ چاپ سننا ہے۔
''بڑے کائیاں ہو۔ جب کڑا وقت پڑا' ہاتھ جھاڑ کر الگ ہو گئے۔ شہید کا پوز بنالیا۔ سیکنے لگے کہ کوئی کچھ نہ کہے۔ اور سارے زمانے کا دکھ میں جھیلوں۔ اکیلی اور بے سہارا۔ حیران ہوتی ہوں' آخر میں نے زندگی کے پچیس سال کیسے کاٹ دئے اس اجنبی کے ساتھ۔۔۔۔''

میں بالکنی پر جاتا ہوں۔ شیشے کی دیوار کے باہر گل مہر پر جمے ہوئے سبک کہرے کو دیکھتا ہوں جس کے نیچے میری پرانی دوست' میری بے رنگ گاڑی' دم سادھے کھڑی ہے۔

O

دھرتی کا بوجھ

چارپائی کی پائینتی کی رسی ڈھیلی ہوگئی تھی۔ کیوال مٹی کی کچی کوٹھری میں عمر دراز اس ڈھیلی ڈھالی چارپائی میں ایک لاش کی طرح دھنس گیا تھا۔ اس کی جھریاں لگتا تھا کہ سڑی ہوئی پیاز کے چھلکوں کی طرح تہہ بہ تہہ اتر آئیں گی۔ آنکھیں زرد اور بے جان تھیں۔ مونہہ سوج گیا تھا۔ ہونٹ پھٹ گئے تھے۔ اس کے کلوں اور سر پر چھوٹے چھوٹے بال اُگ آئے تھے جیسے چیونٹیوں نے انڈوں کا جال سا بن دیا ہو۔ کوٹھری میں کوئی روشن دان نہیں تھا۔ تھوڑی بہت روشنی دروازے سے آجاتی تھی جو آنگن میں کھلتا تھا۔ دروازہ عمر دراز کے منہ کی طرح کھلا ہوا تھا۔ چارپائی چھوٹی تھی اور اس کی ٹانگیں پائینتی کے باہر بندوق کے کندوں کی طرح نکلی ہوئی تھیں۔ فیل پا کی وجہ سے ان دونوں موٹے کندوں کی کھردری اور سیاہ جلد پھٹ گئی تھی اور مکھیاں رطوبت چوس رہی تھیں، مکھیاں کبھی اڑ کر اس کے چہرے پر جم جاتیں اور وہاں بھی بدمزہ ہو جاتیں تو دوبارہ بندوق کے کندوں پر آکر جم جاتیں۔ اس کالی کوٹھری میں مکھیاں ہی اس کی واحد ہمدم تھیں۔ وہی گنگنا کر اسے جگاتی تھیں۔ وہی لوریاں دے کر اسے سلاتی تھیں۔

وہ دیر سے اپنی زرد کنول کے پھول جیسی آنکھیں پلک جھپکائے بغیر، گھن لگی کھجور کی کڑیوں پر جمائے ہوئے تھا اور سورج کی ایک چمکتی ہوئی کرن اس کی پیشانی پر برمے کی طرح تھرک تھرک کر سوراخ کئے دے رہی تھی۔ اس کی گردن کے پسینے سے لاکھوں چیونٹیاں اپنی پیاس بجھا رہی تھیں۔ اس نے اپنا تھرتھراتا ہوا ہاتھ اٹھایا اور پیشانی پر جما دیا۔ لیکن برما تھا کہ اسی طرح تھرک کے چلا جا رہا تھا اس کی الٹی ہتھیلی کو چیرتا ہوا وہ اس کے دماغ کی تہہ تک پہنچ گیا تھا۔

غضب کی چلچلاتی ہوئی دوپہر تھی۔ اور اس پر اس کی بہو کا پارہ تھا کہ چڑھتا ہی چلا جا رہا تھا

۔۔۔۔اور وہ تھا کہ چپ چاپ گھن لگی کڑیوں کو جن سے تھوڑی دیر پر آٹا گر تا رہتا تھا گھورے جارہا تھا۔

"ہونہہ۔۔۔۔یہاں تو مَن برستا ہے۔اللہ کی مار' اپنا کیا ہے۔نواب صاحب نے چھتری اٹھائی اور چل دیے مونہہ نہار لنگی پھٹکارتے ہوئے۔۔۔۔اور بھری کڑیل لاش چھوڑ دی سڑنے کو اور سڑاند مری ناک میں بسانے کو"۔ وہ شلوکے کے بٹن کھول کر اپنے جڑواں بچوں کو دودھ پلاتے ہوئے اپنا منتر پڑھے جارہی تھی۔۔۔۔بار بار وہی ایک منتر "ہائے میں مرگئی ہوتی۔ دونوں پاؤں قبر لگ رہے ہیں پر چٹورپن کی فرمائش کوئی سنے'۔۔۔۔دلہن میرا جی آج کھچڑی کھانے کو چاہ رہا ہے۔ مسور کی دال کی کھچڑی پکادو۔ آلو کا بھرتا۔املی اور پودینے کی چٹنی۔۔۔۔ اور بگھے پر سے ایک چھٹانک گھی بھی منگوالو۔ قسم خدا کی مرجاؤں گا اور دل کی دل میں رہ جائے گی۔۔۔۔ہاں جی کیوں نہیں۔ بڑے آئے دل کی دل میں رکھنے والے 'غضب خدا کا۔۔۔۔" "مجھ کرم جلی پر ہی زمانے کی بجلی ٹوٹنی تھی۔یک نہ شد دو شد۔۔۔۔ارے او چنو کے بچے۔۔۔۔ چٹورا کہیں کا۔دہی کیوں اڑائے جارہا ہے۔ہائے اللہ۔۔۔۔منی ذرا وہ پوتڑا پچکار کر وہاں الگنی پر پھیلا دینا۔۔۔۔ہوں میں بھی آج بھوکا نہ ماروں تو میرے نام کا کتا پال لینا دوزخ میں۔ نہیں میرے لال سو جا سو جا۔ ارے دیکھ وہ آرہی ہیں کالی چیزیں۔۔۔۔پانی پیو گے میرے لال۔سو جا اوں اوں"۔

وہ صبح سے ان ہی باتوں کی رٹ سن رہا تھا۔ اس کی بہو' باسط کی دلہن' برابر بڑبڑائے جارہی تھی۔ "دلہن تم عورت ہو یا مشین گن۔" "لیکن مشین گن پھر مشین گن ٹھہری۔ وہ ایک رحم دل بڑھیا پڑوسن کی سٹھیائی ہوئی بات پر کیوں کان دھرتی۔

دن ڈھلنے کو تھا۔ عمر دراز کی کوٹھری میں کاجل سا بھرنے لگا۔ اس کی آنکھوں سے کڑیاں اوجھل ہوگئیں۔ وہ دروازے سے باہر کی دنیا کو جھانک کر دیکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اس کی گردن نے مڑنے سے انکار کردیا۔ اس کی آنکھوں میں نیلا آنسو بھر آیا لیکن ڈھلک نہ سکا۔ آنکھوں کے دونوں کناروں پر غلیظ سی جھاگ جمی ہوئی تھی۔ اور اب مکھیاں اس کی ناک کو دہلی گیٹ کی طرح نہیں استعمال کررہی تھیں۔

سوچنے کی ساری طاقت جو صبح سے خشک سوتا بنی ہوئی تھی اچانک فوارے کی طرح پھنکارنے لگی۔۔۔۔ آج سارا دن کٹ گیا۔ مجھے دلہن نے کھچڑی بھی نہیں دی۔ بڑھیا آئی تھی۔ کتنی بوڑھی ہو گئی ہے۔ اس کے جسم سے دہی اور گھی کی بو آرہی ہے۔ آخر تو گوالن ہے۔ پوچھتی تھی "بڑے بابو دوا دارو ٹھیک سے کراؤ۔ بھگوان رکھے تورا بیٹا کماوت ہے۔ بھرا گھر ہے۔ سب ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔ بھگوان کرے"۔ اور بڑھیا اپنی کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اس کو دیکھتے ہوئے آہستہ آہستہ لرز رہی تھی۔ کیا وہ افق پر سورج کے ڈوبنے کا منظر دیکھ رہی تھی اس کالی کوٹھری میں؟ نہیں ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ خود اپنے ساتھ عمر دراز کے بچپن کی یادوں کا ایک پورا کارواں لے کر آئی تھی اور جب گئی تھی تو اپنے پیچھے دہی اور گھی کی خوشبو کا جادو جگا کر گئی تھی۔

عمر دراز کی ناک کی حس آہستہ آہستہ مرتی چلی جارہی تھی۔ اب وہ اپنی پیٹھ سے رستی ہوئی پیپ کی بدبو بھی نہ سونگھ سکتا تھا۔ لیکن کھانے کی ہر چیز کی بھینی بھینی خوشبو پتہ نہیں کہاں سے اس کے دماغ میں گھس کر چیونٹیوں کی طرح رینگتی رہتی تھی اور دماغ کے ساتوں طبق کو یاجوج ماجوج کی طرح چاٹتی رہتی تھی۔ لیکن کتنے موٹے طبق تھے کہ یاجوج ماجوج کبھی کبھی تھک کر سو جاتے تھے لیکن ان کی موٹائی میں کوئی کمی نہ آتی تھی۔

"آج بھی دلہن نے کھچڑی نہیں دی۔" ایک وہ تھی جو اس کی روح کے تناؤ پر مانجھے کا کام کر رہی تھی۔

کوئی پچھواڑے کی گلی میں مویشیوں کو گالیاں دیتا ہوا جا رہا تھا۔ سرکاری جانور تھے اور ان کے گوبر کے لئے دو چھوکرے لڑ پڑے تھے۔ عادت کے مطابق اس کا جی چاہا کہ اٹھے' جائے اور بیچ بچاؤ کر کے معاملہ رفع دفع کرادے۔۔۔۔ "لڑتے کیوں ہو۔ گوبر بانٹ لو آدھا آدھا چلو چھٹی ہوئی۔"

وہ اٹھ نہ سکا۔ وہ اپنی چارپائی کے کابوس میں جکڑ کر رہ گیا تھا۔ اس کی بیماری کے اٹھائیس دن اس کے جسم کے جوڑ جوڑ میں اٹھائیس کیلوں کی طرح کھبے ہوئے تھے۔ ان کیلوں سے چھٹکارا کہاں۔ اندھیرا تھا' بچوں کے رونے' جھگڑنے اور گالیاں بکنے کی آوازیں تھیں۔ اندھیرے

کے ساتھ دھوئیں کے تلخ جھونکے اس کی کوٹھری میں در آئے۔

"شاید دولہن نے چولہا جلایا ہے۔ کھچڑی' ہائے کھچڑی۔ بڑھیا۔۔۔۔ تو کہاں چلی گئی؟ تو تو سراپا گھی اور دہی ہے۔۔۔۔ گوالن ۔۔۔۔ تو مجھے دیکھنے کیوں آئی؟ آئی تو صرف دہی اور گھی کی خوشبو کیوں لائی؟ دہی اور گھی کیوں نہ لائی؟ خالی خولی ہمدردی کس کام کی۔ ہمدردی کو مکھیاں بہت ہیں۔ لوگ روٹی کھاتے ہیں 'تو انہیں کھاتے۔"

"بکو مت ۔۔۔۔ میرا دماغ خراب ہو رہا ہے۔ آج اسکول انسپکٹر آیا تھا۔ نوکری کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ اور تم ہو کہ جونک کی طرح آتے ہی خون چوسنے لگتی ہو۔"

"آنکھیں کیوں لال پیلی کرتے ہو۔ سنبھالو ان جونکوں کو۔ میں تو چلی جاؤں گی میکے۔ اللہ کا دیا۔ میرے ماں باپ تمہارے در کے بھکاری نہیں ہیں۔۔۔۔"

"بکو مت"۔ باسط غصے میں پھر چلایا۔ "ابا کا کیا حال ہے؟"

عمردراز کی آنکھیں دن بھر میں پہلی بار جھپکتی چلی گئیں۔ اندھیرے میں خاموشی کے ساتھ۔

"صبح سے مسور کی کھچڑی کی رٹ لگا رکھی ہے۔ دم ہی نہیں نکل چکتا بیچارے کا"۔

"آہستہ بولو سن لیں گے تو ان کا دل دکھے گا۔ باسط بھی حیران تھا کہ آخر ابا بڈھی چمڑا ہو کر کب تک جئے جائیں گے۔

عمردراز کی پلکیں پھر ٹھہر گئیں۔ اس کے سوجے ہوئے گالوں پر نمکین پانی آہستہ آہستہ تیر رہا تھا۔ دو چوہے دوڑتے ہوئے اس کے جسم پر سے گزر گئے۔ وہ چونکا بھی نہیں۔ وہ اپنے بیٹے اور بہو کی بات سن رہا تھا۔

"بھئی ابا کی کوٹھری میں ایک چراغ تو جلا دو۔"

"چراغ؟"

"ہاں ہاں۔۔۔۔ ابھی وہ گھر ہی میں ہیں۔ جب وہ قبر میں سو جائیں گے تو میں تم سے چراغ جلانے کو نہیں کہوں گا۔"

عمردراز کو لگا کہ اس کا بیٹا فرشتہ ہے اور اس کے ہونٹوں سے پھول نہیں چراغ کی لوئیں ٹپک

رہی ہیں۔ اس کی کوٹھری میں ایک لمحے کو اجالا ہو گیا۔ جہاں اجالا ہو جائے واقعی اسے قبر کون کہے گا۔ "ابھی میں گھر ہی میں ہوں۔۔۔۔ چراغ جلادو۔"

مسجد سے عشاء کی اذان کی آواز آئی لیکن کوٹھری میں چراغ نہ جلنا تھا نہ جلا۔ روشنی موت کی طرح اس سے گریزاں تھی۔

باسط اور اس کی بیوی میں رات گئے تک جھڑپ جاری رہی۔ دونوں کو پیسے کی تنگی اور بچوں کی بیماری کا گلہ تھا۔۔۔۔ "بیماری تو بیماری۔۔۔۔ ان کے تن بدن ڈھکنے کو موٹے جھوٹے کپڑے تک نہیں ہیں۔۔۔۔" باسط کی بیوی نے سسکیوں میں ڈوبتے ہوئے کہا "پتہ نہیں میرے باپ نے جنم جنم کو کس کے سنگ باندھ دیا مجھے۔"

بس پھر کیا تھا۔ باسط کے دل کی چوٹ مونہہ سے دھماکا بن کر نکل پڑی۔ "اف۔۔۔۔ کون سے گن ہیں تم میں۔ کہاں کے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ ذرا دیکھوں۔ شکل چڑیل کی اور مزاج پری کا۔ ہر سال بچہ دیئے جاتی ہو۔ تم نے تو میرا دیوالہ پٹوادیا۔ ماں باپ سے جدا کرایا۔ تمہارے لئے میں نے بے ایمانیاں کیں۔ ہومیو پیتھی کا جھوٹا ڈاکٹر بن بیٹھا۔۔۔۔ ہونہہ۔"
ارے ذرا گلا کم پھاڑو۔ ورنہ گاؤں والوں نے سن لیا تو دو چار آنے والے مریض بھی نہیں پھٹکیں گے تمہارے پاس۔"
بات عقل کی تھی۔ خاموشی سے سمجھوتا ہو گیا۔
"تم نے ابا کو کھچڑی کیوں نہ دی کھانے کو"
"ارے چھوڑو بھی۔۔۔۔ وہ تو بچوں کی طرح چاند کے لئے ٹھنکتے رہتے ہیں۔ تم ان کی ہٹ پوری کر سکو تو کرو میں تو نہیں کرتی۔"
"ابا اب زیادہ دن تھوڑے ہی۔۔۔۔ بس چند دن کی بات ہے۔۔۔۔ لیکن چالیس پچاس تو پھر بھی لگ ہی جائیں گے۔ کپڑا تو سونے کے بھاؤ بک رہا ہے۔"
"اجی آپ بھی کہاں کے حاتم ہیں۔ معمولی کپڑا خرید لیں گے۔ کفن کیسا ہی ہو۔ اللہ تو اعمال دیکھتا ہے۔ جیسا کرو گے ویسا بھگتو گے۔۔۔۔"
"آہ بے چارے۔۔۔۔"

"ارے تم تو سونے لگیں۔۔۔۔"

"دیکھئے قسم خدا کی۔۔۔۔ ستائیے مت۔ روز روز کی جھلاہٹ۔"

عمر دراز کی آنکھوں میں پھر آنسو بھر آئے "میری آنکھوں کے تارے کتنے ناخوش اور دکھی ہیں۔ میں بھی ان پر بوجھ ہوں۔ میں مر جاؤں تو شاید' ان کا بوجھ ہلکا ہو۔ میں کیوں نہ کل کے بجائے آج ہی مر جاؤں۔ شاید میرے دل کے ٹکڑوں کو ذرا سکھ ملے۔۔۔۔ بے چارے میرے بچے!"

عمر دراز کے کانوں میں جب ہلکی ہلکی سنسناہٹوں کی آواز آئی تو وہ سمجھ گیا کہ جنگلی بطخوں کے جھنڈ دکھن سے اڑ کر اتری جھیل کی طرف جا رہے ہیں۔ وہ اٹھائیس دن سے یہی آواز سن رہا تھا' یہ انتیسویں صبح تھی جس کا آغاز جنگلی بطخوں کے پروں کی سنسناہٹ سے ہو رہا تھا۔ اس وقت اٹھائیس دن کے بعد پہلی بار اس کا جی چاہا کہ وہ بھی جنگلی پرندہ ہوتا اور وہ بھی اسی طرح دھندلی اور خاموش فضا میں پرواز کرتا۔ اس کا دل آہستہ سے اس کے جسم کو چھوڑ کر اڑا اور اوپر آسمان میں بلند ہوتا چلا گیا۔ برق رفتار جنگلی بطخوں کا یہ تعاقب اس وقت ختم ہوا جب دور کے کھیتوں سے لوگوں کی ہانک اور پکار کی آواز آنے لگی۔

بار بار اس وقت اس کے دل میں ایک سانپ پھن پھلا کر جھومنے لگا تھا۔۔۔۔ یہ پھن پھیل کر ایک کفن بن جاتا تھا۔۔۔۔ کیا یہ کفن چالیس پچاس روپے کو آئے گا۔ یہ کفن اس کی پوری زندگی سے زیادہ قیمتی تھا۔۔۔۔ زیادہ سفید' زیادہ نیا' زیادہ پاکیزہ اور قابل قدر۔

اس کی زندگی جہاں سے شروع ہوئی تھی وہیں ختم ہو رہی تھی۔ اسی گاؤں میں۔ اسی گاؤں میں اس کی بیوی بھی تھی۔ اس کے اپنے دور اور نزدیک کے رشتہ دار بھی۔ خود اس کی بیوی اس کا مونہہ دیکھنے کی روادار نہ تھی۔ وہ کہتی تھی اسے عمر دراز سے سخت نفرت ہے۔ جب وہ یہ کہتی تھی تو مونہہ چھپا کر' کمرے میں بند ہو کر' دونوں ہتھیلیوں سے اپنے جھری بھرے سفید گالوں کو مل مل کر روتی تھی۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ یہ خود اسے بھی معلوم نہ تھا۔

تیس بتیس برس پہلے اسی گاؤں میں اس کے حسن کے نام سے چراغ جل اٹھتے تھے۔ چھوٹی موٹی خوبصورت لڑکی' پتلے ہونٹ' نازک نازک انگلیاں۔۔۔۔ اور جب اس کے کانوں میں

کسی نے مونہہ ڈال کر کہا "بنو۔۔۔۔ بیاہی جارہی ہو۔۔۔۔ اپنے چچازاد بھائی کے ساتھ" تو اس کا دل دھک سے ہو گیا اور گالوں پر سنہری سی سرخی آگئی۔

شادی کی رات عمر دراز نے اس کے معطر گھونگھٹ کو اپنے بھدے ہاتھوں سے الٹ کر' اس کا مہکتا ہوا سہرا اٹھایا تھا اور اس کی عرق عرق ٹھڈی کو چھو کر آنکھیں کھولنے کی التجا کرتے ہوئے اپنی جان کی قسم دی تھی تو اس کے گالوں کے چراغ کی لویں لپک کر اس کی آنکھوں تک پہنچ گئی تھیں اور عمر دراز کا دل تہ و بالا ہو گیا تھا۔

عمر دراز اپنے بھائیوں بہنوں میں جنم جنم کا احمق مشہور تھا۔ کتنی مشکل سے اس نے انٹرنس پاس کیا تھا۔ گاؤں میں اس کی دھاک ضرور جم گئی تھی اور اس کی بیوی کا دل قدرے ٹھنڈا ہوا تھا۔ وہ ابھی کمسن نوجوان تھا' مسیں بھیگ رہی تھیں اور اس کا جسم ایک بے ڈول جنگلی درخت کی طرح بڑھ رہا تھا۔ اس کی بیوی' بھائی' گاؤں والے' سب ہی اس کا مذاق اڑاتے۔ وہ ہنستا۔۔۔۔ یہ لوگوں کو کبھی نہ معلوم ہو سکا کہ وہ جان بوجھ کر ہنس رہا ہے یا محض بے وقوفی میں۔ اس کے دانت بہت بڑے تھے' باہر کو نکلے ہوئے' جیسے ہر گری پڑی چیز کو اٹھا کر وہ چبا ڈالے گا۔ ان ہی دنوں جبکہ وہ اپنی بیوی سے آنگن میں باتیں کرتا کرتا سو جاتا اور اس کی بیوی تارے گنتی رہتی' اس کو ایک چھوٹے سے گاؤں کی پوسٹ ماسٹری مل گئی۔ گاؤں والے دانت انگلی کاٹنے لگے۔ "لونڈا بڑا کائیاں نکلا۔ غضب خدا کا کیا اونچا ہاتھ مارا ہے۔ ڈاک بابو کی نوکری بڑے بڑوں کو نہیں ملتی۔۔۔۔ واہ بھائی مان گئے۔"

لیکن کچھ ہی دنوں بعد عمر دراز کے جیل جانے کی نوبت آگئی۔ اس نے اندھے بھروسے کی کلہاڑی خود اپنے پاؤں پر مار دی تھی۔ اس نے ڈاک خانے کی کنجی ایک دوسرے ملازم کو دے دی اور خود چلا گیا بال کٹانے۔ واپس آیا تو ڈاک خانے کی حجامت بھی ہو چکی تھی۔ سرکاری روپیہ غائب تھا جیل کا پھاٹک اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ بہت گھبرایا' بہت رویا اور اس کے بڑے بڑے نکلے ہوئے دانت خود اس کی ہتھیلیوں میں پیوست ہو گئے۔ اسے اپنی حماقت کا بالکل غم نہ تھا۔ نہ اسے اس کا افسوس تھا کہ اتنی اچھی نوکری اس کے ہاتھ سے مچھلی کی طرح نکل گئی۔ اس کو اس کا افسوس تھا کہ ایک شریف آدمی نے جس پر اسے اتنا بھروسہ تھا اس نے

دغا بازی کیوں کی۔

"عمر دراز بھائی نوکری کرنے کے لئے عقل کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔"

"عمر دراز بھائی آپ کو عقل کے میدان اور گھاس کے میدان کے سامنے کھڑا کر دیا جائے اور کہا جائے جس میں جی چاہے چلے جاؤ۔۔۔۔ تو آپ کس میں جائیں گے؟"

"ظاہر ہے جو بات گھاس کے میدان میں ہے وہ عقل کے میدان میں کہاں۔۔۔۔ کیوں عمر دراز بھائی" ایک تیسرا من چلا بول اٹھتا۔

ان باتوں کے علاوہ عمر دراز کو یہ بھی معلوم تھا کہ اس کے گھر کے تمام لوگ اس سے ناخوش ہیں اور اس پر قہر کی بارش کرتے رہتے ہیں۔ وہ لوگوں کی نگاہوں سے گھبرانے لگا خود اس کی بیوی اس کے پاس خاموش رہتی اور اس کی چھیڑ چھاڑ کے جواب میں بھی ہوں ہاں سے آگے نہ بڑھتی۔۔۔۔ بالکل کچی، گیلی لکڑی جسے چولہے میں ڈال دو تو دھوئیں کے سوا اور کچھ نہ حاصل ہو۔ گاؤں والوں کی زبان پر تالا کون ڈالتا۔ اس کی ماں گھر والوں کو تو کوس پیٹ کر دبا لیتی تھی، لیکن باہر والوں پر کس کا زور تھا۔

"عمر دراز کالا دیو اور بے چاری اس کی دلہن۔۔۔۔ جوہی کی نازک ٹہنی۔ جنم جنم کو روندی گئی بے چاری۔"

"لوگو سنا کچھ۔ عمر دراز کی دلہن کا جی کچا کچا رہنے لگا ہے۔ ہائے بد نصیب جانے کون سا بچہ ہو گا۔"

"ایسے نکھٹو کے بچے کی ماں بننے سے تو کوکھ جلی ہی رہنا بہتر۔"

یہ سارے زہر میں بجھے ہوئے تیر اس کے جسم میں خاموشی سے پیوست ہوتے چلے گئے۔ جیسے دلدل میں سوئیاں دفن ہوتی چلی جائیں۔

جس دن باسط پیدا ہوا وہ خوشی میں پاگل ہو گیا۔ جو آتا بڑے بوڑھوں کو مبارکباد کہتا۔ گھر کی ماما ئیں تک ایک دوسرے کو مبارکباد کہہ رہی تھیں۔ مگر عمر دراز صرف خوش ہوئے جا رہا تھا۔ اسے کوئی مبارکباد نہیں کہہ رہا تھا۔ اسے اس کی پروا بھی نہیں تھی۔

اس کا دوسرا بھائی ڈاکٹر ہو گیا۔ لیکن وہ اسی طرح گاؤں میں پڑا رہا۔ اب اس کے بھائی کا

موازنہ کر کے لوگ اس کی جان نکالے دے رہے تھے۔ اسے اپنے بھائی سے بڑی محبت تھی۔ اس کا سینہ فخر سے پھول گیا تھا وہ کہتا۔۔۔۔ "جلنے والے جلا کریں۔۔۔۔ میرا تیسرا بھائی بھی ڈاکٹر ہو گا' وکیل ہو گا' مجسٹریٹ ہو گا۔"

"اور تم ان سب کے چپراسی بن جانا۔"

لوگ قہقہے لگاتے' تاڑی پیتے اور اس کی خوبصورت بیوی کی بے رنگ اور بے جوڑ زندگی پر چنے اتنے بڑے بڑے آنسو بہاتے جو نظر نہ آتے۔

رفتہ رفتہ عمر دراز کمرے سے نکل کر سائبان میں آیا' سائبان سے دروازے میں اور وہاں سے باہر کے سائبان میں۔ اب اس کا ڈیرا وہیں جما رہتا۔ جب کھانا بھیج دیا جاتا کھانا کھا لیتا۔ نہ بھیجا جاتا تو تسبیح اور کلمات کا ورد کئے جاتا۔

دیکھتے دیکھتے ہر چیز بدل رہی تھی۔ اس کا بھائی ڈاکٹر تھا اور وہ اپنے کنبے کی الجھنوں اور پیشے کی مصروفیتوں میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ چھوٹا بھائی بھی کمپونڈر بن گیا تھا۔ ماں روز بروز قبر سے قریب ہوتی جا رہی تھی۔ باسط بڑا ہو گیا تھا۔ باسط کے بعد کئی بچے اور ہوئے۔ لڑکیاں پیدا ہوئیں اور اللہ کو پیاری ہوئیں۔ البتہ دو لڑکے۔۔۔۔ زندہ رہ گئے تھے۔ اس کی بیوی کا حسن گہن میں کھوتا رہا اور اب تو اس کی پیشانی پر بھی جھریاں پڑ گئی تھیں۔ آس پڑوس کے لوگ کہتے۔

"ہائے کمبخت کو دو جوڑی چوڑیاں لانے کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔ بیوی کے ہاتھ نہ ہوئے ببول کی ٹہنیاں ہوئیں۔"

لیکن اب وہ قرآن کی تلاوت' مسجد کے چراغ اور اذان کے چکر میں کھویا ہوا تھا۔ اس کا کرتا جو کبھی سیاہ ہوتا' کبھی میلا' اس کے گھٹنوں سے نیچے تک لٹکا رہتا تھا۔ اس کا پاجامہ خاصا شرعی ہو گیا تھا۔ مگر اس کے سائز کی کوئی پابندی نہ تھی۔ چڑھا تو اتنا تنگ ہو گیا اور پھیلا تو غبارہ بن گیا۔ بیوی کو کبھی ترس آتا تو چپکے سے آتی اور اس کے کپڑوں میں پیوند لگا دیتی۔ عید بقر عید میں خاص طور پر اس کے کپڑوں میں پیوند وغیرہ لگ جاتے۔ ٹوپی تو اکثر نئی ہوتی جو چپت گاہ سے سجدہ گاہ تک اس کے سر کو ڈھک لیتی اور ہاں ایک آدھ پرانے کپڑے کا رومال بھی مل جاتا جس میں خس یا حنا کی خوشبو بھی بسا دی جاتی تھی۔۔۔۔ ساتھ روئی کا ایک معطر پھوہا بھی ملتا

جو وہ اکثر اپنے کان کی سرنگ میں چھپا لیتا۔

اس کے سر کے بال کھچڑی ہو گئے تھے۔ اس کے کان کے گوشے دونوں طرف لٹک گئے تھے۔ اس کے دونوں پاؤں سوجنے لگے تھے اور بائیں کان کے پاس ناسور نما زخم ہو گیا تھا اور سیروں نیم کے پتوں کی پولٹیس کے باوجود اپنی جگہ پر جوں کا توں قائم تھا۔ اوپر اس کا منہ تو ننھا سا تھا مگر اس کے اندر ایک سیال سی آگ لگی رہتی تھی۔

اس نے اپنے ڈاکٹر بھائی کے یہاں بچوں کی تعلیم کا کام سنبھالنا چاہا لیکن کچھ نباہ نہ ہو سکا۔ اس کی بیوی اپنے گاؤں میں لڑکیوں کا مکتب لے کر بیٹھ گئی تھی اور اپنے شوہر کے حصے کے کھیت کی آمدنی سے وہ اپنا اور بچوں کا پیٹ پال رہی تھی۔ بس وہ خود فاضل ہستی تھا۔

ایک روز کئی گاؤں کے چکر لگا کر وہ جب گھر آیا تو اسے کھانا نہیں ملا۔ اس نے مسجد میں نماز ادا کی اور زور زور سے درود اور الحمد للہ پڑھتے ہوئے باہر کی چوکی پر لوٹ لگانے لگا تاکہ لوگوں کو اس کے وجود کا احساس ہو اور اسے کھانا مل جائے۔ لیکن اس کی امید غلط ثابت ہوئی۔ آخر جب اس سے بھوک برداشت نہ ہو سکی تو اس نے اپنا لوٹا زور سے زمین پر پٹک دیا۔ پھر بھی گھر کا سناٹا دور نہ ہوا۔ وہ اندر گیا اور بے تحاشا اپنی بیوی کو پیٹنے لگا۔

''خدا تم کو غارت کرے۔ تمہارا ناسور تمہاری موت بنے۔''

ایک طرف کوسنے تھے اور دوسری طرف لات گھونسے۔ گھر کے سب لوگ سکتے میں تھے۔ بچے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ کسی کو امید نہیں تھی کہ یہ ازلی احمق اتنی جرات کرے گا۔ اس سے پہلے بھی اسے بھوکا مارا گیا تھا۔ اس کی تذلیل کی گئی تھی' اسے ستایا گیا تھا۔ لیکن اس کا جواب اس نے ایک دردناک خاموشی سے دیا تھا۔
''میں خون پسینہ ایک کرتی ہوں تو اپنا اور بچے کا پیٹ پالتی ہوں۔ تم کباب میں ہڈی کون ہو۔''
اس کی بیوی بپھر بھی رہی تھی اور رو بھی رہی تھی۔
''اور میرے کھیت کی آمدنی؟''
''شرم نہیں آتی ۔۔۔۔ ان تینوں کو دنیا میں لائے ہو تو کیا وہ بس ہوا پانی پر زندہ رہیں گے ۔۔۔ پگلے۔''

اس کا پاگل پن ختم ہو گیا۔ وہ باہر آگیا۔ وضو کیا اور چاندنی رات میں باہر گھاس پر جائے نماز بچھا کر نفلیں ادا کرنے لگا۔
صبح وہ گاؤں سے غائب تھا۔

ایک ڈیڑھ مہینے تک تو لوگوں کو اس کا اتہ پتہ کچھ نہ چلا۔ پھر اس کی خبریں آنے لگیں۔ معلوم ہوتا اس گاؤں میں بڑے زمیندار کے پوتوں کو پڑھا رہا ہے۔ پھر خبر آتی وہ تو داروغہ صاحب کے گھر بچوں کی تربیت پر مامور ہے۔ اصطبل کے پاس پوری چھت پر اس کا قبضہ ہے۔ دو روپے اور کھانا کپڑا اور مہینے میں صابن کی دو چیاں کوئی کھیل مذاق نہیں۔ وہ ان ہی چکیوں سے نہاتا بھی اور کپڑے بھی دھوتا۔ اس کی داڑھی لمبی ہو گئی تھی اور اب وہ اکثر بے کار وقتوں میں مراقبے میں چلا جاتا تھا۔ خدا سے لو لگا رہا تھا۔ تنہائی میں غیب کی باتیں بھی بکا کرتا تھا۔ ہاں ایک بات یہ ضرور ہوئی کہ ایک دن جب داروغہ صاحب نے غصے میں آکر بہت زیادہ کھانے کا طعنہ دیا تو اس نے اپنا بستر لپیٹا اور نکل گیا۔ اس کا مطالبہ اتنا کم تھا کہ جلد ہی اسے ایک اور گاؤں میں ایک بڑے کاشتکار کے یہاں اس کے شریر نواسوں کی تربیت اور تعلیم کا کام مل گیا۔ پھر ایک جھونپڑا اس کے قبضے میں تھا، بچھانے کو پیال کا گدا تھا، ناریل کا حقہ تھا جس کی ایک چنگاری نے وہ گل کھلایا کہ وہ جھونپڑے سے نکل کر ایک درخت کی چھاؤں میں بیٹھ گیا۔ اس کے شاگرد دراصل اس کے استاد تھے اور وہ ان کا سلیم الطبع شاگرد۔ معاملہ خود بخود طے ہو گیا۔ وہ گھر سے اچھی اچھی باسی اور تازہ چیزیں اپنے دامن میں چرا کر لاتے اور اس کا منہ بھر دیتے۔

ایک زمانے تک وہ گھر نہیں لوٹا۔ البتہ اس کی تمام حرکتوں کی اطلاع اس کے گھر پہنچتی رہتی تھی جس کو سن کر گھر کے لوگوں کا سر شرم سے جھک جاتا تھا۔

جب باسط کی شادی طے ہو گئی تو اچانک ایک دن وہ اپنے گاؤں میں آدھمکا۔ لوگوں کو ایک تکلیف دہ حیرانی نے آدبوچا۔ کسی نے اس سے بات نہ کی۔ اس نے بھی کسی سے بات نہ کی' اس نے صرف گاؤں کے چھوٹے سرکار کو جھک کر سلام کیا۔ کیونکہ ان کو سلام کرنے سے تو گھوڑے گدھے بھی انکار کرنے کی جرات نہیں کر سکتے تھے۔

اندر میراثنیں گیت گا رہی تھیں۔۔۔ باہر برات تیار ہو چکی تھی۔ گھوڑے 'ٹٹو' ڈولیاں۔۔۔

اور اس کے پیچھے من چلے جوانوں کا دل۔ کسی نے اس سے نہیں کہا کہ وہ پیدل کیوں کر جا سکے گا۔ وہ خوش تھا۔ کبھی وہ باسط کی ڈولی کے پاس آتا اور کبھی چھوٹے سرکار کے گھوڑے کے پاس جنہوں نے برات میں شرکت کر کے اس کو بلکہ اس کی سات پشت کو عزت بخشی تھی۔

تھوڑی دیر میں برات اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی۔ وہ ابھی پہاڑ کی چڑھائی تک پہنچا تھا اور برات اتار پر تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔ سورج غصے میں سرخ آگ برسا رہا تھا۔ صراحیاں، شربت، گلاب اور گنڑیاں، ساری نعمتیں برات کے ساتھ تھیں۔ ٹھیک ہی تو کسی نے کہا تھا! "ارے عمر دراز بھائی کا کیا ہے وہ تو گاؤں گاؤں کے ہرکارے ہیں۔ انہیں سمدھیانے پہنچتے کیا دیر لگے گی۔"

واپسی پر دلہن کو دیکھنے کے بعد اس کمبخت نے کیا دیا۔ دو روپے کی بھی کوئی سسر کی رونمائی ہوتی ہے۔ اس کی خوب خبر لی گئی۔ کھانا کھاتے ہوئے اس پر تیر و نشتر کی بارش ہوئی۔ لیکن وہ ان تیر و نشتر کا خیال کرتا تو ہاتھ سے خوانِ نعمت کھوتا۔ وہ آنکھ کا اندھا اور کان کا بہرا بن کر پلیٹیں اور کٹورے چاٹتا رہا۔

رات ہوئی تو طعنوں تشنوں کا سلسلہ جاری تھا۔

صبح ہوئی تو وہ گاؤں سے غائب تھا۔۔۔۔ کسی کو کوئی فکر نہ ہوئی۔ بدن سے رینگتی ہوئی چیونٹی اتر جائے تو اس کا ماتم کون کرتا ہے۔

ایک سال بیتا، دو سال بیتے۔۔۔۔ کئی سال بیت گئے۔ عمر دراز کو زمین کھا گئی تھی یا آسمان کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ لوگ بھول گئے سب کچھ۔ اس کی بیوی البتہ جب بھی موقع ملا اپنی مانگ میں سیندور ڈال کر اور سستی پھسی چوڑیاں پہن کر عمر دراز کی زندگی کا اعلان کرتی رہی۔ ایک لمحے کو عورتیں اپنے دانتوں تلے ہزار دبائے نہ دبنی والی انگلیاں دبا لیتیں اور آنکھوں میں آنسو بھر کر کہتیں "نگوڑی۔۔۔۔ مانگ جلی۔۔۔۔ عورت کا دل ہی تو ہے۔۔۔۔ آس کے دھاگے میں پرو کر رکھتی ہے بے چاری، کیا کرے۔"

گاؤں ویران ہو چکا تھا۔ کچھ لوگ، جن کے دم خم سے گاؤں کی رونق تھی، اچانک اٹھ کر گاؤں اور افق کے درمیان اُگ آنے والے ان دیکھے افق کے پیچھے کھو گئے تھے۔ ہاں چھوٹے سرکار

کے کھیت 'ان کا رعب داب سلامت تھا۔ عمردراز کا مکتب بھی سلامت تھا۔ باسط اس سے الگ ہو گیا تھا۔ اس کا اپنا گھر تھا' بیوی اور آدھے درجن بچے۔ سلطان اور منان۔۔۔۔ عمردراز کے جلائے ہوئے دو چراغ گاؤں کے اسکول میں پڑھ رہے تھے۔ عمردراز کے حصے کے کھیت اور مکتب کی گنڈے دار تنخواہ سے کام چل رہا تھا۔ علاج معالجے کی کوئی زیادہ فکر نہ تھی' باسط ابتدائی اسکول میں ماسٹر ہونے کے علاوہ ہومیوپیتھی کا ڈاکٹر ہو گیا تھا جو مریض کی تسکین کے لئے اس کے سر پر بھی اسٹیتھ سکوپ رکھ کر دوران خون کا راز معلوم کر لیتا تھا۔

زندگی جس طرح کٹ سکتی ہے' کٹ رہی تھی۔

عمردراز کی بیوی دوپہر کے وقت برتن مانجھ کر اور اپنے چھوٹے بچے کا پاجامہ بیونت کر آنگن میں پپیتے کے پیڑ تلے ذرا اونگھنے لگی تھی کہ پوسٹ مین کی گرج دار آواز نے اسے چونکا دیا۔ ایک منی آرڈر تھا۔ عمردراز نے بھیجا تھا! اجمیر شریف سے۔ اس کی بیوی تھر تھر کانپ رہی تھی۔ اجمیر شریف اس دنیا کی کسی جگہ کا نام ہے یا یہ بھی آسمان کے ساتویں طبق کا کوئی شہر ہے۔ اس منی آرڈر کے روپے ابھی خرچ بھی نہیں ہوئے تھے کہ ایک خط آیا۔ کسی اجنبی ہاتھ کا لکھا ہوا تھا۔

"عمردراز صاحب بستر مرگ پر ہیں۔ اتنے دنوں بعد کہیں سے ان کا پتہ ملا ہے تو آپ کو اطلاع دے رہے ہیں۔ اللہ انہیں محفوظ رکھے۔ ان کا ناسور انہیں کھائے جا رہا ہے۔۔۔۔"

جوں توں کر کے اس کی بیوی نے کچھ قرض لے کر' کچھ چیزیں بیچ کر' روپیہ فراہم کیا اور اپنے بیٹے کو دیا۔ باسط نے روپیہ بھیج دیا اور روزانہ عمردراز کا انتظار ہونے لگا۔ اس کی بیوی کی جھریاں اور لٹک آئیں اور آنکھیں اندر دھنس گئیں۔ ایک دن عمردراز آ ہی گیا۔ گاؤں کے سب لوگ جمع ہو گئے۔ عورتوں نے بلائیں لیں اس کمزور ڈھانچے کی جس کی سیاہی پر زردی جھلی بھی چمکتی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ چند دن میں اس کی گردن کا ناسور بہنا بند ہو گیا۔ وہ اٹھ بیٹھا اور گاؤں کے چکر بھی لگانے لگا۔ کبھی اس گلی میں' کبھی اس گلی میں۔ خانقاہ کی بے فکر زندگی اور لنگر خانے کی کھچڑی نے اس میں ایک خوف ناک گرسنگی پیدا کر دی تھی۔ اب پھر گاؤں کی عورتیں اس سے بیزار ہونے لگیں۔ ہر شخص عمردراز کو دھتکارنے لگا۔ قصور اس کا تھا۔ ہمیشہ

کھانے ناشتے کے وقت تاک کر آدھمکتا لوگوں کے گھر اور آنکھوں ہی آنکھوں میں ان کے دستر خوان کا صفایا کر کے رکھ دیتا۔۔۔۔اس کا مونہہ کھلتا اور بند ہوتا۔ اور کھانے کی ہر نعمت صاف ہو جاتی۔ اب پھر اس کے کان بند تھے۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔۔۔۔ صرف اس کے پیٹ کا مونہہ کھلا ہوا تھا۔ اس کا فیل پا جگہ جگہ سے پھٹنے لگا تھا۔ آنکھیں ہلدی کی طرح زرد اور داڑھی مونچھ جنگل کی جھاڑیاں نظر آتی تھیں۔ عورتیں کہتیں: "حد کر دی عمر دراز نے۔ ایسا زمانے کا ندیدہ تو نہ ہو کوئی۔" شادی' بیاہ' ختنہ' گوشوارہ۔ کوئی تقریب ہو۔ دستر خوان کی ہڈیاں چوسنے اور جوٹھی پلیٹیں چاٹنے کا کام تو وہ عبادت کی طرح کرتا تھا۔ گاؤں والے جہاں اس کو بلاتے' اس پر پھبتیاں کستے گالیاں بکتے' دھتکارتے وہاں اس پر مہربانی بھی کرتے۔ تمام کی تمام گلی سڑی چیزیں اسے کھانے کو دے دیتے۔ اور وہ بھی کیسا مزے میں کھاتا کہ لوگ مارے گھبراہٹ اور شرمندگی کے مونہہ پھیر لیتے۔ وہ اپنے فیل پا کی وجہ سے بہت آہستہ آہستہ چلتا۔ عورتیں دیکھ کر بھاگتیں لوگ اس سے دامن بچاتے۔ کون جانے کچھ کھانے کو مانگ بیٹھے ہاں جب کبھی وہ گاؤں سے باہر کمیروں' گوالوں یا کوئریوں کے بکھوں کی طرف نکل جاتا تو اس کی خوب آؤ بھگت ہوتی۔ دہی ملتا' چوڑا ملتا' گڑ ملتا' یہاں تک کہ تازہ ککڑیاں اور شکر قندیاں ملتیں۔ وہ اس وقت ان سے باتیں بھی کرتا۔ لوگ اس کے چاروں طرف بیٹھ جاتے۔ وہ ان کو اپنی اجمیر یاترا کی کہانی سناتا۔ "وہاں سب کی مرادیں بر آتی ہیں خواجہ کی درگاہ پر۔ منوں کھچڑی روز تقسیم ہوتی ہے۔ میں بالکل اچھا ہو گیا تھا۔ یکایک ناسور پھوٹ نکلا۔ مجھ سے کچھ گناہ ہو گیا تھا۔ میں نے ایک دن پہلے سوچا تھا کیوں نہ چلوں اپنے گاؤں۔۔۔۔ یہ بات خواجہ کو بری لگی۔۔۔۔ وہاں بڑا آرام تھا۔۔۔۔"

شام کا وقت تھا۔ وہ مغرب کی نماز پڑھ کر واپس آ رہا تھا۔ آج نماز کی صف میں بھی کچھ لوگ اس سے دور کھڑے تھے' ایک آدمی کی جگہ چھوڑ کر۔ اس کی گردن سے بدبو نکل رہی تھی۔ وہ اپنے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا گھر میں داخل ہوا۔ اس کی بیوی کے ہاتھ سے چراغ گر کر بجھ گیا۔ "تم اس گھر میں مت آؤ۔ میں تمہارا مونہہ دیکھنا نہیں چاہتی۔ تم پھر اجمیر چلے جاؤ۔"
"میں اجمیر نہیں جاؤں گا!" وہ اتنے زور سے چیخا کہ پپیتے کے پیڑ پر گھونسلے کی چڑیاں اڑ کر چکر کاٹنے لگیں۔

بیوی سہم کر کھڑی ہوگئی۔
"میں آج سے تمہارا مونہہ نہیں دیکھوں گا۔"
"میں بھی تمہارا مونہہ دیکھوں تو سور کا گوشت کھاؤں۔" اس کی بیوی نے بھی تھرتھراتی ہوئی آواز میں کہا اور جب تھوڑی دیر میں اس نے دوبارہ گرے ہوئے چراغ کو جلایا تو اس کے مونہہ سے چیخ نکل گئی۔ لیکن یہ اس کا محض وہم تھا۔ عمر دراز تو وہاں سے نکل کر گلی میں کانپ رہا تھا۔

اس دن کے بعد وہ پھر دوبارہ اس گھر میں داخل نہیں ہوا۔

بڑے 'بوڑھے' بچے سب اسے چڑاتے۔ "میں اجمیر نہیں جاؤں گا"۔ وہ اس کورس سے بھاگتا۔ مسجد میں پناہ لیتا۔ لیکن بچوں کی فوج وہاں بھی اس کا سر کچلنے کے لئے پہنچ جاتی۔ فیل پا کی وجہ سے وہ تیز نہیں بھاگ سکتا تھا۔ اس کے پیر سے کھڑاؤں نکل نکل کر آگے بھاگنے لگتی اور اس کے تلووں سے خون ٹپکنے لگتا۔

ان دنوں وہ اپنا زیادہ وقت سرکاری ڈیوڑھی پر بتاتا۔ چھوٹے سرکار کے کتب خانے سے پرانی کتابیں لے لے کر پڑھتا تھا۔ اپنے بھتیجے کی انگریزی کتابیں پڑھتا رہتا اور کبھی اس کے سامنے ہمہ تن سوال بن کر کھڑا ہو جاتا۔

"کیا ہے بڑے ابا"۔ وہ اس سے زیادہ نہ پوچھتا اور اپنے چچا کو دیکھنے کے بجائے بہت دور دیکھنے لگتا۔ وہ ایک چونی یا دُونی مانگتا اور اس کا بھتیجا اسے اٹھنی دے دیتا تو وہ گھبرا کر پیسے کو چھوڑ دیتا جیسے اس کی ہتھیلی پر کسی نے بچھو رکھ دیا ہو "نہیں مجھے بس دُونی دو۔ میں تو بیڑی خریدوں گا۔"

ایک دن دن بھر اسے بچوں نے دوڑایا۔ تاڑی پیتے ہوئے بڑے بوڑھوں اور نوجوانوں نے اسے بہت طعنے دیئے۔ ایک آدھ نے رحم کھا کر اسے بڈیاں چاٹنے کو بھی دیں۔ لیکن وہ اتنا بے دم تھا کہ اس سنہرے موقع کا فائدہ نہ اٹھا سکا۔ لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ اس کی گردن کے ناسور سے خون اور پیپ نے بہہ بہہ کر اس کے کرتے کے گریبان کو تر کر دیا۔ رات کے وقت وہ چھوٹے سرکار کے اصطبل کے پاس پیال میں گھس کر سو گیا۔ صبح اٹھا تو اس کی گردن ٹیڑھی ہوگئی تھی اور پاؤں کی انگلیاں پھٹ گئی تھیں۔

باسط کا دل اس دن بھر آیا۔ وہ اپنے باپ کو اپنے گھر لے آیا۔ اس کی بیوی نے چند دن اپنے سسر کی خدمت جی جان سے کی۔ مگر جب اس نے دیکھا کہ وہ ہوا میں معلق ہے۔ نہ آسمان پر جاتا ہے اور نہ زمین پر آتا ہے تو اس کا دل الجھ کر رہ گیا۔ روتے ہوئے بچوں کی کمر پر اس نے جھنجھلا کر ہاتھ رسید کئے اور اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

اس کالی کوٹھری میں یہ اس کی انیسویں صبح تھی۔ اس کی آنکھیں آنسو سے بھر آئی تھیں۔ ''میری آنکھوں کے تارے کتنے ناخوش اور دکھی ہیں......''

باسط مونہہ اندھیرے اس کی کوٹھری میں آیا۔ ''ابا آج کھچڑی کھائیں گے نا۔'' اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ عام طور پر ایسے سوال پر عمر دراز کا پورا جسم لرز اٹھتا تھا۔ لیکن اس وقت وہ خاموش پڑا ہوا تھا۔ باسط نے جھک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔۔۔۔ ''اوہ آج جب کہ ہاتھ بالکل خالی ہے۔۔۔۔''

''میرا کفن نہ خریدنا۔ بڑی گرانی ہے۔ ایسے ہی ڈال دینا مجھے قبر میں۔ خدا تو اعمال دیکھتا ہے۔''

باسط گھبرا کر باہر چلا آیا۔ اس نے اپنی چھتری کونے میں کھڑی کر دی اور ٹوپی اتار کر رکھ دی۔ ''منو کی اماں آج کھچڑی ضرور پکا دو۔''
''اچھا''۔
''نہیں ابھی پکا دو''۔ وہ خود بھی چولہے کے پاس بیٹھ گیا۔ جلدی جلدی دھوئیں میں کھچڑی تیار ہوئی۔

باسط ایک بڑے سے قاب میں کھچڑی لے کر کال کوٹھری میں آیا۔ عمر دراز کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ کھچڑی کی بھاپ اس کے چہرے اور باسط کی آنکھوں کے درمیان آہستہ آہستہ پگھل رہی تھی۔ باسط نے باپ کو جھنجھوڑ دیا۔ اس کی ناک میں سے دو تین مکھیاں اڑ کر بھاگیں۔ بیٹے نے باپ کی گردن میں ہاتھ ڈال کر اٹھایا اور بٹھا دیا۔ اس کا ہاتھ خون اور پیپ سے لت پت ہو گیا اور باپ کی پیٹھ کی کھال جھلی کی طرح اتر آئی۔ بیٹے نے گھبرا کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ عمر دراز چارپائی پر گرا اور اس کی زرد آنکھیں پھٹ سے بند ہو گئیں۔

سب ہی ماتم میں شریک تھے۔ عورتیں رو رو کر اس کی ساری زندگی کی یادوں کو دہرا رہی تھیں۔ بچوں کا مونہہ اتنا سا نکل آیا تھا۔ ان کا کھیل ختم ہو گیا تھا۔ دن ڈھلے جنازہ اٹھا تو سارا گاؤں اس میں شریک تھا۔ نہ شریک تھا تو اس کا بھتیجا۔ اس نے خاموشی سے کہا تھا! ''میں ان لوگوں کے ساتھ کھڑا ہو کر بڑے ابا کو الوداع نہیں کہوں گا' جنہوں نے ان کی زندگی میں ان سے جانوروں کا برتاؤ کیا ہے۔''

قبرستان میں ایک نئی قبر دھرتی کے نئے زخم کی طرح ابھر آئی۔ اس کی بیوی نے کھنڈر میں چھپ کر گاؤں والوں کو خوش خوش واپس آتے ہوئے دیکھا جیسے ان سب کے دل پر سے پتھر کی سل ہٹ گئی ہو۔ کھیتوں سے واپس آتے ہوئے کسان اپنے جانوروں کو چھوڑ کر اس کی قبر کے پاس آئے اور سر جھکا کر دیکھتے رہے۔

ڈوبتے ہوئے سورج کی چھاؤں میں کتنی خاموشی سے دھرتی ماں نے اپنے ایک ناقابل برداشت بچے کو اپنی چھاتی میں چھپا لیا تھا۔

اپنے بیلوں کو ہانکتے ہوئے ایک نے دوسرے سے کہا۔

''دھرتی کا کلیجہ کتنا بڑا ہے۔''

O

آنگن کی دھوپ

میگھا رانی تمہارے دانت کتنے پیارے ہیں' گلہری کے دانت۔ تمہارے بال کب کٹے۔ کس نے کٹوائے' مجھے اچھے لگتے تھے تمہارے گردن پر دوڑتی گلہری کی طرح سنہرے بال۔ ہاں گلابی فیتہ بھی خوب پھبتا ہے' لگتا ہے بڑی سی تتلی تمہارے سر پر بسیرا کرنے کے لئے اتر آئی ہے۔ بھاگ کیوں رہی ہو؟ آؤ آؤ میں تم کو اپنے بازوؤں میں چھپالوں۔ سمجھا' یہ نٹ کھٹ ساشا تمہاری چاکلٹ اڑانا چاہتا ہوگا۔ اور جوتے کہاں گئے۔ اوہو ٹھنڈے ٹھنڈے پاؤں' ریشم جیسے نرم پاؤں گلابی گلابی' آؤ میں ان کو اپنی مٹھیوں میں چھپالوں۔ گرم ہو جائیں گے۔ نہ جانے یہ لوگ اس کو موزے کیوں نہیں پہناتے؟

وہ اپنی ننھی ننھی ہتھیلیاں میری آنکھوں پر رکھ دیتی ہے اور چلاتی ہے "ڈھونڈو! میں کھو گئی ہوں۔ مجھے ڈھونڈو!" اور میں اس کو ڈھونڈتا ہوں۔ پلنگ کے نیچے' پردے کے پیچھے' اپنی جیب میں۔ اور ہر بار اس کی گھنٹیوں جیسی بجتی آواز میرے دل میں دور تک گونجتی چلی جاتی ہے۔ اور ساشا اتنے میں دبے پاؤں آتا ہے اور مجھ پر ٹوٹ پڑتا ہے۔ میں شکاری ہوں۔ بہت دور سے آیا ہوں۔ جنگل سے۔ جنگل سے؟ بھئی جنگل کیوں گئے تھے۔ شیر کو مارنے۔ شیر کو؟ شیر تو بہت اچھا ہوتا ہے۔ نہیں نہیں میں تو دوسرے شیر کو مارنے گیا تھا۔ دوسرا شیر کون؟ وہ جو روز رات کو آتا تھا' جانوروں کو اٹھالے جاتا تھا۔ وہ میرا بے چارا خرگوش۔ کیوں کیا ہوا خرگوش کو؟ (شیر اٹھا کر لے گیا اور اس خرگوش کی نرم کھال کے دستانے بنوالئے۔ دستانے؟ ہاں تاکہ جب باہر نکلے تو کوئی اس کے پنجے نہ دیکھے۔ ان ہی پنجوں سے تو اس نے خرگوش کو دبوچ لیا تھا۔ اوہو۔ ساشا میں تو دوڑ رہا ہوں۔ کہیں تمہارا شیر یہاں آنکلا تو میرا اور میگھا کا

کیا ہو گا۔ کیوں میگھا ہمارا کیا ہو گا؟ اوہو ہو ہو! بتاؤ نا ہمارا کیا ہو گا؟ ہم چوہا بن جائیں گے۔ پھر؟ پھر ہم بل میں چھپ جائیں گے۔ کیوں ہم چھپ کیوں جائیں گے۔ بلی آئے گی اور ہم کو کھا جائے گی۔ اور ہم چوہا نہ بنے تو؟ ساشا کا منہ کھلتا ہے اور آنکھوں سے دھوپ چھلکنے لگتی ہے اوہو نانا۔ تم بالکل ہاف وِٹ ہو۔ تو پھر شیر آئے گا اور تم کو کھا جائے گا۔ اور چوہا بن گیا تو؟ تو بلی آئے گی اور تم کو کھا جائے گی۔ میگھا کی آنکھوں سے دھوپ چھلکی اور میں کھسیا کر ہنسنے لگا۔ مگر چھوٹی چڑیا چہکتی رہی اور ساشا چاکلیٹ لے اڑا۔ وہ آنگن میں دوڑ رہا ہے اور چاکلیٹ کھا رہا ہے اور اس کی آنکھوں کی دھوپ آنگن کے درخت سے چھنتی دھوپ میں گھل گئی ہے اور وہ ایک رنگ بن گیا ہے، جس میں سو رنگ ہیں' ایک چہکار' اور رفتار' زندگی یہاں سے شروع ہوتی ہے اور میگھا میری آستین کھینچتی ہے۔ ساشا میری چاکلیٹ لے گیا۔ مجھے اور چاکلیٹ دو۔ اور میں دیتا ہوں۔ زندگی یہاں سے بھی شروع ہوتی ہے۔ اور اب دونوں خوش ہیں۔ رنگوں کی طرح جن کی لہروں میں ان کے قہقہے اور ناچ بہہ رہے ہیں۔

میں بھی کبھی اسی طرح آنگن میں کھیلتا ہوں گا اور کوئی مجھے شعلے کی طرح لپکتا دیکھتا ہو گا اور دیکھنے والے کا دل امیدوں کی دھوپ سے بھر جاتا ہو گا۔ لیکن اب مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ یہ دھوپ کبھی بھی بجھ سکتی ہے۔ کبھی بھی ایک طوفان اٹھ سکتا ہے' ایسا جیسا پہلے کبھی نہیں اٹھا۔ اور وہ سب کچھ اپنے شعلوں میں بہا کر سورج کے اندھیرے غار میں ڈبو سکتا ہے۔ کبھی بھی۔ شاید یہ طوفان اس لئے آئے گا کہ میں چپ ہوں۔ چپ سے پیدا ہونے والا طوفان بہت بھیانک ہوتا ہے۔

جانے میں کیا کیا بکتا رہتا ہوں۔ لگتا ہے میں کوئی اور ہوں' میں نہیں۔ اور 'کوئی اور میرے دل کے کھنڈر میں چمگادڑ کی طرح اڑتا رہتا ہے۔ ڈھیتی دیواروں سے اس کے ٹکرانے کی آواز میں سنتا رہتا ہوں۔ مٹی سرسراتی ہے اور ہوا مٹی کو لے اڑتی ہے۔ اور میں صبح سے شام تک اندھی آنکھوں سے سب کچھ دیکھتا رہتا ہوں اور مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

دونوں اب تک آنگن میں کھیل رہے ہیں۔ نہ جانے ان کو گیلی مٹی کہاں سے مل گئی ہے' امرود کے پیڑ کے نیچے۔ ان کو پتہ ہی نہیں کہ میں ہوں اور ان کو دیکھ رہا ہوں۔ بچوں کی اپنی دنیا ہے'

اپنے ہاتھ 'اپنی مٹی 'اپنا چاک 'چاک گھوم رہا ہے اور وہ برتن بنا رہے ہیں۔ کوئی صراحی 'کوئی گلاس 'کوئی پیالہ۔ لیکن وہ ایک دوسرے سے مٹی چھین رہے ہیں۔ اور چلا رہے ہیں: "یہ میری مٹی ہے۔ یہ میری مٹی ہے۔"

اور میری مٹی؟ میں چپ چاپ ہنستا ہوں۔ اور میرا سورج؟ میں پھر چپ چاپ ہنستا ہوں۔ دھوپ اب پورے آنگن میں بھر گئی ہے اور دونوں بچے پھر دوڑ رہے ہیں۔ ساشا بچی سے پوچھتا ہے "میگھا تم کیا کر رہی ہو؟" جواب ملتا ہے: "گھونسلہ بنا رہی ہوں۔" پھر ساشا کی آواز گونجتی ہے "گھونسلے کا کیا کرو گی؟" میگھا کے ہونٹ چونچ کی طرح نکیلے ہو جاتے ہیں۔ "رہوں گی گھونسلے میں!" ساشا باز کی طرح جھپٹتا ہے اور میگھا کے گرد چکر کاٹتا ہے۔ "گھونسلے میں تو چڑیا رہتی ہے۔" "میں بھی تو چڑیا ہوں 'دیکھو چونچ!" دونوں ہاتھ پکڑ کر درخت کے گرد چکر لگاتے ہیں اور دھوپ ان کے چکراتے سایوں سے کھیلتی ہے۔

زندگی یوں بھی تو شروع ہوتی ہے۔ کیا ان کی باتوں سے کسی اور چھور کا پتہ چلتا ہے۔ ننھے ننھے مشاہدوں سے یہ باتیں پانی کے دھار کی طرح پھوٹتی ہیں۔ اور وہ صبح سے شام اور شام سے صبح کبھی سایوں کے پیچھے بھاگنے میں اور کبھی روشنی میں چھپنے میں کر دیتے ہیں۔ میں جہاں ہوں وہاں نہ دھوپ ہے 'نہ سائے 'بس ایک جھٹپٹا سا ہے۔ کچھ یادوں کا 'کچھ خوابوں کا۔

ہاں بیٹا ساشا اگر میں تم کو اپنے کندھوں پر بٹھالوں تو تم کہاں تک دیکھ سکتے ہو۔ پہلے بٹھاؤ۔ اب بیٹھ گئے 'اب بتاؤ۔ میں بھی بیٹھوں گی گردن پر۔ میگھا رانی 'اچھا لو تم بھی بیٹھ گئیں۔ اب تم دونوں باری باری سے بتاؤ۔ بتائیں؟ دیوار ہے دیوار۔ تالیاں 'اچھا۔ اب نکلتے ہیں اس آنگن سے۔ باہر۔ اب بتاؤ۔ کیا دیکھتے ہو؟ پیڑ 'اور آگے؟ اور آگے کھڑکیاں 'کھڑکیوں میں روشنی روشنی میں سایہ 'سائے میں روشنی 'اور آگے؟ اور آگے اور آگے 'اندھیرا اور اندھیرے میں؟ اندھیرے میں چاند 'اور چاند میں؟ چاند میں 'چاند میں 'اندھیرا! ارے بھئی گردن ٹوٹی میری تو 'اترو۔ اترو۔

رات گہری ہوگئی ہے اور باہر درختوں پر کہرا اتر رہا ہے۔ آہستہ آہستہ۔ کہرے پر نیون لائٹ بھاپ کی طرح تیر رہی ہے۔ اور دونوں لحاف میں لیٹے ہوئے ہیں مگر ان کی آنکھیں بھونروں

کی طرح چمک رہی ہیں۔ پپوٹوں پر نیند کا کہرا ہے لیکن کہرے میں آنکھوں کی لویں لپک رہی ہیں۔ میں التجا کرتا ہوں۔ بھئی سو جاؤ۔ مگر ساشا اور میگھا دونوں کی ضد جاری ہے۔ نہیں ہر رات کی طرح ان کو کہانی کا انتظار ہے۔ اچھا سنو۔ کون سی سناؤں۔ شیر والی کہانی جو روز رات کو آکر جانوروں کو اٹھا لے جاتا تھا۔ نہیں 'دوستو' آج میں تم کو شیر کی کہانی سناؤں گا جو خرگوش کو اٹھا لے گیا اور جس نے اس کے سمور کے دستانے بنا لئے تاکہ اس کے پنجے دکھائی نہ دیں۔ نہیں آج میں تم کو ایک بوڑھے کی کہانی سناتا ہوں۔

سناؤ۔

سنو۔

ایک تھا بوڑھا۔ لکڑہارا۔ وہ روز جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتا تھا۔ وہ لکڑیاں لا کر بیچتا تھا۔ اور جو پیسہ اس کے ہاتھ میں آتا تھا وہ اس سے کام کی چیزیں خریدتا تھا۔ تب اس کی بیوی چولہا جلاتی تھی۔ لکڑی کچی ہو تو دھواں بہت اٹھتا ہے۔ سو دھواں بہت اٹھتا تھا۔ ایک دن عورت نے جھریوں میں پھیلتے آنسوؤں کو پونچھتے ہوئے بوڑھے لکڑہارے سے پوچھا۔ کچے درختوں کو کاٹتے ہوئے کیا تم کو ان درختوں سے ان کی عمر چھینتے اچھا لگتا ہے؟ ابھی تو ان کے دھوپ کھانے اور ہوا میں جھولنے کے دن تھے۔ ایسے میں تو ایک دن سارا جنگل کٹ جائے گا۔ پھر تم کیا کرو گے؟ لکڑہارا سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا تب تو ہم بھی نہیں ہوں گے۔ نہ جنگل' ہم نہیں ہوں گے پر اور تو ہوں گے۔ عقل کے دشمن۔ عورت نے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے پھر چولہے میں پھونکنا شروع کر دیا۔ آگ تیز ہو گئی۔ عورت کا چہرہ روشنی اور گرمی سے دہک اٹھا۔ لکڑہارا اداس ہو گیا۔ وہ اپنے دل کے ساتھ بہنے لگا۔ وہ بہتے بہتے جنگل پہنچ گیا۔ سارا جنگل اندھیرے میں چھپ گیا تھا اور ہوائیں رو رہی تھیں۔ ہواؤں کے ساتھ جانور بھی رو رہے تھے۔ جانوروں کے ساتھ بوڑھا لکڑہارا بھی رونے لگا۔ اندھیرے میں چھوٹے چھوٹے پودوں کی آوازوں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور پوچھا تم کیوں روتے ہو لکڑہارے؟ میں تو یوں روتا ہوں کہ تم روتے ہو۔ ہم تو یوں روتے ہیں کہ ہم کٹ گئے۔ اور تم؟ اور میں یوں روتا ہوں کہ میں زندگی بھر تم کو کاٹتا رہا۔ اور اب رات ہوتی ہے تو رات کا جنگل تو ہے' پر وہ ہنستے کھیلتے درخت دکھائی نہیں دیتے۔ میں بہت اکیلا ہو گیا ہوں۔ سارا جنگل ہنسنے لگا۔ سارے چاند'

سارے سورج ہوا میں تیرنے لگے۔ لکڑہارے کا سر چکرایا اور وہ دلدل میں گر گیا۔ اب وہ جتنا ہاتھ پاؤں مارتا تھا اندر دھنستا جاتا تھا۔ یکایک دھماکا ہوا اور۔۔۔۔

میں آنکھیں ملتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ دھوپ دیوار پر چڑھ آئی ہے۔ اور ساشا ابھی تک آنگن کے درختوں کے پاس مٹی سے صراحی بنا رہا ہے اور میگھا تنکوں سے گھونسلہ۔ ویسے بڑا سناٹا ہے۔

O

پیلے پھول

گیندے کے پھولوں پر چڑھتے سورج کی کرنیں چاندی کے تاروں کی طرح لرز رہی تھیں۔
پھول آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔
"چڑیوں کی طرح پر تول رہے ہیں ..."
کمپاؤنڈر مختار احمد نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے ایک بار پھر کھڑکی سے باہر دیکھا اور آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے گلے میں کھانسی کی سرسراہٹ شروع ہوئی تو لگا کہ اس کا دل بھی چڑیوں کی طرح پر تول رہا ہے۔
"اے دل تجھے اڑ کر کہاں جانا ہے..... ٹھہر....."
اس نے آنکھیں بند کیے کیے پان کی باسی گلوری منہ میں رکھی، چھوٹی سی شیشی سے چٹکی بھر زردہ نکال کر پھانکا اور کروٹ بدل کر یوں پڑا رہا جیسے اسے نہ تو کھانسی کا اندیشہ ہو، نہ مہینوں کی بیماری کا غم۔

"ابا چھینکے مارتا ہے اور منہ چڑاتا ہے...... اوں...... اوں......" منجھلے بیٹے کی آواز آنگن سے آئی۔
"لو صبح ہوگئی روز رات کو سوچتا ہوں، نہ جانے کل صبح ہو کہ نہ ہو...... میں کتنا وہمی ہوں......"
کمپاؤنڈر مختار احمد ڈسٹرکٹ بورڈ کے اس چھوٹے سے خیراتی ہسپتال میں پچھلے چار برس سے کام کر رہا تھا۔ ویسے آخری سال تو محض کھانسیوں اور بیماریوں میں کٹ گیا۔ اسی ہسپتال میں اس کا سالا ڈاکٹر تھا۔ یہ بات اتفاق بھی تھی اور مصلحت بھی۔ ڈاکٹر سالا چلتا سکہ تھا۔ اس کی ڈاکٹری پورے علاقے میں ریل کی طرح چلتی تھی۔ وہ ڈاکٹر کم تھا اور پرزہ زیادہ۔ اور وہ بھی چلتا پرزہ۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ دیکھنے میں بڑا شریف آدمی معلوم ہوتا تھا اور

ٹھگنے سے قد، مچی مچی آنکھوں، بڑے بڑے دانتوں، پتلے پتلے ہونٹوں، جھگی جھگی مونچھوں اور اہمساوالی مسکراہٹ کی وجہ سے بڑا ہی خاکسار اور خدا ترس بھی دکھائی دیتا تھا۔

اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن اب بھی اسے گیندے کے پھول پیلے پیلے قہقہوں کی طرح چمکتے نظر آرہے تھے۔

گیندے کے یہ پھول بالکل کھڑکی کے پاس اس نے اپنے ہاتھوں سے لگائے تھے۔ ہسپتال کے ملازم اور مالی نے اپنی باغبانی کا سارا زور ڈاکٹر کے کوارٹر کے سامنے والے احاطے پر لگا دیا تھا۔ لیکن اس کے لگائے ہوئے گیندے کی بات اور کسی پودے میں نہ تھی۔ کم از کم وہ یہی سمجھتا تھا۔
"چراغوں کی طرح جھلملاتے ہیں یہ پھول......"
وہ اکثر یوں سوچتا۔ لیکن جب پچھلے مہینے ایک ہفتے کے اندر اس کے منہ سے دوبار خون آیا تو اس کی زہر میں ڈوبی ہوئی مسکراہٹ نے اس خیال کا تار کاٹ دیا۔
"لیکن چراغ بجھ بھی تو جاتے ہیں......"
صبح ہی صبح خنک ہوا کے ساتھ کھڑکی سے گیندے کے پھولوں کی خوشبو جو آئی تو ایک بار پھر یہی خیال شعلے کی طرح بھڑک کر بجھ گیا۔ اور اس کی بند آنکھوں کا اجالا ایک تاریک خلا میں کھو گیا۔

"لیکن یہ دق نہیں ہے...... میں نے بہت سے دیکھے ہیں دق کے مریض۔ ان کے چہرے کی رنگت بدل جاتی ہے۔ کتنی خشک زردی کھنڈ جاتی ہے ان کے چہروں پر۔ انگلیاں تک زرد پڑ جاتی ہیں۔ آنکھوں سے کیسی حسرت اور ناامیدی جھانکتی ہے۔ اف یہ ناامیدی تو موت سے بھی زیادہ بھیانک ہوتی ہے! بھیانک...... اف موت کتنی بھیانک چیز ہے اور میں جانتا ہوں موت ابھی مجھ سے بہت دور ہے......"

سب سے پہلے چھوٹا بیٹا جھومتا جھامتا آستین سے ناک صاف کرتے ہوئے باہر والے کمرے میں گھسا۔ کمپاؤنڈر مختار احمد کی آنکھ چاندی کے گھنگھروں کی طرح بجتی ہوئی ہنسی سے کھل گئی۔ پہلے تو اس نے ہاتھ بڑھایا لیکن فوراً ہی کھینچ لیا۔

"چنے جاؤ جاؤ...... اماں کے پاس جاؤ...... ارے منے چنے کو لے جاؤ چنے کو......" اس کی

تھرتھراتی ہوئی آواز ابھری اور چنے ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔

کمپاؤنڈر مختار احمد اپنے دل میں یہ خیال جمائے ہوئے تھا کہ اسے دق کی بیماری نہیں ہے اور نہ موت اس کے پاس پھٹک سکتی ہے۔ چنے روز صبح یہی کرتا تھا۔ اٹھتے ہی باپ کے باہر والے کمرے کی طرف کھسک جاتا تھا۔ دو بڑے بھائیوں اور دو بڑی بہنوں کو اپنے جزدانوں اور کھیلوں کی ایسی پڑی رہتی تھی کہ ماں کو پکار کر چنے کی چوری کی اطلاع دینے کی بھی سدھ بدھ نہ رہتی۔ جب کمپاؤنڈر کی تھرتھراتی ہوئی آواز آنگن پار کر کے باورچی خانے تک پہنچی تو ماں چولہا چھوڑ باہر والے کمرے کی طرف بھاگی۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ایک آن کی بھی دیر ہوئی تو کمپاؤنڈر مختار احمد گھبرا کر رونا شروع کر دے گا۔

اسے اپنی بیماری اور موت کی قربت کا ذرا یقین نہ تھا لیکن وہ بچوں کو اپنے پاس نہ آنے دیتا اور نہ اپنے برتن کمرے سے باہر جانے دیتا۔ اسے اپنی بیوی پر اعتماد نہ تھا۔
"نیک بخت میں تمہیں خوب جانتا ہوں۔۔۔۔ جاؤ گی اور بچوں کو ان رکابیوں میں کھانا کھلا دو گی۔۔۔۔"

اس دن خلاف معمول کمپاؤنڈر مختار احمد نے آنکھیں بند کیے کیے بیوی سے کہا "چنے کو آنگن میں چھوڑ کر ذرا آجاؤ۔۔۔۔ نیک بخت۔۔۔۔ سمجھیں؟"

بیوی آگئی اور اس کے پاس ہی پٹی پر بیٹھ گئی۔ اس کی بڑی بڑی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ کانوں میں چاندی کی بالیاں لٹک رہی تھیں۔ ملگجے آنچل نے اس کے چہرے کی زردی اور بڑھا دی تھی۔ چھوٹی چھوٹی پھولی پھولی انگلیوں میں گوندھا ہوا آٹا سوکھ رہا تھا۔ جسے وہ سیویوں کی طرح چھڑا رہی تھی۔

نیک بخت عورت جس کے بھورے بال الجھے ہوئے تھے اور بھاری ہونٹ کانپ رہے تھے، کبھی کبھی آنکھوں سے اپنے میاں کو دیکھ رہی تھی۔۔۔۔ کمپاؤنڈر کو محسوس ہوا کہ یہ عورت اس کی بیوی نہیں ہے۔ وہ اس کے پانچ بچوں کی ماں نہیں ہے۔ وہ جنگل میں کھوئی ہوئی راہی ہے۔ اندھیرا ہے۔ راستہ سجھائی نہیں دیتا۔ اب کیا ہو؟

"تم اس طرح کیوں دیکھ رہی ہو؟ میں مر نہیں رہا ہوں......" اس نے کھانسی کے ریلے کو

دباتے ہوئے آنکھیں بند کئے کئے کہا۔ "دیکھ لیا تم نے اپنے چہیتے بھائی کو۔ بینک میں کچھ نہیں تو پچاس ہزار روپیہ سینت رکھا ہے لیکن اب جو میں خون تھوکنے لگا تو......" اسے بڑے زور سے کھانسی آئی اور وہ اگالدان پر جھک گیا۔ اس کی پیشانی کی رگیں خون چوستی ہوئی جونکوں کی طرح پھول گئیں۔ گیلی انگلیوں سے آٹا چھڑاتی رہی اور نہ جانے کیا بڑبڑاتی رہی۔

"نیک بخت تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گا یہ گورکھ دھندا۔۔۔۔ پر کمپاؤنڈر مختار احمد سب سمجھتا ہے...... میں سب جانتا ہوں۔ یہ لوگ ایسے ہی ہوتے ہیں۔ انسان کو کولہو کا بیل سمجھتے ہیں...... میں نے جو کیا ہے اس کے لئے، کیسے کیسے گناہ کئے ہیں اس خبیث کی خاطر۔۔۔۔ ہائے مجھے قبر میں بھی چین نہ پڑے گا......" کمپاؤنڈر اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

بیوی کی انگلیاں کانپنے لگیں اور ہونٹ بھینچ گئے۔

"تو میں کیا کروں۔۔۔۔ میں نے تو نہیں کہا تھا...... تم تو خود افلاطون بنے پھرتے تھے نا۔۔۔۔" "لو دیکھ لو اب افلاطون خون تھوک رہا ہے' مر رہا ہے' تم تو اپنی جان سے جاؤ گے' پر اتنا نہیں سوچا ان پانچ یتیموں کا کیا ہوگا۔"

بیوی اٹھ کھڑی ہوئی اور تیزی سے اندر چلی گئی۔

"یتیم۔۔۔۔ ابھی سے یتیم' جنم کے یتیم۔" اسے پانچ بچوں کا خیال آیا۔ چار تو خیر سے مکتب میں پڑھتے تھے۔ لیکن چنے کو ابھی پاجامہ سنبھالنے کی بھی تمیز نہ تھی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"میری آنکھیں کیوں بھر آتی ہیں بات بات پر۔ کیا سچ مچ موت اتنی قریب ہے؟"

چاروں بیٹے بیٹیاں چاؤں چاؤں کرتے ہوئے گھونسلے سے نکلے اور جزدان اور تختیاں سنبھالتے ہوئے پھر بھاگ کھڑے ہوئے۔ کسی نے باپ کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ اسے یہ بات بہت بری لگی۔ اس کا جی بھر آیا۔

"یتیم۔۔۔۔ کچھ نہیں جانتے یہ بدنصیب۔"

کمپاؤنڈر مختار احمد کو کھڑکی کے باہر گیندے کے پھول سر ہلا ہلا کر بلاتے ہوئے نظر آئے۔ "ہلاؤ' ہلاؤ' سر ہلاؤ۔۔۔۔ تم بھی یتیم ہو جاؤ گے......" اسے اپنے ہاتھوں سے اگائے ہوئے

پھولوں پر بڑا ترس آیا۔ پچھلے دنوں ہر چیز میں موت کی پرچھائیں اور سب کی آنکھوں میں آنسو دیکھنے کی خواہش اس کے دل میں جوالا مکھی کی طرح پکتی رہی تھی۔ پھولوں کی یتیمی کے خیال سے اس کے دل کو بڑا سکون ہوا۔ بھیگے ہوئے پھول اسی طرح مسکراتے رہے۔ دھوپ اسی طرح لرزتی رہی۔

"نہیں نہیں...... میں یوں گھل کر نہیں مروں گا۔ میں کوئی پھول نہیں ہوں۔ جو صبح کھلا اور شام مرجھا گیا۔ میں ہسپتال جاؤں گا۔ دوا بناؤں گا۔ مریضوں کو لطیفے سناؤں گا۔ اور کہوں گا جب کمپاؤنڈر مختار احمد مر جائے گا تو تم سب اس کی قبر پر پھول چڑھانے آؤ گے اور کہو گے۔۔۔۔ بڑا زندہ دل آدمی تھا۔ لوگوں کا دل خوش کرنا کیسی بڑی عبادت ہے' کوئی اس کے دل سے پوچھتا۔ لیکن دیکھ لو اس عبادت کا پھل اسے کیا ملا۔ سالے نے اسے کہاں دفن کرایا ہے۔۔۔۔ ہر طرف دلدل اور گندی کیچڑ ہے......"

کمپاؤنڈر مختار احمد کو اپنی زندہ دلی پر بڑا ناز تھا۔ اس کا حال اس چراغ جیسا تھا جسے معلوم ہو کہ میرے جلنے سے جو جوت پیدا ہوتی ہے' اس کی بدولت بہت سے بھٹکے ہوئے راہی راستہ پا لیتے ہیں۔

اس کے جسم میں اچانک نہ جانے کیسی بجلی دوڑ گئی کہ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھیں تھرتھرا رہی تھیں۔ ایک ٹانگ تو ہمیشہ کو اکڑ کر کچھ چھوٹی ہو گئی تھی۔ منحنی سا آدمی چھوٹی بڑی ٹانگوں پر بھنک بھنک کر چلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ چکرا کر تپائی پر بیٹھ گیا۔ لالٹین ٹکر سے گری اور چمنی چکنا چور ہو گئی۔ وہ بکھرے ہوئے ریزوں کو دیکھتا رہا اور مسکراتا رہا۔ یہ سب جانتے تھے کہ وہ اپنی چھوٹی ٹانگ کو خدا کا نیک بندہ کہا کرتا تھا۔ کہتا میری یہ ٹانگ سارے امتحانوں سے گزر چکی ہے اور ولی کے درجہ پر پہنچ گئی ہے۔ بات صرف اتنی تھی کہ چند برس پہلے اس نے کالے جوتے خریدے لیکن وہ ایسے کٹ کھنے نکلے کہ جان بچانے کے لئے اسے ایڑی سے ران تک جگہ جگہ سات آپریشن کرانے پڑے۔ وہ مہینوں ایک ٹانگ رسی کے پھندے میں ڈالے پڑا رہا۔ وہ اس وقت بھی ہنس کر کہا کرتا تھا "لٹکا دو پھانسی کے پھندے میں۔ میری ٹانگ شہید ہونے والی نہیں۔" جب چھ مہینے بعد وہ پلنگ سے اٹھا تو ٹانگ شہید تو نہ ہوئی لیکن لنگڑی

ضرور ہوگئی۔ لنگڑی ٹانگ سوکھ گئی تھی' اس لئے پیر کا ناپ بھی بدل گیا۔ اسے ایک ایسا شاہی چمار بھی مل گیا جس نے بڑی شان و شوکت سے اس کے جوتے بنائے۔ دو ناپ کے جوتے بڑے شاندار نکلے۔ کیونکہ چھوٹے جوتے کی ایڑی کوئی تین انچ اونچی تھی۔ لیکن اب جو اس کی چال میں ہلکی سی بھنک شامل تھی تو اس میں قصور جوتوں کا نہ تھا بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ چھوٹی ٹانگ گھٹنے سے مڑتی ہی نہ تھی۔ ٹانگ کیا تھی' زنگ سے جکڑی ہوئی کمانی تھی۔

کبھی کبھی وہ پان کی پیک تھوکتے ہوئے آنکھ مار کر اونچی ایڑی کا جوتا دکھاتے ہوئے کسی مریض سے کہتا "مجھے تو لگتا ہے سالے صفا دھوکہ کر گئے۔ کسی جسم کی ٹانگ کاٹ کر لگا دی میرے جسم میں' ذرا دیکھیۓ پانڈے جی۔۔۔۔ تربوز جتنا بڑا سر ہلاتے ہو پر اتنا نہیں دیکھتے کہ یہ قلمی ٹانگ اونچی ایڑی والی کالی میم کی ہے۔۔۔۔۔۔"

اسے بولنے کا اتنا شوق تھا کہ اکثر سمجھداری کی بات کرتے کرتے مہمل گوئی پر اتر آتا تھا۔ اس کا انگریزی کا علم اونٹ کے منہ میں زیرے کے برابر تھا۔ آخر میٹرک فیل کمپاؤنڈر تھا وہ۔ مگر یہ بات وہ ماننے کو ہرگز تیار نہ تھا۔ اسی لئے اکثر جا و بے جا وہ اپنی انگریزی کا مظاہرہ کرتا رہتا تھا۔ گھی کے بارے میں اپنی رائے ضرور دیتا لیکن یہ نہ کہتا کہ اس گھی میں ملاوٹ ہے۔ کہتا صاحب ہمارے ملک میں adultery بہت ہے اور اس انگریزی لفظ کو ملاوٹ کے معنی میں توڑتے مڑورتے ہوئے اس موضوع پر دیر تک اپنی سی ہانکتا رہتا اور بتاتا جاتا کس چیز میں کس چیز کی ملاوٹ ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ بے ایمان ڈاکٹروں اور کمپاؤنڈروں کی "adultery" پر بھی روشنی ڈالنا شروع کر دیتا۔

"جناب آپ اتنا بھی نہیں جانتے کہ یہ سور کے قورمے "carminatine mixture" میں کیا ملا دیتے ہیں۔ پان کی پیک ملا دیتے ہیں یہ بلی گے کتے بلکہ کتے کے گدھے۔۔۔۔۔۔"

اس کی گالیاں بھی اس کے تصور کی اڑان کا خوب ساتھ دیتی تھیں۔ بندھے ٹکے محاوروں اور اصطلاحوں سے اسے سخت نفرت تھی۔ وہ ایک ایسی جوئے رواں تھا جو تڑپ تڑپ کر بیکراں ہوتی رہتی تھی۔ اس کے ٹھگنے سے قد' دھان پان جسم' بنوٹ کے استادوں جیسی ترشی ہوئی مونچھوں' چھوٹی چھوٹی اندر کو دھنسی ہوئی شرمیلی آنکھوں کو دیکھ کر لوگوں کو چاہے یقین آئے

نہ آئے' اس کی روح ریشمیں دھاگے کی طرح تھی جو پہلے ہی لمحے سے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک الجھ گئی ہو۔ وہ روزے نماز کا پابند بھی تھا اور تاڑی اور نخرے کا شوقین بھی۔ وہ دنیا بھر کی بہنوں کو ماں بہن سمجھتا تھا لیکن جوان عورت کے بھرے بھرے گرم بازو میں انجکشن لگاتے وقت ٹھنڈی سانس اس کے روکے نہ رکتی تھی۔ جس کی تلافی وہ فرمائشی چھینک سے کر دیتا تھا۔ بہت سی چیزیں اس کی زندگی کا حصہ اس لئے بن گئی تھیں کہ وہ کسی اور کی زندگی میں جذب نہ ہوسکیں۔ کم از کم وہ اپنی زندگی کے متعلق اس طرح کی گپ اڑایا کرتا تھا۔ وہ ایسی گپ اکثر تاڑی پینے کے بعد ہوش و حواس کی قسم کھا کھا کر اڑاتا تھا۔

"خدا کی قسم میں بالکل ہوش و حواس میں ہوں۔ میں نے پی ہی نہیں۔ لو منہ سونگھ لو۔ ایمان سے کہنا تاڑی کی بو ہے یا صندل کی؟" اسے ہچکی آتی اور وہ پاجامے کے پائنچے گھٹنوں تک چڑھا کر پنڈلیاں سہلانے لگتا۔ "میں آدمی نہیں ہوں۔ میں تو تسبیح ہوں۔ صندل کی تسبیح جس کے ایک ایک دانے پر نہ جانے کیسے کیسے جغادریوں نے سبحان اللہ کا وظیفہ پڑھا ہے۔ سچ بتاؤ تسبیح کیا ہے' دھاگے میں پروئے ہوئے دانوں کی قیمت کیا ہے؟ دھاگا توڑ دو پھر ان دانوں کا کیا ہوگا؟ بکھر جائیں گے نا؟ میں بھی بکھر جاؤں گا' خوشبو کی طرح' اور کون جانے دھوئیں کی طرح۔۔۔ جارج پنجم کو گولڈ میڈل مار دو۔۔۔۔ خدا کی قسم میں نے پی ہی نہیں۔ میں تو صندل کی تسبیح ہوں۔ ابے او سالے کی دم' ابے او چنبیلی کے پھول' تجھے میرے بکھرنے کا انتظار ہے۔۔۔ لیکن کوئی بات نہیں میرے سالے نے اسی فوجداری میں دو ہزار روپیہ بنالیا۔ فوجداری بڑی اچھی چیز ہے۔ کیونکہ فوجداری ہوتی ہے تو میرے ڈاکٹر سالے کو دو ہزار روپیہ ملتا ہے۔ اور اگر ڈاکٹر سالا نہ ہو تو بہنوئی کمپاؤنڈر نہیں بن سکتا' یعنی اس کی شادی ڈاکٹر کی نیم پاگل بہن یا بھرپیٹ بے وقوف عورت سے نہیں ہوسکتی۔ میں نے پی ہی نہیں ۔۔۔ لو میرا منہ سونگھ لو......"

لیکن ایسا روز روز نہیں ہوتا تھا۔ ویسے اور روز تو گھڑی کی طرح وہ ٹک ٹک کرتا رہتا تھا۔ صبح سویرے ہسپتال میں پہنچ کر اسے عجیب راحت ہوتی۔ جیسے رات کی جنگالی سے تھکی ہوئی گائے سرسبز چراگاہ میں پہنچا دی گئی ہو۔ ابھی مرہم بنا رہا ہے۔ ابھی مکسچر۔ کبھی آپریشن روم میں مرہم پٹی کر رہا ہے' کبھی قارورہ دیکھ کر آنکھ بھوں چڑھا رہا ہے۔

"یہ کیا ہے؟ قارورہ؟"

"ہاں سرکار۔"

"کس کا؟"

"جورو کا۔"

"جورو کا؟ نہیں یہ بکری کا قارورہ ہے۔"

"نہیں سرکار جورو کا ہے۔"

"نہیں مرغی کا ہے۔"

دیہاتی سمجھ جاتا کہ کمپاؤنڈر کو قارورہ پسند آگیا ہے۔

"جیسی مرجی سرکار۔"

"ہاں یوں کہو۔۔۔۔۔ لاجواب قارورہ ہے۔ جورو کو کوئی بیماری نہیں۔ اس کو نیہر بھیج دو۔"

"نیہر سرکار؟"

"نہیں بکنگھم پلیس۔"

"کہاں سرکار؟"

"جہاں سے تم آئے ہو۔"

دیہاتی لال لال مکسچر لیتا اور کمپاؤنڈر کی پھر پھراتی مونچھوں کو دیکھتے ہوئے بھاگ جاتا۔ اس کی اوٹ پٹانگ باتوں سے مریض بہت خوش ہوتے تھے۔ دیہاتی اسے بالکل اپنا سمجھتے تھے۔ رساول 'گنے' ترکاریوں اور اصلی گھی کی اس کے یہاں کمی نہیں ہوتی تھی۔ بیوی اگر اس سے خوش ہوتی تو اس وقت جب مریض طرح طرح کی موسم کی ترکاریاں لاتے۔ بیوی سے اس کی ہفتوں بات چیت نہ ہوتی۔ ہفتوں کیا شادی سے لے کر اب تک سب ملا کر مشکل سے دس بارہ دن ان کی بات چیت ہوئی ہو گی' وہ بھی پان اور بیٹوں کے ختنے کے موضوع پر۔ ایک آدھ بار اس موضوع پر بھی بات ہوئی تھی کہ کمبخت بکری کے بچے اتنے دبلے کیوں پیدا ہوئے۔ کمپاؤنڈر مختار احمد نے پان کھاتے ہوئے بس اتنا کہا تھا۔

"منے کی اماں کیوں ہلکان ہو۔ اس سے زیادہ دبلا تو میں پیدا ہوا تھا اور مجھ سے بھی زیادہ تم......"

وہ شام کتنی جان لیوا تھی جب وہ اپنے بیوی بچوں سمیت ایک، اجڑے ہوئے علاقے سے بدل

کر یہاں آیا تھا۔ جہاں اس کا پینتالیس برس کا سالا ہسپتال کا آقا تھا۔

برسات کی شام تھی۔ بھیگی ہوئی ہوا میں نہ جانے کیسے ان دیکھے آسمانی پھول مہک رہے تھے۔ شفق کا سنہرا اور نارنجی رنگ پھیل گیا تھا۔ یہ رنگ نشیبوں میں بھرے ہوئے پانی میں گھل رہا تھا۔ اور گھلتے ہوئے رنگ میں ٹیلے پر انگڑائی لیتی ہوئی مسجد کا سایہ تھرتھرا رہا تھا۔ یہ تھرتھراہٹ ان بطخوں کے پیٹ سے شروع ہوئی تھی جو کھجور کے جھکے جھکے درختوں کے سائے میں تیر رہی تھیں اور ان بطخوں کے ساتھ کمپاؤنڈر مختار احمد کا لمبا سایہ بھی تیر رہا تھا' بھٹکتا ہوا سایہ۔

وہ ہر ہسپتال میں ڈاکٹروں سے بگاڑ کر کے جان ہار چکا تھا۔ نہ جانے کتنی بار سوچ چکا تھا' بس چھوڑ دوں۔ یہ زخم اور مرہم کا سودا۔ کوئی اور دھندا کروں۔ پان بیڑی کی دکان کھول لوں۔...... اپنا راج تو ہوگا!" لیکن اس سے یہ بھی نہ ہوا۔ وہ زبان کی قینچی چلاتا رہا۔ مرہم اور مکسچر بناتا رہا اور دل ہی دل میں ڈاکٹروں کے پرخچے اڑاتا رہا۔ جب وہ اس گاؤں کے ہسپتال میں آیا تو نہ جانے کیوں دل میں انجانی تمنا چھپا کے لایا۔۔۔ شاید زندگی کا ڈھچر بدل جائے۔ لیکن زندگی بدل کے کیا سے کیا ہو جائے گی' اس کا کوئی تصور اس کے ذہن میں نہیں تھا۔ اپنا سالا ہے۔ آخر میں اس کی انتہائی احمق چھوٹی بہن کا شوہر ہوں۔ کچھ نہ کچھ ہو رہے گا۔ لیکن چند دن کے اندر ہی اسے معلوم ہو گیا کہ زندگی میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہونے کی امید ہے۔ ڈاکٹر ڈاکٹر رہتا ہے اور کمپاؤنڈر کمپاؤنڈر۔ ڈاکٹر مریضوں کے یہاں جاتا ہے' بڑے گھرانوں کے مریضوں کو ٹھونک بجا کر دیکھتا ہے اور خیراتی ہسپتال کی اچھی اچھی دوائیں ان کی نذر کرتا ہے اور غریب کسانوں کی نبض پر انگلیاں رکھتے ہی ایسی دواؤں کے نسخے لکھنا شروع کر دیتا ہے جن میں پانی زیادہ اور دوا کم ہوتی ہے۔ پھر فوجداریاں ہوتی ہیں۔ زخمیوں کے جسم سے خون بہتا ہے اور گانٹھ سے روپیہ۔ پھر اس خون اور روپے میں بڑی بڑی عدالت بہہ جاتی ہے۔ بڑا بڑا انصاف بہہ جاتا ہے۔ بھلا انصاف ہے کیا چیز؟ شریف خاندانوں کی ناک سے زیادہ قیمتی نہیں۔ ناک ہے کیا چیز؟ آخر روپے' زمین' رسوخ' دبدبے' فٹن اور مخمل کے جوتوں کے معجون سے ہی تو یہ ناک بنتی ہے نا۔ واقعی دیکھنے میں یہ ناک کتنی چھوٹی ہوتی ہے۔ لیکن اس کمبخت کے ہونے اور نہ ہونے کے دو پلڑوں میں ساری دنیا تل جاتی ہے۔ غضب ہے! یہ چھوٹا سا گاؤں' اس کے کھیت' ڈاک گھر' ریلوے اسٹیشن اور ہسپتال' چاہے دیکھنے میں کتنے ہی بڑے معلوم

ہوں' ہیں ناک سے چھوٹے۔ اس چھوٹی سی ناک میں کتنی طاقت ہوتی ہے' کتنی پہنچ ہوتی ہے ---- یہ طاقت کہاں سے آتی ہے ---- ؟ یہ تو ہماری چھوٹی سی مسجد کے ہمہ داں موذن کو بھی معلوم نہیں ---- ہاں وہ چھوٹی سی تمنا ---- !وہ تمنا کیا ہوئی؟

یہاں آتے ہی اسے بڑے زور کا جھٹکا لگا جب ایک رات پڑوس کے کنجڑے کو ٹھنڈک لگی اور وہ اکڑ کر رہ گیا۔ ہسپتال میں انجکشن کی دوا موجود تھی اور اس سے کنجڑے کی جان بچائی جا سکتی تھی لیکن ڈاکٹر نے اس انجکشن کی اجازت نہ دی۔ یہ دوا زیادہ کار آمد لوگوں کے لئے الگ رکھ دی گئی۔ یہ بات لنگڑے کمپاؤنڈر کی سمجھ میں نہ آئی۔ اسی زمانے میں شب برات آئی تو ڈاکٹر کے بچوں کو ڈیوڑھی پر بلوایا گیا اور ڈیوڑھی کے بچوں کے ساتھ انہوں نے بھی آتش بازیاں چھوڑیں۔ کمپاؤنڈر کے بچے گھر پر ہی پھلجھڑیاں جلا جلا کر سو گئے۔ وہ دیر تک بچوں کے چھوٹے چھوٹے سر سہلاتا رہا اور سوچتا رہا ---- "یہ بکری کی دم سمجھتے کیا ہیں اپنے آپ کو' جیسے ہم ان کے بنا پھلجھڑیاں جلا ہی نہیں سکتے۔" دیر تک اس کا گلا رندھا رہا۔ غصے میں اس نے حلوے کی پلیٹ ہی الٹ دی جو اس کے سالے کی بیوی نے سر شام بھجوائی تھی اور حلوے پر خشک میوے کی چھائی ہوئی ہوائیاں دور تک بکھر گئی تھیں۔

"تم جنم کی احمق ہو۔ دیکھتی نہیں یہ تمہارا بھائی کیا چاہتا ہے مجھ سے۔ میں اپنے ہاتھ نہیں رنگوں گا۔ مر جاؤں گا مگر......"

ایک دن ڈاکٹر سالے نے مختار احمد کو اونچ نیچ سمجھائی اور کہا "چاہو تو تم محل بنا سکتے ہو بس گر سیکھنا چاہئے الو بنانے کا۔ یعنی سب کو خوش کرنے کا۔"

"اس کو بھی جو انجکشن کی دوا کے بغیر آپ کو دعائیں دیتا ہوا دوسری دنیا کے سفر پر روانہ ہو جاتا ہے اور اس کو بھی جس سے دو ہزار لے کر آپ یہ لکھ دیتے ہیں کہ مقتول کے سر پر تلوار کا نہیں بلکہ کسی پتھر کا زخم تھا......"

ڈاکٹر کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ اس نے دو تین بار اپنے سر پر ہاتھ پھیرا اور آہستہ سے بولا۔ "میں نے کوشش کر کے تمہیں اپنے ہسپتال میں اس لئے بلایا ہے کہ تمہاری نوکری خطرے میں تھی۔ تمام ڈاکٹروں کی رپورٹ تمہارے خلاف تھی۔ میں نے سوچا تم آ جاؤ گے

تو پھر ہم اطمینان سے ......"

"اطمینان کی ماں کی...... " مختار احمد لنگڑاتا ہوا اپنے کوارٹر کی طرف چل دیا۔

چند مہینے بعد اس نے اپنی دیوار کے پاس ڈاکٹر کے بیٹے کی آواز سنی جو کمپاؤنڈر کے بیٹے کے ساتھ کھیلتے کھیلتے روٹھ گیا تھا۔

"اونہہ ہم چھپ چھپ کر تمہارے ساتھ کھیلتے ہیں اور تم اکڑتے ہو۔ اماں کہتی ہیں پھوپھا جان ابا کے نوکر ہیں۔"

"اونہہ بڑے نوکر ہیں ۔۔۔۔ گدھے کی دم ہیں ماموں جان۔"

دونوں میں دھینگا مشتی ہونے لگی۔ کمپاؤنڈر کے لونڈے نے ڈاکٹر کے لونڈے کی ذرا زیادہ ہی مرمت کر دی لیکن مختار احمد نے اپنے بیٹے کو برا بھلا کچھ نہ کہا۔ البتہ دیوار کے اس پار سے ڈاکٹر کی بیوی کی آواز سنائی دی۔

"اللہ نے چاہا تو چڑھتی جوانی جنازہ اٹھے گا حرام خور کا......"

مختار احمد نے اپنے تمام بچوں پر کرفیو لاگو کر دیا۔ "خبردار جو تم گئے ان کے گھر۔۔۔۔ سب کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔"

سب سے چھوٹے بچے نے سہم کر پوچھا "ابا ہماری ٹانگیں ٹوٹ جائیں گی تو ہم بھی تمہاری چھڑی سے کھیلیں گے نا؟"

کمپاؤنڈر نے اپنی ممنوعہ چھڑی تھوڑی دیر کو ان کے کھیلنے کو دے دی اور بچے ان پر گھوڑا چڑھتے رہے۔

یہ ساری باتیں جو یاد آئیں تو وہ بھنا کر تپائی سے اٹھا۔ اس کے جھٹکے سے تپائی گر گئی۔ وہ سر سے پاؤں تک کانپ رہا تھا۔ وہ ڈگمگاتا ہوا پہلو والے کمرے میں گیا۔ پاجامہ نہ جانے کب سے اسی طرح الماری کی چٹخنی سے لٹک رہا تھا۔ اس نے تہبند اتارا اور پاجامہ پہن لیا۔ جوتے چارپائی کے نیچے سے کھینچے تو ایک جوتے سے چوہیا پھدک کر نکلی اور اس کے ہاتھ کو چھوتی ہوئی کونے والے بل میں گھس گئی۔

"اچھا تو گھات میں تھیں تم۔۔۔۔ بل بنا لئے ہیں یہاں......" اسے اچانک اپنی بیماری کے خیال

سے جھرجھری آگئی۔ "ہر طرف موت رینگ رہی ہے۔" اسے پھر جھرجھری آئی لیکن اس نے مسکراتے ہوئے جوتے پہن لئے۔ "اچھا لوٹ کر آؤں گا تو جوتوں پر پالش کروں گا! انسان کے چہرے پالش سے نہیں چمکتے لیکن جوتے خوب چمکتے ہیں۔ کاش پالش میرے چہرے کو چمکا سکتی......" اس خیال پر ایک بار پھر اس کے دل میں مسکراہٹ کی گدگدی تیر گئی۔

اس نے جب کمبل نما کپڑے کا بھورا کوٹ پہنا تو نہ جانے کیوں اسے اپنا کمرہ بہت ہی ویران اور تاریک نظر آیا۔

"میں کتنا چاہتا تھا کہ میرے کمروں میں روشنی رہے' میری زندگی میں روشنی ہو...... لیکن یہ سب کیوں نہ ہوا......"

اس نے آبنوسی چھڑی اٹھائی اور اپنے آپ سے بات کرتا ہوا باہر نکل گیا۔ باہر نکل کر ایک لمحے کو چھڑی کے سہارے کھڑا ہو گیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ سینے میں کوئی چیز دھونکنی کی طرح چل رہی تھی۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ دھوپ کی گرمی سے اس کی رگوں میں خون دوڑنے لگا۔ "نہیں نہیں ابھی میں ہسپتال جا سکتا ہوں' مکسچر اور مرہم بنا سکتا ہوں...... اور......اور......"

وہ ہسپتال کی طرف بڑھا۔ مٹر کا کھیت لہلہا رہا تھا۔ کنویں پر چھوٹے سے گڈھے کے کنارے کبوتر پانی پی رہے تھے۔ ہسپتال میں مریضوں کی ریل پیل تھی۔ مریضوں کو دیکھ کر اس کی ٹانگوں میں جان سی پڑ گئی۔ وہ بھٹکتے اور ڈگمگاتے ہوئے کھیتوں کے درمیان پگڈنڈی پر چلنے لگا جو ہسپتال کے زینے پر ختم ہوتی تھی۔ میناؤں اور گوریوں نے اس کو بڑی حیرت سے دیکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے گرم گرم دھوپ' گھاس اور مٹر کے پودوں کی خوشبو اس کے قدموں سے لپٹتی ہوئی سرسرا رہی ہے۔

"میری جان اتنی جلدی بھول گئیں...... ڈرتی ہو...... قبر سے اٹھ کر یہ کون آرہا ہے...... ہاں ہاں میں قبر میں سونے کو نہیں پیدا ہوا ہوں......" مینائیں اور گوریاں اس کے ہر قدم پر اڑ کر ایک ایک گز آگے پھدکتی رہیں۔

جب وہ زینے پر چڑھا تو اس کے ہونٹ بھنچ گئے اور آنکھیں بھر آئیں۔ اس نے پان کی ڈبیہ

سے ایک گلوری نکالی اور زردے کے ساتھ منہ میں رکھ لی۔

مریض لپک کر اس کے چاروں طرف جمع ہو گئے۔ ایک چھن کو اس کے چہرے پر پرانی دمک پیدا ہوئی۔ پیدا ہوئی اور اسی آن بجھ گئی۔ اس نے ایک جوان لڑکی کو آنکھیں جھپکاتے ہوئے دیکھا اور بولا "ارے اس کلوٹی رانی کا گونا نہیں ہوا اب تک؟"

"نہیں سرکار" لڑکی کی چیچک رو ماں نے کہا۔ لڑکی نے گھونگھٹ کاڑھ لیا۔ اس کا چہرہ زرد تھا اور آنکھوں کے گرد حلقے پڑے ہوئے تھے۔ اس کے مرجھائے ہونٹ لرز رہے تھے جیسے کوئی ان کہی بات آگ کی طرح تڑپ رہی ہو۔

"کیا اب تک خون آتا ہے؟"

"آتا ہے سرکار......"

"ٹھیک ہو جائے گی' دیکھو میں ٹھیک ہو گیا...... ایک ہی بیماری ہے گوری کی اور میری......"

گوالن لڑکی نے گھونگھٹ ہٹا کر کنکھیوں سے کمپاؤنڈر کو دیکھا۔ وہ ڈر گئی۔ اس نے پھر گھونگھٹ کاڑھ لیا اور اس کے لمبے میلے گھونگھٹ سے کھانسی جھنجھنے لگی جیسے دور کوئی بند کنوئیں میں پرانے گھڑے کو ٹھیکری سے بجا رہا ہے۔ اس نے ایک دوسرے مریض کو دیکھا اور چہک کر بولا۔ "ارے مہاراج ایک آنکھ چل بسی تو کیا ہوا۔۔۔۔ اسی پر مرے جا رہے ہو۔ اب تم دنیا کو دو نظروں سے نہیں دیکھو گے۔۔۔۔ مجھے دیکھ لو ایک ٹانگ سے......" کھانسی آئی اور اس کے منہ کی بات چھین لے گئی۔

اسے زندگی میں پہلی بار بڑی دل شکن بے بسی کا احساس ہوا۔ وہ کوئی چٹ پٹی بات کہنا چاہے اور نہ کہہ سکے' اس سے بڑھ کر بے بسی اور کیا ہو سکتی ہے۔ کوئی چیز اندر کیتلی میں بند پانی کی طرح سنسنا رہی ہے۔ لیکن ابل نہیں رہی ہے' کھول نہیں رہی ہے۔ آنکھوں میں یہ ٹھنڈی بھاپ سی کیا چیز اڑ رہی ہے۔ اس کا سر ایک بار پھر چکر لیا۔ وہ پسپائی سے بچنے کے لئے مسکرایا۔ لیکن اس کی مسکراہٹ کسی کو دکھائی نہ دی۔ لوگوں کو صرف اتنا نظر آیا کہ اس کے ہونٹ لرز رہے ہیں۔ اور وہ سمجھے کمپاؤنڈر پہلے کی طرح کوئی پٹاخہ چھوڑنا چاہ رہا ہے۔ وہ اپنے گرد مریضوں کی بھیڑ پر تقریباً گر پڑا۔ بھیڑ نے راستہ دے دیا اور وہ بھٹکتا ہوا کمپاؤنڈنگ روم میں داخل

ہوا۔ وہاں دواؤں کی بو بسی ہوئی تھی۔ کھٹی، میٹھی اور کڑوی بو۔ اس کی جگہ پر جو کمپاؤنڈر کام کر رہا تھا، ابھی بہت جوان تھا۔ اس کی مونچھوں کا رنگ بھورا تھا لیکن ان میں ابھی مسوں والی نرم نمی باقی تھی۔ اس نے لنگڑے کمپاؤنڈر کو نہیں دیکھا۔ وہ مکسچر بنا رہا تھا۔ مسکرا رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔

"۔۔۔۔اگر یہ لنگڑا مر گیا تو میری قسمت کا ستارہ چمک اٹھے گا۔ مختار احمد خوب آدمی ہے۔ خوب چٹکلے چھوڑتا ہے۔ پٹاخوں کی طرح...... اور نہ مرا تو۔۔۔۔؟" اس کے چہرے پر بادل کا سایہ سا تیر گیا۔ اس نے ہاتھ کے تیز جھٹکے سے دوا کی کاہی شیشی کھڑکی پر پٹک دی اور ایک عورت کے لرزتے ہوئے ہاتھ نے شیشی کو دبوچ لیا۔ جیسے یہی اس کی آخری آس ہو۔

مختار احمد نے بڑی نرمی سے نئے کمپاؤنڈر کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔

"بھائی رام اوتار۔۔۔۔ لاؤ میں تمہارا ہاتھ بٹا دوں۔ آج لگتا ہے مریض بہت ہیں۔ بھائی جہاں گڑ ہوگا مکھیاں تو گریں گی ہی......" اس کی آواز میں عجیب سی جھنجھناہٹ تھی۔ نیا کمپاؤنڈر ڈر گیا۔ نہ جانے وہ آواز کی جھنجھناہٹ سے ڈر گیا تھا یا اپنے خیال سے جو بار بار اس کے دماغ میں مختار احمد کی آواز کی طرح جھنجھناہٹ کے ساتھ گونج رہا تھا۔

"۔۔۔۔اور نہ مرا تو۔۔۔۔"

"یہ نوجوان اتنا سہما ہوا کیوں ہے۔۔۔۔ ڈر گیا ہوگا میں قبر سے نکل کیسے آیا؟ ہاں ہاں میں قبر سے نکل آیا ہوں۔ اور وہاں لوٹ کر نہیں جاؤں گا۔۔۔۔"

اس نے نظر بھر کے مکسچر کی رنگا رنگ بوتلوں کی تین منزلہ قطاروں کو دیکھا۔ اسے یہ بوتلیں اتنی خوبصورت اور دلکش تو کبھی نہیں معلوم ہوئی ہوں گی۔

اس نے کھڑکی سے ایک مریض کے ہاتھ سے نسخہ لیا اور بالکل رقاص جیسے ہلکے پھلکے قدموں سے دواؤں کی الماری کی طرف بڑھا۔

"یہ نسخہ نہیں ریت کا چشمہ ہے......" وہ بڑبڑایا۔

نئے کمپاؤنڈر نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"آپ دوانہ تیار کیجئے۔۔۔۔ڈاکٹر صاحب کا حکم ہے کہ۔۔۔۔ آپ کا مرض کتنا خطرناک ہے۔ آپ خود جانتے ہیں۔ پچھلی بار وہ مجھ پر بہت برسے تھے"۔۔۔۔ اس نے سانس روک کر اپنی بات کہہ دی لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

کمپاؤنڈر کے ہاتھ سے نسخہ پت جھڑ کے سوکھے پتے کی طرح گر گیا۔

"کس کا حکم ہے؟۔۔۔۔"

وہ مڑا اور درمیانی کمرے کی طرف بڑھا جہاں ڈاکٹر بیٹھتا تھا۔

گنوار مریض چھپٹ رہے تھے اور سامنے بنچ پر صرف سفید پوش مریض یا مریضوں کے اپنے پرائے بیٹھے تھے۔ ڈاکٹر سر جھکائے نسخہ لکھ رہا تھا۔ اس کی چھوٹی سی گردن پر بڑا سا کھچڑی سر پرانے لیمپ شیڈ کی طرح جھکا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔

سفید پوشوں نے بنچ پر ایک طرف کھسکتے ہوئے اور گھبرائی گھبرائی نظروں سے دیکھتے ہوئے کمپاؤنڈر کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

"نہیں میں کھڑا رہوں گا۔۔۔۔" کمپاؤنڈر نے کھانستے ہوئے یوں کہا جیسے کسی کے چیلنج کا جواب دے رہا ہو۔

ڈاکٹر نے سر اٹھایا اور پان کی پیک سے رنگے ہوئے بڑے بڑے دانت کھلے ہوئے منہ سے جھانکنے لگے۔ اس کے ہاتھ سے قلم چھوٹ گیا۔

"تم پھر ہسپتال میں؟۔۔۔۔"

"ہاں پھر ہسپتال میں۔۔۔۔ اب میں روز ہسپتال آؤں گا اور اپنا کام کروں گا۔۔۔۔"

ڈاکٹر نے چاروں طرف دیکھا' اپنے سامنے بیٹھے ہوئے لوگوں پر نظر دوڑائی اور کرسی پر اڑ گیا۔

"مختار احمد۔۔۔۔ میں نے بہت برداشت کیا لیکن اب۔۔۔۔"

"لیکن اب کیا؟"

"میں کہتا ہوں تم بہت بیمار ہو۔۔۔۔ تمہیں اس طرح ہسپتال میں۔۔۔۔"

مختار احمد نے زور سے میز پر گھونسہ مارا۔ دوات سے روشنائی چھلک پڑی۔ قلم میز کے کنارے تک لڑھکتا چلا گیا۔

برآمدے سے مریض جھانکنے لگے۔ ہسپتال کے ملازموں نے بھی مختلف کونوں سے پنجوں کے بل گردن اٹھا اٹھا کر درمیانی کمرے کی طرف دیکھا۔

"اور میں کہتا ہوں تم مجھے بہت بے وقوف بنا چکے۔ تم ڈاکٹر نہیں ہو۔ تم بنئے سے بھی بدتر ہو۔ تم اس آدمی سے بھی گئے گزرے ہو جو نقلی گھی کو اصلی گھی کہہ کر بیچتا ہے۔"

یہ کہہ کر کمپاؤنڈر مختار احمد لکڑی کی طرح سخت ہو گیا۔ ڈاکٹر کے ہونٹوں پر بڑی صلح جو اور معاملہ فہم مسکراہٹ ابھری۔ پورے ہسپتال پر خاموشی چھا گئی۔ ایک لمحے کو ہر چیز اپنی جگہ پر رک گئی۔ ہاں نیا کمپاؤنڈر اور بھی تیزی سے دوائیں تیار کرنے لگا۔

آخر نظروں ہی نظروں میں بپھرے ہوئے بیمار انسان کو تولنے کے بعد ڈاکٹر نے کہا۔

"تمہاری طبیعت بہت خراب ہے۔ تم کو بستر سے نہیں اٹھنا چاہئے۔ لیکن تم......"

مختار احمد نے پھر زور سے میز پر گھونسہ جمایا اور خود ہی لڑکھڑا گیا۔

"دیکھو وہ جو کونے میں بابو جی بیٹھے ہیں۔ وہ کتنا اجلا کرتا ہے ململ کا اور دل؟"

کنارے پر بیٹھے ہوئے بابو جی پر جیسے ہنٹر برس گیا ہو۔ وہ اچھل پڑا۔

"بیٹھئے بیٹھئے بابو جی۔۔۔۔۔ چار ہی برس ہوئے نا' جب میں یہاں نیا نیا پھنسا تھا؟"

"چار برس؟ کیسے چار برس؟ ڈاکٹر نے اسی طرح کرسی پر جھولتے ہوئے پوچھا۔

"بابو جی آپ ہی آئے تھے نا میرے پاس سو روپے لے کر؟ کیوں بابو جی؟"

"بڑے مسخرے ہو بھائی۔"

"جی ہاں میں بڑا مسخرا ہوں۔ لیکن باتیں تو مسخروں کو بھی یاد رہ جاتی ہیں۔"

"یاد نہیں آتا۔"

"یہ ہوا اصلی مسخرا پن۔ وہ جو چار برس پہلے فوجداری ہوئی تھی وہ تو یاد ہے نا؟ وہ بھی یاد نہیں ہوگی۔ خیر مجھے یاد ہے۔ وہ سو روپے تو آپ اسی لئے لائے تھے تاکہ حضور ڈاکٹر صاحب نے دو ہزار روپے میں ایک مقبول کا خون آپ کے ہاتھوں بیچ دیا تھا اور اگر ایسا نہ ہوتا تو آج آپ یہاں نہ ہوتے بابو جی۔ اس وقت آپ کسی جیل میں شرافت کی زندگی کاٹ رہے ہوتے۔ کیوں بابو جی' کیا میں جھوٹ کہہ رہا ہوں۔"

ڈاکٹر مینڈک کی طرح پھدک کر سیدھا ہو گیا۔
"تم بک رہے ہو۔ تمہیں دق کے ساتھ ہسٹیریا بھی ہو گیا ہے۔ کل ہی تمہیں ٹی بی ہسپتال روانہ کر دیا جائے گا۔ وہاں تمہارا دماغ بھی درست ہو جائے گا۔"
مریض ریلتے پیلتے اندر گھس آئے۔
"تم کسے دھمکا رہے ہو۔ اگر میں بھی تمہاری طرح ہوتا تو آج اس طرح خون نہ تھوکتا۔ تم یوں گھوڑے پر قصوں کہانیوں کے شہزادے کی طرح اڑتے نہ پھرتے' میرے بچے بسکٹ اور دودھ کو نہ بلکتے۔ میں خاموشی سے دیکھتا رہا اور تم......"

اسے بہت زور سے کھانسی آئی۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اس کا غصہ جاتا رہا۔ جیسے موم بتی بہت تیز شعلے میں ایک ہی آن میں پگھل گئی ہو۔ اس نے بات بدل کر چٹکلا چھوڑنے کی کوشش کی۔ لیکن نہ زبان نے ساتھ دیا اور نہ دماغ نے۔ اس نے بڑی مشکل سے اتنا کہا۔
"اچھا' اچھا۔۔۔۔ چھوڑو۔ لیکن میں ہسپتال آؤں گا۔ مجھے یہاں آنے سے نہ روکو۔ یہی میری زندگی ہے۔۔۔۔ میں ابھی مروں گا نہیں' مروں گا نہیں۔۔۔۔"

وہ بڑبڑاتے اور بھٹکتے ہوئے زینے سے نیچے اتر آیا۔

دن بھر وہ اپنے پلنگ پر تکیئے میں منہ ڈالے پڑا رہا اور بڑبڑاتا رہا۔
"میں مروں گا نہیں' میں مروں گا نہیں۔۔۔۔ لیکن یہ کیسے ہوا کہ میرے منہ سے ایک چٹکلا نہ نکل سکا...... جو پرندہ اڑ نہ سکے' آسمان میں نہ کھو سکے' ہوا کا جھونکا جو ہونٹوں پر مسکراہٹ نہ لا سکے' دل کی کلی نہ کھلا سکے۔۔۔۔"

بچے مکتب سے آئے۔ آنگن میں شور ہوا' پھر شور کو نیند آ گئی۔ کھڑکی پرے دن بھر کی تھکی ہاری گوریا بھی اڑ کر گھونسلے میں جا بیٹھی۔ لیکن کمپاؤنڈر مختار احمد اسی طرح تکیئے میں منہ ڈالے پڑا رہا۔

بیوی نے اس کے کمرے میں لالٹین بھی نہیں رکھی۔ جانے کیا بات تھی اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اندھیرا ہے کہ اجالا۔ اس کی بند آنکھوں میں گیندے کے پھول جل رہے تھے۔

"میرا کوئی نہیں ہے۔ وہ سو روپے کہاں ہیں؟ آج مجھے یہ سو روپے بچا سکتے ہیں۔ لیکن اب یہ ہنس اڑ کر بہت دور جا چکے ہیں......"

اسے دور افق پر چاندی کے ہنس اڑتے دکھائی دیے۔ اف ان کی گردنیں کتنی لمبی تھیں۔ سیاہ گھوڑے پر ایک سیہ پوش سوار ہوا سے باتیں کر رہا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کمان اور تیر تھے۔ تیر ہوا میں سنسنا رہے تھے۔ ایک ایک کر کے ہنس گرتے جا رہے تھے۔ بس ایک ہنس اب بھی پرواز کر رہا تھا۔ گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور سوار منہ کے بل گر پڑا۔

"ارے ڈاکٹر۔۔۔" کمپاؤنڈر مختار احمد نے کروٹ بدل لی اور اس کے ہونٹوں پر پپڑیوں کو چیر کر مسکراہٹ ابھر آئی اور اس نے اندھیرے میں خود اپنی مسکراہٹ کی چمک دیکھی۔

لیکن یہ مسکراہٹ بہت ہی پرانی تھی بھولی بسری۔ نہ جانے اب کس کھنڈر سے نکل آئی تھی۔ یہ مسکراہٹ تو غروب آفتاب سے بھی زیادہ حسین تھی۔ کتنی عجیب بات تھی کہ وہ بند آنکھوں سے ایسی گلنار شام دیکھ رہا تھا۔

کوئی دبے پاؤں کمرے میں داخل ہوا۔

"کمپاؤنڈر صاحب مجھ سے پاپ ہوا ہے۔" مختار احمد نے رام اوتار کی پچھتاوے بھری آواز سنی اور اس کا دل شیشے کی طرح بھاری اور ٹھنڈا ہو گیا۔

"پاپ؟ کیسا پاپ۔ پاپ بہت ہی خوبصورت کائی ہے جو پانی کی سطح پر پھیلی ہوئی ہے اور اندر اندر مچھلیاں اور کیکڑے تیر رہے ہیں۔ انسان ان مچھلیوں اور کیکڑوں سے کم تھوڑے ہیں۔"

"آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

"کیوں؟" کمپاؤنڈر تکیے میں منہ دبائے ہوئے ہنسا "کھی کھی...... جانتے ہو انسان اور گدھے میں کیا فرق ہے؟ گدھے کے سینگ نہیں ہوتے انسان کے ہوتے ہیں مگر دکھائی نہیں دیتے۔"

"لیکن مجھ سے پاپ ہوا ہے۔ میں نے بہت بری بات سوچی۔" نئے کمپاؤنڈر کی آواز رندھ گئی۔

"بیکار غم کھاتے ہو۔۔۔ میں سمجھ گیا تم نے کیا سوچا ہوگا...... تم بالکل چوزہ ہو چوزہ۔۔۔ بلکہ چوزے کی دم ہو۔ جاؤ جاؤ۔۔۔ بھاگ جاؤ۔ تمہاری نوکری مستقل ہو جائے گی بھائی ۔۔۔ شادی کر لو دودھ بتاشے کھاؤ، غم نہ کھاؤ...... کھی کھی۔"

رام او تار ڈر گیا اور اسی طرح دبے پاؤں اندھیرے کمرے سے نکل گیا۔

مختار احمد اوندھے منہ پڑا پڑا جانے کیا بڑبڑا رہا تھا۔

......اگر میں وہ سو روپے لے لیتا تو وہ گینڈا میرا دشمن نہ ہوتا۔ وہ مجھے یہاں سے نکلوانے کی کوشش نہ کرتا۔۔۔۔ آدمی کتنی آسانی سے بک سکتا ہے۔ بلکہ بک جاتا ہے۔ لیکن بھلا کیوں نہ بکے آدمی؟ جھوٹ کیا ہے اور سچ کیا ہے؟ اور میں گھٹیا ہوں' لطیفے اور چٹکلے کے سوا اور کیا ہے میری جھولی میں؟ ہاں اور پچاس روپے تنخواہ کے بھی ہیں۔ نہیں اور بھی ہیں چالیس پچاس روپے۔ اگر ڈاکٹر کے ہزار دو ہزار بنتے ہیں تو کمپاؤنڈر کے بھی چالیس پچاس تو بننے ہی چاہئیں۔ لیکن اب ڈاکٹر کے یہاں سے گاجر کا حلوہ نہیں آتا۔ مجھے زندگی میں کوئی چیز ساجھے کی نہیں جچتی' چاہے وہ گناہ جیسی خوبصورت اور مزیدار چیز ہی کیوں نہ ہو۔۔۔۔ اور وہ شام؟ شام اتنی سنہری کیوں تھی جب دھوپ سیال آگ کی طرح بھڑک اٹھی تھی اور۔۔۔۔ بطخیں اب بھی تیر رہی ہیں اور زندگی کی سبز کائی پھٹ رہی ہے۔ اور اور۔۔۔۔ میں اس کائی کے نیچے کتنی ٹھنڈی گہرائیوں میں ڈوب رہا ہوں' اور نہ جانے کہاں بانسری کی تان لہرا رہی ہے۔۔۔۔ شاید کائی کی موٹی چادر کے اوپر...... یہ رام او تار کتنا بھولا ہے۔۔۔۔ مجھے ہنسی آگئی۔ ذرا دیکھنا ایک دن جو میرے منہ سے گالی نہیں سنی تو دن میں تارے نظر آگئے الو کے بھالو کو' الو کے بھالو کی دم کی کمربند کے برقعے کو...... کھی کھی کھی......اب میں کبھی دوائیں نہیں بناؤں گا۔ اب میں ان رنگ برنگی پریوں کو نہیں دیکھوں گا۔۔۔۔ اور جب آنکھیں بند ہو جائیں اور انسان ان پریوں کو نہ دیکھ سکیں تو کہتے ہیں' یہ آدمی مر گیا۔۔۔۔ سو میں مر جاؤں گا۔ اس لئے کہ میں نے دیر کر دی۔ ہاں میں نے دیر کر دی۔ میں اس ڈاکٹر کے لالچ اور جھوٹ پر پردہ ڈالتا رہا اور آج یہی خنجر۔۔۔۔"

اچانک کھیتوں کی طرف سے گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز سنائی دی اور دور ہوتی چلی گئی۔

"میں گیندے کا پودا لگا رہا ہوں...... مٹی میں پانی ڈال رہا ہوں۔ اور پھول کھل رہے ہیں...... گھوڑے کی ٹاپیں چاہے جتنا روندیں انہیں یہ اسی طرح کھلتے رہیں گے...... اف وہ چلا ڈاکٹر۔۔۔۔ رات کتنی تاریک ہے۔ گنہگاروں کو کس طرح چھپا لیتی ہے یہ رات!"

اس نے آنکھیں بند کر لیں اور اسے لگا کہ ہر چیز اسے چھوڑ کر جا رہی ہے' مٹر کے کھیتوں کی

خوشبو' دوا کی بوتلوں کا نغمہ' مریضوں کی شکر گزار آنکھیں۔۔۔۔ ہر چیز دور جا رہی ہے۔ اچانک اس کی ٹانگیں سن ہو گئیں اور گرم پانی کی ایک ننھی سی موج کمر سے اٹھی اور سینے میں پہنچ کر ٹھنڈی ہو گئی۔ اس نے ہاتھ اٹھانا چاہا۔ ہاتھ ٹوٹی ہوئی بے جان ڈالیوں کی طرح پٹی سے لٹکتے رہے۔

"میں ایک احمق بیوی' پانچ نیک بچے اور ایک گیندے کا خوشبودار پودا چھوڑ کر کہاں جا رہا ہوں ۔۔۔۔ کون اکیلا ہے؟ میں یا گیندے کے پھول؟......"

اس کی پیشانی کو گرم گرم انگلیاں سہلانے لگیں۔

"یہ کس کی انگلیاں ہیں' کس کی وفاداری؟ اسی پاگل کی جس سے میں نے زندگی بھر سیدھے منہ بات نہ کی؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

اس کی آنکھوں میں گرم گرم آنسو جمنے اور پگھلنے لگے۔ پھر اسے لگا کہ آنکھوں میں آنسو نہیں جل رہے ہیں بلکہ موم جم رہا ہے۔ پھر اچانک دھماکہ ہوا اور ڈھلتی رات میں کمرے میں سورج کا اجالا بھر گیا۔

کھڑکی سے گیندے کے جگمگاتے ہوئے پھول گردن بڑھا کر اندر آئے اور اس کی پیشانی کو چومنے لگے۔

"نہیں' کوئی وفادار بھی ہے' کوئی وفادار بھی ہے۔۔۔۔"

وہ آخری بار بڑبڑایا۔ پھر ہر طرف سناٹا چھا گیا۔ صرف پھول جاگتے رہے اور اوس میں بھیگتے رہے۔

O

میں صبح سویرے جب آنکھ کھولتا ہوں تو کھلی آنکھیں بھی بند رہتی ہیں' اور میں بچی ہوئی آنکھوں سے دھوپ کو دیکھتا ہوں' منڈیر پر سکھاتے ہوئے! بند آنکھوں سے میں کوے کی کائیں کائیں سنتا ہوں' نانی کی سنائی ہوئی سانپ کے اڑنے کی کہانیاں سنتا ہوں' پھر رات مجھے ڈھانپ لیتی ہے' اور پھر صبح ہو جاتی ہے۔ اگتے ہوئے سورج کی دھوپ آہستہ آہستہ شیشم' کروندے اور شریفے کے پیڑوں کو رات کی اوس کے ساتھ چھوڑ دیتی ہے۔ یہ زندگی کی صبح ہے' رات کے انتظار میں!

ہماری شکست اور فتح کی کہانی میں' ہمارے انبساط اور نشاط کے افسانے میں ہونٹوں پر جاگتے ہوئے نغمے کی طرح ہمارے دل دھڑکتے ہیں۔ یہ افسانے ہر زمانے کے آہنگ اور ہمارے عہد کو اپنے دامن میں سمیٹ لیتے ہیں' اور ہمارے عہد کا symbol بن جاتے ہیں'...... سوزاں اور درخشاں' مدھم اور گریزاں۔ میں آج بھی ان سب مشاہدوں میں موجود ہوں۔

میرا افسانوی شعور مجھ سے کہتا ہے: کالے بگولوں سے مت گھبراؤ' اپنے فن میں زندگی کو جگہ دو' اور خدا کو' جو وقت کی طرح اتھاہ ہے' اپنا ناخدا بناؤ۔ وقت کا ساحل ایک واہمہ ہے اور زندگی تضادات سے پر۔ ایک تخلیق کار کا راستہ انہیں تضادات کے بیچ سے گزرتا ہے...

ترتیب و تہذیب : **جابر حسین**